مولانا محمد علی اور جنگ آزادی

ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی

رام پور رضا لائبریری

حامد منزل، قلعہ رام پور، یوپی۔ ۲۴۴۹۰۱

ترتیب

پیش لفظ

عظیم مجاہدِ آزادی اور بلند آہنگ شخصیت مولانا محمد علی جوہر پر اردو اور انگریزی میں بہت سی کتابیں اور انگنت مضامین اور خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اس ہمہ گیر شخصیت کے ابھی بھی بہت سے ایسے پہلو ہیں جن پر پوری طرح روشنی نہیں ڈالی جا سکی ہے۔ اور ہندوستانی تاریخ میں ان کا صحیح مقام کا تعین نہیں ہو سکا ہے خود مولانا مرحوم نے اپنی نا تمام سوانح کے علاوہ جو انگریزی میں ہے کوئی بڑی کتاب تصنیف نہیں کی۔ کیونکہ حالات اور عمر نے مولانا کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن انھوں نے ایک تاریخ ساز صحافی اور لیڈر کی حیثیت سے جو کچھ لکھا ہے وہ نا قابل فراموش دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۴۲ء میں لاہور کے ایک ڈپلومیٹ اور سنجیدہ اسکالر جناب افضل اقبال نے مولانا محمد علی جوہر کی خود نوشت سوانح کے (My Life A Fragment) دیباچے میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد لکھنؤ اور دیگر مقامات کے مدارس تقریباً بند ہو گئے تھے۔ لیکن رامپور میں علم و فضل کا سلسلہ مسلسل جاری رہا اور نوابین کو بذات خود بھی علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ چنانچہ انھوں نے عربی اور فارسی کے ہزاروں نادر مخطوطات کو جمع کیا اور اس ماحول نے محمد علی کو محمد علی جوہر بنا دیا۔ اور اس جوہر نے اپنی والدہ بی اماں اور بڑے بھائی مولانا شوکت کے تعاون سے انگریزی تعلیم حاصل کرنی شروع کی بریلی، علیگڑھ اور آکسفورڈ کے جوہر شناسوں نے اس جوہر کو ایسا تراشا کہ اس کی آب و تاب نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی کرنوں سے انگلینڈ میں بیٹھے گوروں کے گوشوں کو منور کر دیا محمد علی کی ابتدائی تعلیم کے حوالہ سے یہ بات اہم ہے کہ انھوں نے رامپور میں ۱۸۸۸ء میں جنرل عظیم الدین خاں صاحب کے قائم کردہ انگریزی میڈیم اسکول جو کے چھٹی کلاس تک تھا اور

میٹرک

قائم ہونے کہ دو سال بعد ترقی دے کر اسے حیدیلیکل اسکول بنادیا تھا۔ اسی اسکول میں بنیادی تعلیم حاصل کی اور ایک ہونہار طالب علم ہونے کا ثبوت فراہم کیا اور مستقبل میں ایک انگریزی ادیب کی حیثیت حاصل کی۔ محمد علی نے ۱۸ اگست ۱۸۹۰ء کو اس کے حوالے سے انگریزی میں ایک ایسا مضمون (Need of Modern English Education) لکھا جو کہ بعد میں رامپور کے انسپکٹر آف اسکولس کی رپورٹ کے ساتھ رامپور گزٹ ستمبر ۱۸۹۰ء جلد دوم نمبر ۳۸ صفحہ ۱۴ پر شائع ہوا ۱۔ مولانا محمد علی کی زندگی اور جدوجہد آزادی وطن کا ذکر اس مختصر پیش لفظ میں ممکن نہیں وہ اپنے عہد کے متقی و دین دار عظیم مفکر، ادیب، صحافی، سیاسی لیڈر اور شاعر تھے انھوں نے اپنی زندگی کی ان مٹ چھاپ اپنے عہد پر ہی نہیں چھوڑی بلکہ جدوجہد آزادی وطن کو وطن عزیز کی حدود سے نکل کر برصغیر ایشیا اور یورپین ممالک تک پہنچایا۔ حکومت برطانیہ کی شاطرانہ چالوں اور مکر و فریب کا پردہ فاش کیا اور بقول احمد مصطفی صدیقی راہی، انھوں نے اپنے فکر و عمل سے ہندوستان کی سیاسی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں انکی سیاسی خدمات کا جائزہ کسی خاص سیاسی جماعت کے منشور یا کسی مکتبہ خیال کے آئینے میں نہیں دیکھنا چاہیئے۔

غالبا محمد علی جوہر کا مقصدِ زندگی حضرتِ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد تھا "ہر انسان ماں کے شکم سے آزاد جنم لیتا ہے اسے کوئی غلام نہیں بنا سکتا" ۲۔

انھیں اسلام سے حد درجے لگاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت تھی جسکا عملی ثبوت اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی سے سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی جلدیں تصنیف کروانا ہے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنے غرق تھے کہ چھندواڑہ جیل میں رہ

---

۱. Afzal Iqbal "Life and Times of Mohammad Ali" Lahore, 1974, p 22

۲. ہماڈا ئجسٹ اردو "محمد علی جوہر نمبر" صفحہ ۸ ڈاکٹر درخشاں تاجور "ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر ایک نظر۔

کہ اس مقدس تصنیف کی دوسری جلد کی تصحیح کی۔ مولانا محمد علی ہندوستان کی آزادی کے وہ مایہ ناز معمار تھے جنھوں نے وطن عزیز کی آزادی کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔

"کس بلا کے بولنے والے تھے بولتے تو معلوم ہوتا ابوالہول کی آواز اہرام مصری سے ٹکرا رہی ہے لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھلنے والی ہیں۔ یا پھر شاہ جہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے میں نے ان کو اسٹیج پر آتے اور بولتے ہوئے سنا ہے اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیس کو داد دی ہے۔ ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے[1]"

انھوں نے اپنی تحریر و تقریر سے تحریک آزادی وطن میں ایک ایسی روح پھونکی جس سے ہندوستانیوں میں خود اعتمادی جرأت اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا مصمم ارادہ ایمان کی پختگی کی طرح مستحکم ہو گیا۔ مولانا محمد علی نے غلامی کے خلاف آواز بلند کی ان کا کہنا تھا

"انسان صرف اللہ کی غلامی کے لئے پیدا ہوا ہے۔"

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے مولانا محمد علی کی تعلیم ہند اور بیرون ہند ہوئی۔ انھوں نے آکسفورڈ سے جدید تاریخ میں بی۔ اے۔ آنرز کیا تھا۔ وہ مسٹر سے مولانا بنے تھے۔ انسانی آزادی کو برقرار رکھنے کیلئے وہ دنیا کی تمام اقوام کی ایک بین الملل جمعیت بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہمدرد میں تحریر کیا

"اسلام نے دنیا کو یوروپ کی طرح قوموں اور ملکوں میں تقسیم نہیں کیا بلکہ اختلافاتِ مذہبی کی بنا پر ملتوں میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن اس معنی میں بھی ملت قومیت کے اس قدر منافی نہیں ہے۔ کہ مختلف ملتوں کا وجود قومیت کو پیدا نہ ہونے دے۔"

اس طرح مولانا محمد علی کا نظریہ تھا کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے حضرات ملک کی بقا اس کی ترقی اور آزادی کیلئے ایک ہو سکتے ہیں۔ دراصل مساوات کی شدت انگریز کے زمانے سے شروع ہوئی۔ اور اس نے ملکی دھارے میں دو شاخیں پیدا کر دیں انھوں نے مسلمانوں کو حب الوطنی کو اسلامی پس منظر اور آیات قرآنی کی روشنی میں ان کے فرائض کو یاد

والیا الوداع آخر کے عنوان سے انھوں نے اپنے مضمون میں 'ہمدرد' میں لکھا

"اسلام ہرگز حبِ وطن اور غیر مسلموں کے ساتھ آزادی اور حریت اور بنی نوع انسان کی خدمت میں تعاون کرنے کے خلاف نہیں اور اس معنی میں ہر مسلم کو ملک پرور محبِ وطن بننا لازمی ہے۔ اور خدا نہ کرے وہ دن آئے کہ مسلمانانِ ہند۔۔۔۔ غیر مسلم بھائیوں سے نفرت کو اپنے دل میں جاگزیں ہونے دیں۔"

شدھی سنگھٹن، تنظیم و تبلیغ بعض حضرات صدق دل اور بغیر شر و فساد کے کام کر رہے تھے۔ اور بعض انھیں مدّوں پر ہندو اور مسلمانوں کو لڑا کر ایک دوسرے سے الگ کر رہے تھے اور آزادی قریب ہونے کے بجائے دور ہوتی جا رہی تھی۔ جب رہنما عوام کو ملکی مفاد کے بجائے اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ تو باہمی فاصلے پیدا ہوتے ہیں اور ان فاصلوں کی وجہ سے قومی دھارا ٹوٹنے لگتا ہے۔ اور ملک و قوم کی ترقیات میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ مولانا محمد علی کی نظر ملک کی صورتِ حال پر تھی۔ چنانچہ انھوں نے تنظیم و تبلیغ کے عنوان سے ہمدرد میں ایک مضمون لکھا اس میں تحریر کرتے ہیں

"تنظیم و تبلیغ یہ دونوں لفظ کچھ عرصے سے ہر مسلمان کی زبان پر ہیں مگر افسوس نہ مسلمانوں کی تنظیم ہو رہی ہے نہ اسلام کی تبلیغ مسلمانوں کو تنظیم و تبلیغ کی ہمیشہ ضرورت تھی۔ لیکن کون سی تنظیم و تبلیغ؟ یہ نہیں کہ صبح و شام تک ہندوؤں کے مظالم اور ان کی ریشہ دوانیوں کا دکھڑا رو دیا جائے۔ بلکہ اپنی قوم کے نقائص کی تلاش کی جائے اور ایک ایک کرکے ان کو دور کیا جائے۔"

۱۶۔ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے ایک ہمہ گیر تحریک شروع کی جو "ریشمی رومال سازش" کے نام سے مشہور ہے اس تحریک کا منصوبہ تھا کہ افغانستان کے راستہ سے ترکی فوجیں ہندوستانی انگریزی سامراج پر حملہ کریں اور اسی کے ساتھ برصغیر کے مسلمان علم بغاوت بلند کر کے ملک کو آزاد کرا لیں [۳]

۳۔ مضمون "ریشمی رومال سازش" از کرانتی کمار۔
درخشاں تاجور "ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر ایک نظر صفحہ ۵۲

ترکی سے اس طرح کی امید اس لئے تھی کہ ۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے ترکی پر حملہ کیا تو اس کا ردعمل ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی ہوا۔ اور علیگڑھ کالج اور اسکول کے طلباء نے ترکی مظلوموں کی امداد کے لئے ایک ریلیف فنڈ قائم کیا اور حتٰی کہ اسے ڈائننگ حال سے گوشت کے خرچ کو کم کر کے اس بچت کو ترکی مظلوموں کے ریلیف فنڈ میں جمع کروایا۔ اور ۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگ میں ہندوستانی مسلمانوں نے ترکوں کو مالی امداد کیلئے "ہلال احمر" کے نام سے انجمنیں قائم کیں۔ کامریڈ اور زمیندار میں چندے کی اپیل کی گئی مولانا محمد علی نے جب اپنے اخبار کامریڈ میں طبی وفد کیلئے چندے کی اپیل کی تو مسلمانوں نے جس جوش وخروش سے اس مہم میں حصہ لیا اس کا ذکر کرتے ہوئے کامریڈ کے مینیجر میر محفوظ علی کا یہ بیان تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

"کامریڈ کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ ہزار روپے موصول ہوئے ہیں۔ اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈر اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو گیا ہے ۴۔"

برٹش حکومت کو ریشمی رومال تحریک کے ثبوت مل جانے کے بعد وہ اس تحریک کو کچلنے کیلئے جارحانہ رویہ پر اتر آئی ۱۹۱۶ء میں مکہ میں شیخ الہند محمود حسن اور ان کے چار ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اور ہندوستان میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خان کو حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم میں نظر بند کر دیا۔

ان اقدامات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ان دونوں فرقے کے لوگوں کے اتحاد اور اتفاق کے بغیر جدوجہد آزادی اپنی منزل سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ لہذا مسلم لیگ نے اپنے مقاصد میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی اور ۲۲ مارچ ۱۹۱۳ء کے اجلاس میں مسلم لیگ نے بھی کانگریس کے سیلف گورنمنٹ کے مطالبے کو بھی

۴۔ قاضی محمد عدیل عباسی، تحریک خلافت صفحہ ۳۴

اپنے منشور میں شامل کر لیا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی میں ہمہ تن منعقد ہوئے۔ اس طرح مولانا چاہتے تھے کہ ہم اپنی خامیوں کو دور کریں۔ اور مولانا محمد علی کی تحریر و تقریر سے ہندو اور مسلمانوں کے فاصلے کم ہونا شروع ہوئے انھوں نے آزادی کی جنگ میں اپنے ہندو بھائیوں کو بھی ساتھ لیا۔ شری جگت گرو شنکر آچاریہ اور بھارتی کرشنا تیرتھ جی عرف وینکٹ رام جیسی عظیم و جلیل القدر شخصیتیں خلافت کے مسئلے میں مولانا محمد علی کے ساتھ تھیں۔ جب ۱۹۲۱ء میں کراچی کے عید گاہ میدان میں خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا تو اس میں ایک ریزولیشن پاس ہوا کہ انگریز کی ملازمت حرام ہے۔ اس جلسے میں مولانا اور ان کے بڑے بھائی کے علاوہ جگت گرو شنکر آچاریہ اور ونکٹ رام بھی شریک تھے۔ چنانچہ فوج میں بغاوت پھیلانے کے الزام میں علی برادران (مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی) ان کے رفقاء کار اور جگت گرو شنکر آچاریہ جی پر انگریزی حکومت نے مقدمہ چلایا جو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں مقدمہ کراچی کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقدمہ میں جب مجسٹریٹ نے جگت گرو شنکر آچاریہ جی سے کہا کہ آپ اپنا بیان کھڑے ہو کر دیں تو انھوں نے جواب میں کہا

"سوائے اپنے روحانی گرو کے ہم کسی شخص کے سامنے کھڑے نہیں ہو سکتے۔ ہم جیل خانہ جا سکتے ہیں ہم مصائب برداشت کر سکتے ہیں لیکن سنیاس کے قوانین کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔"

مجسٹریٹ نے ایک بار پھر کھڑے ہونے کا حکم دیا اس پر مولانا محمد علی نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

"مجسٹریٹ صاحب کیا آپ کسی مذہب کے پابند نہیں ہیں؟ کیا آپ کی قوم ایک مذہبی قوم نہیں ہے۔۔۔ آج آپ ایک سنیاسی کے مذہب پر دست درازی کرتے ہیں آپ کو شرم آنی چاہیے۔"

ان بزرگوں میں آپسی احترام اتنا تھا کہ جب مولانا شوکت علی جیل کی لاری سے

اتر کر عدالت میں داخل ہوئے تو جگت گرو شنکر آچاریہ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ اس سے ہندوستان میں آزادی سے پہلے ہندو مسلمان کے باہمی ربط کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور یہ دعویٰ صحیح ثابت ہوتا ہے کہ جدوجہد آزادیٔ وطن میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔

اس ہی طرح کا ایک ریشمی رومال حال ہی میں رامپور رضا لائبریری کیلئے میں نے خرید کر محفوظ کیا ہے۔ اور غالباً اس کی دوسری مثال کہیں اور محفوظ نہیں ہے۔ اور شاید اس ہی موقع پر کانگریس نے یہ ریشمی رومال تقسیم کیا تھا جس پر کانگریس کے ۱۶ عظیم رہنماؤں کی تصویریں ہیں جن میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ اس ریشمی رومال کا عکس اس کتاب کے سرورق پر دے دیا ہے۔ رومال کے درمیان میں مہاتما گاندھی کی تصویر کے علاوہ بھارت ماتا کی تصویر بھی ہے جس کے ایک طرف ہندو اور دوسری طرف ایک مسلمان کو دکھایا گیا ہے اور دیوناگری رسم الخط میں "وندے ماترم" اور "ہندو مسلم ایکتا" تحریر ہے۔

ستمبر ۱۹۲۱ء میں حکومت نے علی برادران اور ان کے ساتھی ڈاکٹر سیف الدین کچلو شاردا پیٹھ کے جگت گرو شنکر آچاریہ مولانا نثار احمد پیر غلام مجدد اور مولانا حسین احمد مدنی کو خلافت کانفرنس کے کراچی کے اجلاس میں باغیانہ تقاریر اور بدامنی پھیلانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ گرفتار لیڈروں پر مقدمہ چلا جس میں شنکر آچاریہ کو ایک سال اور بقیہ افراد کو دو سال قید کی سزا دی گئی۔ ان گرفتاریوں اور سزا کا نتیجہ حکیم اجمل خاں کے بیان کے مطابق ملک بھر میں لاکھوں عوام نے خلافت کے ریزولیشن کو دہرایا اسی طرح پورے ہندوستان میں اس تحریک نے زور پکڑا کہ لاکھوں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی اتنی ہمہ گیر کامیابی نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی جولائی ۱۹۲۱ء کے آخری ہفتہ میں خلافت کانفرنس کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے بمبئی کے اجلاس میں کراچی میں دئے گئے علما کے فتوے کے مطابق ایک اعلان ۲۶ ہندو اور مسلمان لیڈروں کے دستخط کے ساتھ شائع کر دیا

اور حکومت کو چیلنج کیا تاکہ حکومت ان سارے لیڈروں کو گرفتار کر لے محمد علی اور شوکت علی نے کانگریسی لیڈروں کے ساتھ مل کر ایسی جدوجہد آزادی کی شروعات کی کہ یہ دور آزادی کی تاریخ کا اہم باب بن گیا۔ اس جدوجہد میں سب ہی اہم جماعتوں نے برٹش راج کے خلاف عدم تعاون کی تحریک کا جال بچھا دیا جس سے ملک کے تمام طبقے کے لوگ اس تحریک میں شریک ہو گئے۔ کسان اور مزدور طبقہ نے بھی ہم وطنوں کے دوش بدوش اس تحریک کو بڑھاوادیا۔ مل اور فیکٹری کے مزدوروں نے ہڑتالیں شروع کر دیں۔ چھ مہینہ میں مختلف مقامات پر دو سو سے زیادہ ہڑتالیں ہوئیں ۱۹۲۱ میں ہڑتال کی تعداد ۳۹۶ تین سو چھیانوے تک پہنچ گئی۔ آسام میں چائے کے باغات کے تقریباً بارہ ہزار مزدوروں نے مزدوری کی کمی کے احساس سے کام چھوڑ کر دوسرے کاموں میں لگ گئے اسی سال آسام اور بنگال کے ریلوے مزدوروں نے بھی ہڑتال کر دی۔ مالا بار کے موپلوں نے بھی بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ سڑکوں پر قبضہ کر کے چوکیاں بٹھا دیں، ٹیلی گراف کے تار کاٹ دیئے اور انھوں نے وہاں برٹش حکومت کے خاتمے اور سوراج کا اعلان کر دیا اور شہر کے کونے کونے سے خلافت کا جھنڈا لہرادیا گیا۔

جون ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ میں خلافت کمیٹی اور جمعتہ العلماء کا متحدہ اجلاس ہوا۔ اور یہ تجویز پاس کی گئی جس میں کہا گیا کہ لفظ "سوراج" کی جگہ اب مکمل آزادی کے لفظ کا استعمال ہونا چاہئیے وہ جیل سے رہا ہو کر دسمبر ۱۹۱۹ء کو سیدھے امرتسر کے اجلاس میں پہنچے کیونکہ امرتسر میں جلیاں والے باغ کا حادثہ ہو چکا تھا۔ اور اس دوران ایک ہی وقت مختلف پارٹیوں کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس موقع پر وہ کانگریس کے ممبر بنائے گئے اور بعد میں ۱۹۲۴ء میں وہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ وہ کانگریس سے دور ہونے لگے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے

"آہستہ آہستہ کانگریس سے دور ہونے لگے۔۔۔یا کانگریس ان سے دور ہونے لگی۔۔۔ ہندوستان کی آزادی کے وہ دل سے شیدائی تھے"

غالباً نہرو رپورٹ کے بعد مولانا محمد علی نے کانگریس سے زیادہ فاصلے بنالئے لیکن ان کی جدو جہد آزادی وطن کی تحریک میں کمی نہیں آئی۔ بلکہ عملی اضافہ ہو گیا۔ بظاہر ترکی امپائر کی حمایت میں خلافت تحریک کا آغاز ہوا تھا لیکن بعد میں اس کا رخ ہندوستان کی آزادی کی طرف مڑ گیا۔ دنیائے اسلام کی سیاست اور اپنے عزیز وطن کی آزادی کا سودا محمد علی نے نقدِ جاں دیکر خریدا تھا اس کے لئے انھیں نظر بندی جیل کی صعوبتوں اور دور دراز سفر کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔

بقول عبدالماجد دریابادی!

"محمد علی اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اصلاح حجاز اگر مقصود ہے تو ارض پاک کو بادشاہ گردی سے نجات دلادی جائے۔ یہ سارے فتنے بادشاہت اور ملکیت کے ہیں۔۔۔۔عالم اسلام کی جمہوریت قائم ہو جائے تو کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ پڑے اور شیر برطانیہ اور عقاب جرمنی سب سمجھ لیں کہ اب تنہا مقابلہ حجاز سے نہیں بلکہ مصر سے یمن سے طرابلس سے البانیہ سے افغانستان سے ترکی سے اور ہندوستان سے ہے۔"

ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو خلافت ترکی (تحریک خلافت) دنیا کی دوسری سلطنتوں اور ممالک کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اور اس طرح جنگِ آزادی ہند میں غیر ممالک کے علاقوں کی ہمدردیاں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ اور ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ بین الاقوامی مسئلہ بن گیا تھا۔ مولانا محمد علی فطری طور پر جمہوریت پسند واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے راونڈ ٹیبل کانفرنس میں کہا تھا "میں جمہوریت پسند واقع ہوا ہوں۔ میرے نہاخانہ تصورات میں شاہوں کا وجود نہیں ہے۔"

ان کا عہد تھا آزادی یا موت (قبر کے لئے جگہ) ان دونوں میں سے انھیں آزادی نہیں ملی۔ موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے لیکن محمد علی نے موت کا انتخاب خود کیا۔ فاتح بیت المقدس نے اپنا سر جھکا دیا تھا لیکن محمد علی کو جب معراج ملی تو بیت المقدس نے انھیں اپنے آغوش میں لے لیا۔ مولانا محمد علی اور جنگ آزادی ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی کا ایک تحقیقی مقالہ

ہے۔ یہ مولانا محمد علی کے خاندان سے ہیں اور رشتے میں مولانا کے نواسے ہیں۔ میری نظر میں انھوں نے یہ کام عرق ریزی سے کیا ہے۔ لیکن تحقیق میں کوئی کام حرف آخر نہیں ہوتا۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ مولانا محمد علی پر یہ ایک ایسی تحقیقی کتاب ہے جس میں متعدد نادر تاریخی دستاویز اور اسلامک ونڈرس بیورو کے تعاون سے تصویروں کا بیش قیمت اضافہ کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس سے قبل شائع ہونے والے مضامین اور کتابوں پر اسے فضلیت حاصل ہے۔

اس اہم تاریخی کتاب کی تالیف کے لئے میں نے ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی صاحب پر زور ڈالا کہ وہ مولانا محمد علی پر جمع کئے ہوئے مواد کو کتابی شکل دیں تاکہ ہندوستان کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ اور رامپور رضا لائبریری کے دو سو سالہ جشن کے موقع پر اسے شائع کیا جاسکے۔ میں ان کا ممنون ہوں کے تین مہینے کے قلیل عرصے میں مزید تحقیق کر کے اس مواد کو کتابی شکل میں ڈھالا۔ جس کی اشاعت میں تنظیم رضا قریشی پروپرائٹر اسلامک ونڈرس بیورو نے اپنے خزینۂ خاص میں سے چند اہم و نادر تصویروں کا اضافہ کر کے کتاب کی افادیت میں اضافہ کردیا۔

ہمیں یقین ہے کہ رامپور کے عظیم فرزند مولانا محمد علی جوہر پر ریسرچ کرنے والے اسکالر خاطر خواہ استفادہ کریں گے اور ہندوستانی جدوجہد آزادی کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بھی مستفید ہونگے۔ اور مولانا محمد علی جوہر کی ساری زندگی جو قید و بند اور قربانیوں کی بے مثال داستان ہے ہر عہد کے حریت پسند عوام کیلئے ہمیشہ مشعل راہ بنی رہے گی۔

اس کتاب کے آخر میں شری رمیش کمار جین ایڈوکیٹ رامپور کی فرمائش پر ڈاکٹر کشور سلطانہ صاحبہ کا ایک مختصر مقالہ ہندی زبان میں اس خیال سے شائع کیا جارہا ہے کہ ہندی کے اسکالر بھی اس عظیم مجاہد آزادی کی زندگی کی جھلکیاں دیکھ سکیں۔ اور مستفید ہو سکیں۔

اس کتاب کی اشاعت کے لئے اقتصادی امداد حکومت ہند کے محکمہ ثقافت کے سیکریٹری ڈاکٹر ویدیہ ناتھ "میر" اور محترمہ حمیر احمد ڈائریکٹر لائبریری کے توسط سے فراہم

ہوئی۔ جس کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ممکن نہیں تھی جناب ابو سعد اصلاحی اسسٹنٹ لائبریرین رامپور رضا لائبریری، جناب سید احمد میاں لائبریری اسسٹنٹ شری رام چندر سنگھ اور مس بلقیس فاروقی نے ہر طرح کی سہولت فراہم کی جن کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جناب جمشید آغا فوٹوگرافر نے تاریخی ریشمی رومال کا فوٹو اٹھا کر سرورق پر چھاپنے کے قابل بنایا جن کا میں ممنون ہوں آخر میں رامپور رضا لائبریری بورڈ کے چیئرمین عالی جناب سورج بھان صاحب گورنر اتر پردیش پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، پروفیسر عرفان حبیب صاحب، پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب، نواب کاظم علی خاں صاحب اور جناب عرفان اللہ خاں صاحب جنھوں نے لائبریری کے علمی اور ثقافتی امور میں ہمیشہ میری مدد کی اور ہمت افزائی کی ان کا میں ہمیشہ شکرگزار رہوں گا۔

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی

رامپور ۶ مارچ ۱۹۹۸ء

ابتدائیہ

"کتاب مضامین مولانا محمد علی"، راقم نے ۱۹۹۵ء میں مکمل کی تھی۔ لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے قارئین کے سامنے نہیں آسکی۔ اس کتاب کے ابواب کی تقسیم اس طرح ہے

ابتدائیہ کے بعد مختلف حضرات کی رائے 'آرا'، کے عنوان سے ہیں۔

مختصر سوانح مولانا محمد علی میں ان کی حیات کے مختلف گوشوں کو تحقیق کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ مولانا محمد علی کی سیاسی زندگی 'ان کی سیاسی زندگی کی ابتدا ، علی گڑھ میں مشاعرہ کی بنیاد، مسلم لیگ سے تعلق، طبی وفد کی ترکی روانگی، کانپور کی مسجد، خلافت وفد، کانگریس سے محمد علی کا تعلق، مقدمہ کراچی اور ان کے مشہور مقالہ چوائس آف دی ٹرکس کے علاوہ، گرو شنکر اچاریہ جی اور گاندھی جی سے ان کے 'روابط' اور ہندوستان کی آزادی کے لئے سادھو، سنتوں اور سنیاسیوں کو اپنے ہمراہ لیکر، جدوجہد آزادی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور تاریخ و تحقیق کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ مولانا نے خلافت تحریک کے ذریعہ ہندوستان کی آزادی کا رشتہ خلافتِ ترکی سے ملا کر، ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کو بین الاقوامی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ ۱۹۴۷ء میں سامنے آیا۔ ترکی کی ہندوستانی عوام نے ان کی ہر طرح سے مدد کی۔ ہمدرد اور کامریڈ مولانا کے اردو و انگریزی کے اخبارات تھے۔ ان عنوانات کے تحت ان اخبارات کی قدر و قیمت کا تعین کیا گیا ہے۔ ہمدرد کے سلسلے میں ایک غلط روایت یہ بھی ہے کہ مولانا نے حکیم عقیب ہمدرد' نام کا اخبار نکالا تھا۔ تحقیق کی روشنی میں اس روایت کی نفی کی گئی ہے۔ اور ہمدرد کا ایک مختصر اشاریہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

بی اماں : مولانا، محمد علی و شوکت علی کی والدہ کی عرفیت تھی۔ ان کا اصل نام آبادی بیگم تھا۔ 'چند اہم خطوط' میں ان کے خطوط بھی ملتے ہیں۔ لیکن وہ لکھنا نہیں جانتی تھیں۔ تحقیق کی

روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ خطوط انھوں نے نہیں لکھے۔ شوہر کے انتقال کے بعد بچوں کی پرورش کی ذمہ داری کو انھوں نے سنبھالا، اور دو ایسے شیر پروان چڑھائے جنھوں نے بے خوف و خطر ہو کر انگریزی حکومت کی مخالفت کی۔ حکومت کی جانب سے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے سے انھوں نے اپنے بچوں کو روک دیا تھا۔ کیونکہ ان کا یہ عمل ملک کی آزادی کے لئے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔

بی اماں کے اجداد کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے سلسلے میں بغاوت کے الزام میں پھانسیاں دی گئی تھیں۔ اس لئے انگریز سے نفرت کا جذبہ ان میں بچپن سے تھا۔ تحقیق کی روشنی میں اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے بی اماں کی شخصیت کو پیش کیا گیا ہے۔

کلامِ جوہر بخطِ جوہر مولانا کی شاعری، پس منظر اور اسلامی تاریخ کی علامات کو مولانا نے ہندوستان کی آزادی کے جن وسیع تر معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً کربلا، مقتل، خوان شہیداں، تیغ، خنجر، قاتل، حسین علیہ السلام، روحِ شہید، گور و کفن وغیرہ، ان کو پیشِ نظر رکھ کر مولانا کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس باب میں مولانا کی ان غزلیات اور نظم کے عکس بھی پیش کئے گئے ہیں، جو انھوں نے قیدِ فرنگ میں کہی تھیں۔ یہ غزلیات مولانا کے خط میں ہیں۔ اور ان پر جیل کی مہر کے ساتھ جیلر اور سینسر کے دستخط بھی ہیں۔

جنگِ طرابلس طرابلس میں یوروپ نے سازشیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ چونکہ یہ علاقہ ترکوں کے ماتحت تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اسے ایک الٹیمیٹم بھی دیا گیا تھا۔

تحریک خلافت اور ترکی امپائر سے متعلق طرابلس کی جنگ کا ذکر جگہ جگہ آیا ہے۔ اس لئے حواشی کے طور پر، قارئین کی سہولت کے لئے اس کا تاریخی اور جغرافیائی پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں جنگِ بلقان شروع ہوئی۔ ترکی کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کیا گیا۔ جگہ جگہ ہلالِ احمر انجمنیں قائم کی گئیں۔ انجمن ہلال احمر کے تحت اس کے اغراض و مقاصد اور دائرہ عمل کا ذکر کیا گیا ہے۔

خطوطِ محمد علی: بخطِ محمد علی کے تحت مولانا کے انگریزی اور اردو خطوط شائع کئے گئے

ہیں۔ مولانا محمد علی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین تحریر کئے تھے۔ اس لئے اس کتاب کا نام مضامینِ محمد علی' طے کیا تھا' لیکن جناب وقار الحسن صدیقی کے مشورہ سے اس کتاب کا نام مولانا محمد علی اور جنگِ آزادی طے کیا گیا۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ مالی دشواری کی وجہ سے یہ مسودہ بغیر اشاعت کے پڑا ہوا تھا۔ اب رام پور رضا لائبریری اسے شائع کر رہی ہے۔

اس سلسلے میں عالی مرتبت گورنر اتر پردیش وچیرمین رامپور رضا لائبریری، ممبران بورڈ رامپور رضا لائبریری بورڈ۔ ایس ڈی جناب وقار الحسن صدیقی صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ جن کی توجہ خاص سے اس کی اشاعت ہو رہی ہے۔ اس کتاب کی تکمیل میں رامپور رضا لائبریری راقم کی ذاتی لائبریری ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ' دہلی سے استفادہ کیا ہے۔ ان اداروں کے متعلقہ عملے کا میں متشکر ہوں۔

ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی
چوک محمد سعید خاں، لنگر خانہ، رام پور

अध्यक्ष
पी० वी० नरसिंहा राव
भारत के प्रधान मंत्री
Chairman
P V NARASIMHA RAO
Prime Minister of India

उपाध्यक्ष
बी० एन० पांडे एम० पी०
Vice Chairman
B N PANDE M P

गांधी स्मृति एवं दर्शन समिति
GANDHI SMRITI AND DARSHAN SAMITI
5 तीस जनवरी मार्ग, नई दिल्ली 110011
5 Tees January Marg, New Delhi 110011
Phones 3012843 3011480
दूरभाष ३०१२८४३, ३०११४८०

مورخہ 20/7/9

محترمی جناب ظہیر علی صاحب!

آداب و تسلیمات!

آپ کے خط کیلئے شکریہ! آپ نے پرانی یادوں کو تازہ کردیا ہے جب میں 1916 میں مدھیہ پردیش کے چھندواڑہ شہر میں ہائی اسکول کا طالبعلم تھا اس وقت مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جب اسکول کے پلے گراونڈ کے قریب سے گذرتے تھے۔ تو رک کر کرکٹ کے کھیل میں ہمارے ساتھ شریک ہوجاتے تھے۔ مولانا محمد علی کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ مولانا کی کوششوں سے چھندواڑہ میں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی اس میں شامل ہونے کیلئے جو اماں صاحبہ وہاں تشریف لائیں ہم لڑکوں نے اسٹیشن پر جاکر ان کا استقبال کیا اس زمانہ میں ان کی شان کے مطابق ایک گیت گایا جاتا تھا۔

بولی اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دیدو

مولانا محمد علی جنوری کے پہلے ہفتہ میں مہاتما گاندھی کو چھندواڑہ لائے تھے۔ انکی اپیل پر پانچ یا چھ وکیلوں نے سرکاری عدالتوں میں اپنی وکالت کا پیشہ بند کردیا۔ پھر تو 1928 تک جب آخری بار مولانا محمد علی آل پارٹی کانگریس میں شامل ہوئے تب میں نے انہیں دیکھا تھا اور انکی تقریر سنی تھی پھر تو دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں اپنی تقریر میں انہوں نے فرمایا تھا۔ " کہ اگر مجھے مکمل آزادی حاصل نہیں ہوئی تو میں زندہ ہندوستان واپس نہیں لوٹنا چاہتا۔ اللہ تعالی نے انکی درخواست سن لی اور ہندوستان پہونچنے سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ اور انہیں سعودی عرب میں انہیں دفن کردیا گیا۔ انہوں نے 1923 کے کانگریس کے اجلاس میں صدارت کی تھی آج ان کے خطبہ صدارت کے چند فقرے توڑ مروڑ کر بھاجپا کے نیتا لوگ پیش کررہے ہیں مولانا ایک بہادر اور ہردلعزیز انسان تھے۔ ہندوستان کی آزادی کیلئے ان کے کاموں کو لوگ بڑی عزت کے ساتھ یاد رکھیں گے۔

نیازمند
شمبھو ناتھ پانڈے
(شمبھو ناتھ پانڈے)

محترمی جناب ظہیر علی صاحب!

آداب و تسلیمات!

آپ کے خط کیلئے شکریہ ' آپ نے پرانی یادوں کو تازہ کر دیا ہے جب میں 1916 میں مدھیہ پردیش کے چھندواڑہ شہر میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا اس وقت مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جب اسکول کے پلے گراؤنڈ کے قریب سے گزرتے تھے۔ تو رک کر کرکٹ کے کھیل میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ مولانا محمد علی کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ مولانا کی کوششوں سے چھندواڑہ میں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی اس میں شامل ہونے کے لئے بی اماں صاحبہ وہاں تشریف لائیں۔ ہم لوگوں نے اسٹیشن پر جا کر ان کا استقبال کیا اس زمانہ میں ان کی شان کے مطابق ایک گیت گایا جاتا تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دیدو

مولانا محمد علی جنوری کے پہلے ہفتے میں مہاتما گاندھی کو چھندواڑہ لائے تھے۔ انکی اپیل پر پانچ یا چھ وکیلوں نے سرکاری عدالتوں میں اپنی وکالت کا پیشہ بند کر دیا۔ پھر تو 1928 تک جب آخری بار مولانا محمد علی آل پارٹی کانفرنس میں شامل ہوئے تب میں نے انہیں دیکھا تھا اور انکی تقریر سنی تھی پھر تو دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں اپنی تقریر میں انہوں نے فرمایا تھا "کہ اگر مجھے مکمل آزادی حاصل نہیں ہوئی تو پھر زندہ ہندوستان واپس نہیں لوٹنا چاہتا۔ اللہ تعالیٰ نے انکی درخواست سن لی اور ہندوستان پہونچنے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ اور انہیں سعودی عرب میں انہیں دفن کر دیا گیا۔ انہوں نے 1923 کی کانفرنس کے اجلاس میں صدارت کی تھی آج ان کے خطبۂ صدارت کے چند فقرے توڑ مروڑ کر بھاجپا کے نیتا لوگ پیش کر رہے ہیں۔ مولانا ایک بہادر اور ہر دل عزیز انسان تھے۔ ہندوستان کی آزادی کیلئے ان کے کاموں کو لوگ بڑی عزت کے ساتھ یاد رکھیں گے۔

نیاز مند

[بشمبر ناتھ پانڈے]

20.7.1995

... Cultural Dept. Govt. of India

AWARDEE FOR TOTAL SERVICES IN URDU FICTION
Sahitya Academy Award
Ghalib Modi Award
Shiromani Urdu Sahityakar Punjab
Bulehshahah Award Denmark
Nuqoosh Award Pakistan
Ratan Nath Sarshar Award
All India Mir Academy Award
Hindi Urdu Comit Award
U. P. Urdu Academy Award
Bihar Urdu Academy Award

Ram Lal

۱۹۸۷ء میں اردو ادب کے تحقیقی میدان میں ڈاکٹر ظہیر علی
صدیقی ایک گرانقدر تصنیف "مولانا محمد علی کی ادبی زندگی کا تنقیدی جائزہ" کے
ساتھ بڑی شان سے وارد ہوئے تھے۔ شان سے اس لئے کہ انہوں نے مولانا کے بارے میں جو کچھ لکھا
وہ ان کی برسوں کی تحقیقی عرق ریزی کا نتیجہ تھا اور وہ ان کے بارے میں جو بھی غلط سلط تحریریں سامنے
آئے وہ تحلیقی صداقت پر مبنی تھا۔ ان کے دلائل اور اقوال کو کوئی دوسرا ابھی تک رد نہیں کر
سکا ہے۔ چنانچہ یہ بات بلا شبہ کہی جا سکتی ہے کہ ان کی مذکورہ تحقیقی و تنقیدی کاوش
فی الوقت مولانا محمد علی کے باب میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔

ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی نے اپنے کام کے لئے اردو کے ایسے معمار ترین تذکرہ نگاروں، محققوں
اور نقادوں سے دامنوں کو پیش نظر رکھا ہے جو اپنی اپنی مہارت اور محنت کی بدولت اردو ادب میں
اعتبار کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ چنانچہ انہی کی روشن روایات کی پیروی میں وہ اپنی اولین
کاوش میں مولانا محمد علی کو بطور بلند پایہ ادیب، خوش فکر شاعر، ماہر سیاست اور مذہبی عالم
کے ایک سچا محب وطن ثابت کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے۔ اس کے علاوہ وہ وقتاً
فوقتاً مختلف النوع مضامین سپرد قلم کرتے رہے اور ممتاز اہل قلم نے بھی ان کی ژرف
نگاہی کو تسلیم کرنے اور انہیں داد دینے کا سلسلہ قائم رکھا۔ اب وہ "مضامین محمد علی" کے
عنوان سے ایک اور اہم تصنیف لے کر آئے ہیں جس کا مطالعہ اہل نظر کو چونکا دے گا۔

مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی بطور محقق و نقاد آئندہ بھی اردو کے سرمایۂ
ادب میں گرانقدر اضافہ کرتے رہیں گے اور تحقیقی و تنقیدی ادب کی آبرو کو قائم رکھنے
میں ایک اہم کردار نبھائیں گے۔

رام لعل
لکھنؤ
۲۲ فروری ۱۹۹۶ء

SHANTI NIKETAN' D-2290, Indira Nagar, Lucknow-226016 Telephone 381233 (Res.)

۱۹۸۶ء میں اردو ادب کے تحقیقی میدان میں ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی ایک گرانقدر تصنیف "مولانا محمد علی کی ادبی زندگی کا تنقیدی جائزہ" کے ساتھ بڑی شان سے وارد ہوئے تھے۔ شان سے اس لئے کہ انھوں نے مولانا کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ ان کی برسوں کی تحقیقی عرق ریزی کا نتیجہ تھا اور وہ ان کے بارے میں جو بھی لفظاً حیطۂ تحریر میں لے آئے وہ تحقیقی صداقت پر مبنی تھا۔ ان کے دلائل اور اقوال کو کوئی دوسرا ابھی تک رد نہیں کر سکا ہے۔ چنانچہ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کی مذکورہ تحقیقی و تنقیدی کاوش فی الوقت مولانا محمد علی کے باب میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔

ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی نے اپنے کام کے لئے اردو کے ایسے ممتاز ترین تذکرہ نگاروں، محققوں اور نقادوں کے کارناموں کو پیش نظر رکھا ہے جو اپنی ایمانداری اور محنت کی بدولت اردو ادب میں اعتبار کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ چنانچہ انہی کی روشن روایات کی پیروی میں وہ اپنی اولین کاوش میں مولانا محمد علی بطور بلند پایہ ادیب، خوش فکر شاعر، ماہر و بیباک اور نڈر صحافی کے علاوہ ایک سچا محبِ وطن ثابت کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے۔ اس کے بعد بھی وہ وقتاً فوقتاً مختلف النوع مضامین سپرد قلم کرتے رہے اور ممتاز اہل قلم نے بھی ان کی ژرف نگاہی کو تسلیم کرنے اور انہیں داد دینے کا سلسلہ قائم رکھا۔ اب وہ "مضامین محمد علی" کے عنوان سے ایک اور اہم تصنیف لے کر آئے ہیں جس کا مطالعہ اہل نظر کو چونکا دے گا۔

مجھے یقین ہے، ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی بطور محقق و نقاد آئندہ بھی اُردو کے سنجیدہ ادب میں قابلِ قدر اضافہ کرتے رہیں گے اور تحقیقی و انتقادی ادب کی آبرو کو قائم رکھنے میں ایک اہم کردار نبھائیں گے۔

رام لعل۔ لکھنؤ

۲۲ر فروری ۱۹۹۶ء

مولانا محمد علی

مختصر سوانح مولانا محمد علی

مولانا محمد علی جوہر کا شمار اُن شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی سیاسی زندگی کے علاوہ علم و ادب کے ذریعے بھی ملک و قوم کی خدمت کی۔ مولانا محمد علی کے اجداد پشاور کے اطراف سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ پنجاب کے صوبے میں بود و باش کرتے ہوئے دہلی اور اس کے بعد ضلع مراد آباد کے علاقے افغان پور میں مسکن گزیں ہوئے۔ مولانا محمد علی کے دادا علی بخش خاں کے جد شیخ امان اللہ اور اُن کے نانا نواب نجیب الدولہ کے معتمد ملازموں میں تھے۔(۱)

نجیب آباد کی تباہی کے بعد نواب ضابطہ خاں، نواب معین الدین خاں اور جلال الدین خاں کی مالی پریشانیاں بڑھتی چلی گئیں۔ اس لئے علی بخش خاص فرزند محبوب بخش خاں نواب معین الدین خاں سے اجازت لے کر لکھنؤ چلے گئے۔ تاکہ کوئی دوسری ملازمت کر سکیں۔

نواب محمد سعید خاں، جنت آرام گاہ والیٔ ریاست رامپور ذاتی طور پر علی بخش خاں سے واقف تھے۔ انھوں نے علی بخش خاں کو لکھنؤ سے رام پور بلا لیا۔ اور ولی عہد یوسف علی خاں ناظم فردوس مکاں کے نگراں کی حیثیت سے مقرر کیا۔ اس طرح مولانا محمد علی کے اجداد علی بخش خاں ۱۸۴۳ء میں رام پور آئے۔ نواب یوسف علی خاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد علی بخش خاں کو سیکشن کھیڑہ کا تحصیلدار مقرر کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک فرمان بھی جاری ہوا۔

"رفعت و عالی مرتبت گرامیٔ قدر شیخ علی بخش خاں بعافیت باشند از آنجا کہ ایشاں روز ملازمی۔۔۔۔ تا حال۔۔۔ کار مفوضہ خود تحویل زیور

وپارچہ وپشمینہ وزرینہ ومتفرقات وتحصیل داری وسائر وعمارت ودواب
مدیانت وامانت تمام بانجام رسانیدہ۔(۲)
مرقوم بیست ویکم جولائی ۱۸۵۵ء عیسوی"

محبوب بخش خاں کے تین بیٹے علی بخش خاں، کریم بخش خاں، حسین بخش خاں اور ایک بیٹی دُلاری بیگم تھیں۔ علی بخش خاں (متوفی ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء) کے پانچ بیٹے تھے اکبر علی خاں اصغر علی خاں، محمود علی خاں حافظ مبارک علی خاں او. عبدالعلی خاں تھے۔ عبدالعلی خاں مولانا محمد علی کے والد تھے۔ عبدالعلی خاں کی شادی آبادی بانو بیگم عرف بی امّاں سے ہوئی تھی۔ بی امّاں کے خاندان کے افراد ۱۸۵۷ء کی شورش میں شریک تھے۔ جس کی وجہ سے مظفر علی بی امّاں کے والد کے بھائی ولایت علی اور بشارت علی بغاوت کے الزام میں قتل کردیئے گئے۔ مظفر علی کا خاندان امروہے کا تھا۔ اور نخبۃ التواریخ، تحقیق الانساب مولوی محمد احمد عباسی اور امروہے کی دیگر تاریخوں کے اعتبار سے یہ خاندان دس ہزاری تھا۔ مظفر علی خاں روپوش ہوگئے تھے۔ مظفر علی خاں کے لڑکے رشد علی خاں اپنی والدہ اور ہمشیرہ (بی امّاں) کے ہمراہ رام پور آگئے تھے۔ حالات معمول پر آجانے پر مظفر علی خاں بھی حاضر ہوگئے۔ رشد علی کی بہن آبادی بانو بیگم عرف 'بی امّاں' کی شادی عبدالعلی خاں سے ہوئی۔

عبدالعلی خاں کا ۲۰ر اگست ۱۸۸۰ء کو ہیضے کی بیماری میں انتقال ہوا۔ عبدالعلی خاں کے پانچ بیٹے بندے علی، ذوالفقار علی، شوکت علی، نوازش علی اور محمد علی تھے۔ اور بیٹی کا نام محمدی بیگم تھا۔ بندے علی بڑے تھے اور بچپن میں انتقال ہوگیا تھا۔ مولانا محمد علی کے والد عبدالعلی خاں کے انتقال کے وقت مولانا محمد علی کی عمر صرف دو سال تھی، ان کی پرورش ان کی والدہ نے کی۔

مولانا محمد علی کا مولد اور وطن مولانا محمد علی ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء کو کوچہ لنگر خانہ رام پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ایک مُدرّس سے حاصل کی جو نئے علوم

کے سلسلے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس کے بعد انھیں ۱۸۸۸ء میں رامپور کے مدرسۂ انگریزی میں داخل کر دیا گیا۔ جو اس سال رامپور میں عبداللہ خاں کے مکانات میں کھولا گیا تھا۔ اور اب یہاں حامد انٹر کالج ہے۔

۱۸۸۸ء میں ہی مولانا بریلی اسکول بغرض تعلیم چلے گئے۔ ۱۸۹۰ء میں مولانا محمد علی گڑھ گئے اور بقول مولانا شوکت علی

"۔۔۔۔(محمد علی) ۱۸۹۰ء میں جولائی کا مہینہ ہوگا علی گڑھ کے پرانے فورتھ کلاس، یعنی مڈل سے نیچے کے درجہ میں داخل ہوا۔ جس کو ساتواں درجہ کہتے ہیں۔ یعنی میٹرک سے تین درجے نیچے۔"(۳)

مولانا محمد علی نے ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے۔ فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ الہ آباد یونیورسٹی نے انھیں ڈگری دی۔ اس لئے کہ اس وقت ایم۔ اے۔ او کالج کو ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے ملتی تھی۔ مولانا محمد علی کے پاس انگلش لٹریچر، فلاسفی اور ہسٹری کے مضامین تھے۔ مولانا شوکت علی (محمد علی کے بڑے بھائی) نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوتے ہیں تو انھیں مزید تعلیم کے لئے لندن بھیج دیں گے۔ چنانچہ ۶/ جون ۱۹۲۸ء کو مقدونیہ (جہاز کے سفر کے دوران) سے محمد علی عبدالماجد دریابادی اور ظفر الملک کو لکھتے ہیں

"پہلا سفر ۱۸۹۸ء کا کن امنگوں اور کن امیدوں کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ ایک غریب بھائی کی بے نظیر ہمت کی بدولت یکایک آکسفورڈ جانے کا انتظام ہوا تھا۔ پیسہ عنقا کا حکم رکھتا تھا، سول سروس میں کامیابی کی امید تھی۔"(۴)

مولانا محمد علی کا داخلہ ۶/ نومبر ۱۸۹۹ء کو لنکن کالج آکسفورڈ میں ہوا۔ مولانا شوکت علی نے تحریر کیا ہے:

"آکسفورڈ میں ڈگری کے لئے پڑھتے تھے۔ اور چھٹیوں میں رین ایجڈ گرنی

شوکت علی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے الہ آباد سے ڈھائی ماہ کی تیاری کے بعد ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان دیا۔ لیکن اسٹمپ ایکٹ کے پرچے میں فیل ہو گئے سن ۱۹۲۰ء میں انھیں اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے مدرسہ نظامیہ سے مولانا کی اعزازی ڈگریاں عطا کی گئیں۔

مولانا محمد علی کی شادی اُن کے چچا عظمت علی خاں کی صاحبزادی اُمجدی بانو سے ہوئی اور شادی کے بعد یہ امجدی بیگم کہلانے لگیں۔ یہ معمولی اردو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ لیکن شادی کے بعد انھوں نے اردو فارسی اور معمولی انگریزی میں اپنی استطاعت بڑھالی تھی۔ مولانا شوکت علی نے ان کے لئے گھر پر ایک استانی کا بھی انتظام کیا تھا۔

مولانا محمد علی نے پہلی ملازمت ریاست رام پور میں محکمہ تعلیمات میں کی۔ ۱۹۰۳ء میں استعفےٰ کے بعد وہ ملازمت کی تلاش میں رہے۔ بعد میں مہاراجہ سیاجی راؤ گائیکواڑ بڑودہ نے انھیں اپنی ریاست میں محکمہ افیم میں ایک اعلیٰ عہدہ دے دیا۔ محکمہ افیم کی آمدنی میں ۱۷ لاکھ روپے کا منافع ہوا۔ جو گذشتہ آمدنی سے دو ہزار پندرہ فی صد زیادہ تھی۔ مہاراجہ نے خوش ہو کر انھیں نوساری کا کمشنر بنادیا۔ بڑودہ کی ملازمت کے دوران ہی مولانا محمد علی نے Times of India میں مضامین لکھے تھے۔ جسکی وجہ سے بڑودہ اسٹیٹ کے اعلیٰ حکام میں ان کی مخالفت میں ایک محاذ بن گیا۔ مولانا محمد علی نے ابتدا میں دو سال کی بغیر تنخواہ کے چھٹی لی اور کامریڈ نکالنے کی تیاری کرنے لگے۔ اور اس طرح انھوں نے ۱۹۱۰ء میں بڑودہ کی ملازمت سے استعفےٰ دے دیا۔ مولانا محمد علی نے تحریر کیا ہے۔

"۱۹۱۰ء کے آخر میں میں نے ملازمت بڑودہ ترک کر دی۔" (۱۱)

رام پور میں نظر بندی مولانا محمد علی ۱۶ر اپریل ۱۹۱۵ء کو دہلی سے رامپور آئے ۱۷ر تا ۲۰ر اپریل ۱۹۱۵ء تحصیل سوار میں انھوں نے شکار کھیلا۔ رامپور آنے پر نواب حامد علی خاں، نواب رامپور نے انھیں طلب فرمایا۔ اور انھیں رامپور میں نظر بند کر دیا۔ ان کی طبیعت خراب تھی۔ اس کی پوری تفصیل مولانا محمد علی نے اپنے ایک خط میں تحریر کی

ہے۔ اسکی اہمیت کے پیش نظر اس کے اہم حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ اس خط پر مکتوب الیہ کا نام نہیں ہے۔ صرف لینڈاؤن ۱۹۱۵ء تحریر ہے۔ لینڈاؤن میں مولانا محمد علی نظر بند تھے۔ تحریر کرتے ہیں:

"میں نے اواخر فروری میں طے کر لیا تھا کہ ـــــ اپنی صحت کی اصلاح اور دماغی کام سے فرصت حاصل کرنے کے لئے دہلی سے باہر چلا جاؤں گا۔۔۔ اس تعطیل کے زمانہ کو کہاں گذاروں اس کے متعلق مختلف مقامات کا خیال آیا۔" (۱۲)

مولانا محمد علی کا اس زمانہ میں لاہور کے چیف کورٹ میں کامریڈ کا مقدمہ بھی چل رہا تھا۔ اس مقدمہ اور لیجسلیٹو کونسل کے سیشن کے بعد مولانا محمد علی کا ارادہ کشمیر جانے کا تھا، لیکن کشمیر میں ان دنوں مہاراجہ بڑودہ کے ریزیڈینٹ تھے، اور کامریڈ میں مہاراجہ بڑودہ کے دربار سے متعلق کچھ مضامین شائع ہو چکے تھے۔ اس لئے مولانا کے دوستوں نے انھیں کشمیر جانے سے منع کیا۔ شملہ جانے کے لئے بھی احباب نے اس لئے منع کیا کہ حکومت پنجاب ظفر علی خاں پر تشدد کر چکی تھی۔ خطرہ یہ تھا کہ مولانا بھی ہدف نہ بن جائیں، اس لئے یہ رائے قرار پائی کہ کچھ عرصے کے لئے مولانا رامپور میں رہیں۔ اور گھر پر آرام کریں۔ مولانا محمد علی ۲۰ر مارچ کو طے کر چکے تھے کہ رامپور آئیں بوجہ اولڈ بوائز کے سالانہ جلسے اور مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے اجلاس کے بعد مولانا ۱۳ر اپریل کو رامپور آنے والے تھے۔ لیکن ڈاکٹر انصاری نے کہا کہ رامپور میں طاعون کا زور ہے۔ ٹیکہ لگوا کر رامپور جائیں، چنانچہ مولانا محمد علی ۱۵ر اپریل کو دہلی سے چل کر صبح چھ بجے ۱۶ر اپریل ۱۹۱۵ء کو رامپور پہنچے۔ مولانا کے خاندان کے افراد اور ریاست کی ملازمت میں تھے۔ اور شخصی دور حکومت میں بہت سے کام، شہنشاہوں کی زبان سے فرمانے پر ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص نواب حامد علی خاں، رامپور کا زمانہ ان کے دبدبے کے علاوہ ان کے 'حکم' کے لئے بھی مشہور ہے۔ مولانا جب کبھی رامپور آتے، بزرگوں اور اہلِ خاندان کے کہنے کی وجہ سے خاص باغ (نواب رام پور کی کوٹھی)

جاتے۔ تاکہ نواب کو سلام کر سکیں۔ مولانا محمد علی تحریر کرتے ہیں۔

"جب سے کانپور کا واقعہ پیش آیا ہے۔ حضور ممدوح کی باریابی کا شرف حاصل نہیں ہوا ہے۔ گو میں اپنی حاضری کی اطلاع ہمیشہ دیا کرتا ہوں۔" (۱۴)

مولانا محمد علی تحصیل سوار (رامپور) سے ۲۰ اپریل 1915 کو شکار سے لگ بھگ آٹھ بجے اپنے گھر واپس پہنچے۔ ۲۱ اپریل کو مولانا محمد علی کے چچازاد بھائی حشمت علی خاں قلعہ کپتان اور مجسٹریٹ محمد علی کے پاس آئے اور کہا کہ نواب صاحب صبح تشریف لائے تھے۔ معلوم کرتے تھے کہ محمد علی ابھی شکار سے واپس آیا یا نہیں اور مسجد کانپور سے متعلق ۲۰ اپریل کے ہمدرد میں جو حالات شائع ہوئے تھے، اس کے متعلق فرماتے تھے کہ یہ کیا واقعہ ہے۔ مشہدِ مقدس میں تو خونباری ہوئی نہیں کانپور کی مسجد میں کیسے ہوئی' (۱۴)۔ میں نے اپنے چچازاد بھائی حشمت علی خاں سے کہاں کہ اگر معلوم کریں تو کہہ دیجئے گا کہ میں تو پندرہ (۱۵) اپریل کو دہلی سے رخصت ہو چکا ہوں۔ مجھے مسجد کی خونباری کا کیا علم ہو سکتا ہے"۔ مولانا محمد علی کے قول کے مطابق یہ صبح ساڑھے نو بجے کا واقعہ ہے (۱۶) حشمت علی خاں کے جانے کے تھوڑی دیر کے بعد قلعہ سے ایک ہلکارہ محمد علی کے پاس آیا اور اس نے مولانا محمد علی کو اطلاع دی کہ کوٹھی خاص باغ میں، چیف سیکریٹری صاحب نے، بحکم نواب صاحب یاد فرمایا ہے۔ ایک ضروری سرکاری کام ہے مولانا اس واقعہ کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"کچھ عرصے گاڑی کا انتظار کرنے کے بعد میں کوٹھی خاص باغ گیا۔ اور غالباً ۱۱ بجے تک وہاں پہنچ گیا۔ چیف سیکریٹری کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دلوائی اور ان کے دفتر کے ڈیرے میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تشریف لائے اور مجھ سے کانپور کی خونباری کے متعلق دریافت فرمایا۔ میں نے ان کو بھی وہی جواب دیا جو کپتان حشمت علی صاحب کو اس سے قبل دے چکا

تھا۔"(۱۷)

اُس کے بعد چیف منسٹر ہز ہائینس نواب آف رامپور حامد علی خاں کے پاس کمرے میں گئے۔ کچھ دیر بعد ایک ہلکارہ نے اطلاع دی کہ سرکار کا حکم ہے کہ کوٹھی میں ان کے دفتر کے کمرے میں مولانا محمد علی آجائیں۔ مولانا وہاں بیٹھے رہے۔اس کے بعد اردلی نے پکار کہا کہ "تمہیں سرکار اپنے استراحت کے کمرے میں یاد فرماتے ہیں"۔ مولانا محمد علی جیسے ہی حامد علی خاں کی خوابگاہ میں داخل ہونے لگے۔ان کا جوتا اتروا کر انھیں ننگے پیر کرلیا گیا۔ تاکہ خوابگاہ نواب میں جاسکیں نواب حامد علی خاں پلنگڑی پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ کمرے میں صوفے اور کرسیاں بھی تھیں لیکن کمرے میں گھستے ہی نواب نے مولانا محمد علی کو زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ مولانا محمد علی نے زمین میں بیٹھتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی۔ لیکن نواب حامد علی خاں کی قہر آلود نظریں انھیں گھورنے لگیں۔کمرے میں بیٹھے مصاحبین موقع کی نزاکت کو تاڑ کر انھیں فرشی سلام کرتے ہوئے، کمر پیچھے کئے ہوئے، (اس لئے کہ سرکار کی جانب کمر نہیں کی جاسکتی تھی۔) کمرے سے آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔

راقم مولانا محمد علی کے نواسوں میں ہے۔اہلِ خاندان، اہلِ محلہ اور اہلِ شہر، جن سے اس پورے واقعہ کی تفصیل محمد علی نے بیان کی تھی ان ساری راویوں نے راقم السطور کو نواب حامد علی خاں کی نازیبا گفتگو، سخت رویّے اور چند دھمکیوں کے بارے میں بتلایا تھا، صفحات کی کمی کے باعث اور اس لئے کہ اب نواب خاندان خود ایک قابل عبرت درستان کی طرح ہے۔اس کی تفصیلات لکھنے سے گریز کرتا ہے۔لیکن "قارئین کی معلومات کے لئے میں مولانا کے خط کا ایک مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں۔ تاکہ اس آزادی کے متوالے کے ساتھ ،نواب نے کیا سلوک کیا ہے اس کا اندازہ ہوسکے۔ملاحظہ ہو:

"سرکار نے فرمایا ہر انگریز تمہاری شکایت کرتا ہے۔ سارے جہان کو شیطان کی طرح گمراہ کر رکھا ہے۔ یہ مشہور کردیا ہے کہ میں بھی تمہارا ہم خیال ہوں، میں نے اس کی تردید کی مگر نواب صاحب سب دھمکی فرماتے

رہے۔ جس کی وجہ سے میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔۔۔ مگر اسی سلسلے میں سرکار نے فرمایا تو نمک حرام ہے۔ اس پر میں نے کہا یہ درست نہیں۔ اس پر اور بگڑ کر سرکار نے فرمایا کہ تو نمک حرام اور تیرا باپ نمک حرام میں نے عرض کیا جو میرے باپ نے کیا وہ اس کا فعل تھا۔ اور اس کا ثواب عذاب ان کی گردن پر میں ذمہ دار نہیں۔ اس پر سرکار اور برافروختہ ہوئے اور کہا میرے سامنے جواب دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا سرکار نے اس سے قبل بھی بہت برا بھلا کہا مگر میں نے گردن نہیں اٹھائی۔ البتہ نمک حرامی کے الزام کا جواب دینا میرا فرض ہے۔ میں سرکار کے سامنے پھر عرض کردوں۔ یہ الزام بالکل غلط ہے۔ اور جس کسی نے سرکار سے کہا وہ بالکل جھوٹ بکتا ہے۔ رہا قلعہ میں مقیّد ہونا یہ تو کوئی چیز نہیں ہے۔۔۔ اگر سرکار جیل بھی بھیج دیں۔۔۔ اگر سرکار مجھے جیل میں رہنے کا حکم دیں۔ بلکہ سزائے موت بھی دیں۔۔۔ آج اگر سزا دیتے ہیں تو ہم قاعدہ قانون کو تلاش نہیں کریں گے۔ اگر گورنمنٹ ہمیں مقید کرتی تو جہاں تک قاعدہ اور قانون اجازت دیتا ہے اپنے حقوق کے لئے لڑتا۔"(۱۸)

مولانا محمد علی کے ان جملوں میں کہ اگر گورنمنٹ ہمیں سزا دیتی تو ہم قانوناً حقوق کے لئے لڑتے۔ لیکن سرکار سزا دے رہے ہیں اس لئے ہم قانون کا سہارا نہیں لیں گے۔ مولانا کے متذکرہ بالا خط کے اس اقتباس کے مفہوم میں نواب رامپور کے مزاج کی پوری تاریخ ہے۔ اس لئے محمد علی جانتے تھے کہ نواب کی زبان سے نکلا ہر لفظ انصاف اور قانون ہے، بہر حال انھیں قلعہ مُعلیٰ کے مہمان خانے میں نظر بند کردیا گیا۔ مہمان خانہ اس عمارت میں تھا، جس عمارت میں اب ماڈل ماتحیہ ری اسکول ہے۔ اور اسکے مشرق کی جانب رائٹ صاحب (جس فرانسیسی آرکیٹکٹ نے قلعہ کو اپنی دیکھ ریکھ میں تعمیر کروایا) کا اسٹیچو لگا ہوا

ہے۔ یہ عمارت رنگ محل کے مشرق میں رائٹ گیٹ سے قریب ہے۔

نواب رامپور نے یہ بھی حکم لگایا کہ قلعہ کی نظر بندی کے دوران کاغذ قلم آپ کو نہیں دیا جائے گا۔ حامد علی خاں نواب رامپور نے یہ بھی کہا کہ جب تک جنگ ہے آپ اخبار کو بند کریں۔ اخبار کے بند کرنے کے سلسلے میں مولانا محمد علی نے کہا۔

> جو کچھ میرا ہے خواہ وہ دولت ہو یا عزت سرکار پر سے نثار۔ مگر۔۔۔ حق العباد کی قربانی خدا کے لئے بھی نہیں کی جا سکتی۔ اور خداوند کریم حق اللہ معاف کر سکتا ہے۔ حق العباد کا معاف کرنا بندوں کی مرضی کے بغیر وہ بھی گوارہ نہیں فرماتا۔ سرکار میرے تمام حقوق سلب کر لیتے مگر جو خدمت میں کامریڈ و ہمدرد کے ذریعے قوم و ملک کی کر رہا ہوں۔ وہ کسی حالت میں ترک نہیں کی جا سکتی۔ اس عرصے میں حکیم اجمل خاں بھی وہاں تشریف لے آئے۔ اور انھوں نے بھی ہمدرد کے متعلق فرمایا کہ اسکی روش قابلِ اعتراض نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ نہایت معتدل ہے۔ اس پر سرکار نے فرمایا خیر اخبار جاری رہے۔ مگر تم قلعہ میں رہو۔"(۱۹)

اس گفتگو کے بعد مولانا محمد علی چیف منسٹر کے کمرے میں آ گئے۔ مولانا نے چیف منسٹر سے کہا کہ میری اس نظر بندی کی وجہ سے اگر پبلک میں شورش ہو تو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں گا۔ یہ سرکار کو بتانا آپ کا فرض ہوگا۔ چیف منسٹر نے سرکار سے دوبارہ گفتگو کی اور مولانا محمد علی کو بتایا کہ سرکار کا حکم ہے کہ وہ اس وقت آرام کے لئے جاتے ہیں۔ شب آٹھ بجے بیدار ہوں گے، اس وقت آپ سے پھر گفتگو کریں گے اور اس وقت تک آپ یہیں رہیں گے۔ شب میں ہی سرکار احکام جاری کریں گے۔

مولانا شام تک حکم کے مطابق چیف منسٹر کے کمرے کے برابر کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ اس عرصے میں انھیں حرارت بھی ہو گئی۔ شام کو مسٹر ڈکلس اسٹریٹ کی موجودگی میں نواب رامپور اور مولانا کی گفتگو کانپور کے واقعہ سے متعلق ہوتی رہی۔ اس کے

علاوہ نواب رامپور نے کہا کہ دوسری غلطی تمہاری یہ کہ تم نواب محمود آباد سے روپیہ لیکر انگلستان چلے گئے۔اس گفتگو کے بعد چیف منسٹر نے ایک بار پھر نواب سے معلوم کیا کہ محمد علی کے بارے میں کیا حکم ہے۔نواب صاحب نے کہا انھیں قلعہ میں نظر بند کردو۔انھیں قلعہ کے مہماں خانہ میں نظر بند کر دیا گیا۔مولانا محمد علی اب حراست میں تھے،دوسرے دن ان کے ایک بھانجے اور ایک رشتے کے بھائی امتیاز علی خاں ملنے کے لئے گئے تو کپتان حشمت علی خاں (مولانا کے چچازاد بھائی قلعہ کپتان) نے نہیں ملنے دیا۔

مولانا محمد علی نے حکیم اجمل خاں کے نسخے کے مطابق گھر سے دوا منگوا کر پی لیکن حرارت بڑھتی ہی چلی گئی۔اغلب یہ ہے کہ نواب کے مزاج سے حکیم اجمل خاں چونکہ واقف تھے اور دوسری جانب محمد علی کی شخصیت اور نیک مقاصد سے بھی اس لئے حکیم صاحب نے کوئی ایسی دوا تجویز کی کہ جس سے حرارت بڑھنے لگی۔کچھ دیر بعد ڈاکٹر انصاری بھی قلعہ رامپور میں آگئے۔اور انھوں نے محمد علی کا معائنہ کیا۔اور انھوں نے محمد علی کے بارے میں نواب صاحب سے گفتگو کر کے ان نتائج سے بھی آگاہ کیا جو مولانا محمد علی کی گرفتاری کی وجہ سے ہندستان کے مختلف شہروں میں پیدا ہو سکتے تھے۔

حالات کی روشنی میں اغلب یہ ہے کہ مولانا کی رامپور کے قلعہ میں نظر بندی کے بعد حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے مشورہ کیا ہو گا کہ محمد علی کو نواب حامد علی خاں کے چنگل سے کیسے چھڑایا جائے۔اسلئے کہ اگر وہ ان کے قتل کرنے کا بھی حکم دے دیتے تو نواب کو کسی ثبوت یا قانونی سہارا لینے کی ضرورت نہیں تھی۔اور دونوں کے مشورہ کے بعد یہ طے ہوا ہو گا کہ ایسی دوا دی جائے جس سے حرارت بڑھتی رہے۔بعد میں ڈاکٹر انصاری،جو بیگم رامپور کے طبّی معائنے کے لئے آئے تھے،ان کا نواب رامپور سے گفتگو کرنا اور پھر محمد علی کا معائنہ کرنا (ممکن ہے معائنہ کے بہانے ڈاکٹر انصاری مولانا کو صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہتے ہوں۔) اس بات کی دلیل ہے کہ اُنھوں نے محمد علی کو مشورہ دیا ہو گا کہ انھیں کیا کرنا ہے۔

معائنہ کے دوران ہی اردلی نے اطلاع دی کہ ڈاکٹر صاحب کو سرکار یاد فرماتے ہیں۔ اور اس کے کچھ دیر بعد چیف منسٹر نے مولانا محمد علی سے گفتگو کی اس کی تفصیل محمد علی نے اپنے ایک خط میں تحریر کی ہے

"(چیف منسٹر نے کہا سرکار کا حکم ہے کہ تم اپنے مکان جا سکتے ہو۔ مگر تا اختتام جنگ رامپور سے باہر نہ جاو۔ نہ کسی سے خط و کتابت کرو۔ نہ یہاں پر کسی خاص و عام جلسے میں پالیٹکس پر گفتگو کرو۔۔۔ تم لکھ دو کہ تم ان شرائط کی پابندی کرو گے۔ محمد علی نے کہا واضح ہو کہ نہ قلعہ میں اپنی خوشی سے آیا نہ یہ شرائط مجھے پسند ہیں۔ دونوں کو حکم سرکار سمجھا اور جس طرح پہلے حکم پر عامل ہونا اپنا اخلاقی فرض سمجھا اسی طرح اس نئے حکم پر بھی سمعنا و اطعنا کہا چنانچہ تینوں امور جن کا چیف سیکریٹری صاحب نے ذکر کیا تھا ایک عرضی کے چھپے ہوئے فارم پر ایک محرر نے لکھ دئے تھے۔ اور میں نے دستخط کر دئے۔"(۲۰)

اس تحریر کے سرکار میں پیش ہونے کے بعد چیف سیکریٹری نے اطلاع دی کہ بحکم سرکار آپ اب اپنے گھر جا سکتے ہیں۔

اس کے دوسرے ہی دن مولانا شوکت علی کا خط نواب رامپور کے نام آیا۔ جس میں انھوں نے نواب رامپور کی کچھ غلط فہمیاں دور کرتے ہوئے یہ باور کرایا تھا کہ اگر گورنمنٹ مولانا کو گرفتار کرتی تو اس سے گرفتاری کی وجہ معلوم کی جاسکتی تھی۔ (لیکن جمہوریت اور شخصی دور حکومت کا فرق ہوتا ہے۔) ساتھ ہی انھوں نے مولانا محمد علی کو بغرض علاج منصوری لے جانے کی اجازت چاہی تھی۔ اس کے بعد مولانا محمد علی نے بھی ایک عریضے کے ذریعہ یہ چاہا تھا کہ انھیں دہلی ہو کر منصوری جانے کی اجازت مل جائے۔ تاکہ دہلی میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے مشورہ بھی ہو سکے۔ چنانچہ مولانا محمد علی کو بغرض علاج دہلی جانے کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد مولانا محمد علی کو دہلی میں مہرولی کے قریب

گرفتار کر کے نظر بند کردیا گیا۔ رئیس احمد جعفری نے گرفتاری کی تاریخ ۷ا/ مئی تحریر کی ہے (۲۱) لیکن ان کے قانونی مشیر مسٹر کھاٹے نے ۱۹/ دسمبر ۱۹۱۷ء کو چھندواڑے سے مسز بسنٹ کو اپنے ایک خط میں تحریر کیا ہے

"۔۔۔ ۱۵/ مئی ۱۹۱۵ء کا حکم نظر بندی صادر کیا گیا تو ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی تھی۔"(۲۲)

خورشید علی مہر بھی نظر بندی کی تاریخ ۱۵/ مئی بتاتے ہیں۔

"۔۔۔۔ ۱۵/ مئی ۱۹۱۵ء کو مولانا محمد علی قصبۂ مہرولی میں نظر بند کردیئے گئے"۔(۲۳)

مولانا کو مہرولی میں قطب صاحب کی درگاہ کے پاس رہے۔ اس کے بعد انھیں ۲۳/ جون ۱۹۱۵ء کو لینڈ اون میں، کیپٹن اشک کی بیوہ کا بنگلہ کرائے پر لے کر اس میں رکھا گیا۔ مولانا کو نظر بندی کے دوران -/250 ماہوار الاؤنس ملتا تھا۔ جس میں انھیں اپنے گھر کے افراد کے اخراجات بھی برداشت کرنا پڑتے تھے۔ یہ رقم بہت کم تھی۔ انھوں نے اپنے مکاتیب میں اس کا شکوہ بھی کیا ہے۔

۲۰/ نومبر کو دہلی سے چھندواڑہ کے لئے روانہ ہوئے، مولانا محمد علی کے ایک سوانح نگار ابوالحسن لکھنوی نے گرفتاری کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے،

دشمنانِ ملکِ معظم کے ساتھ ہمدردی کے علاوہ، وہ انھیں ترقی بھی دیتے تھے۔ جو امن وعامہ خطرے میں ڈال رہا تھا۔(۲۴)

چھندواڑے کی نظر بندی کے دوران مسٹر عبدالمجید ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مولانا محمد علی کے پاس آئے اور انھوں نے کہا کہ آپ کو رہائی مل سکتی ہے۔ بشرطیکہ آپ اس عہد نامہ پر دستخط کردیں۔ عہد نامہ کا مضمون پڑھ کر سنایا گیا۔ اس میں حکومت سے وفاداری اور شاہ قیصر کے دشمنوں کی ہمت افزائی کرنے نیز ہندوستانیوں کے حق میں کسی بھی قسم کے ایجی ٹیشن کرنے سے باز رہنے کا عہد تھا۔ بالالفاظ دیگر قوم سے غداری اور حکومتِ وقت سے

وفاداری کی تلقین کی گئی تھی۔ عہد نامہ کا جب مضمون پڑھ کر سنایا گیا تو بی اماں پردہ کے پیچھے کھڑی عبدالمجید کی گفتگو اور عہد نامہ کا مضمون سن رہی تھیں۔ انھوں نے علی برادران کے جواب دینے سے پہلے، پردہ کے پیچھے سے کہا.

"گو میں بوڑھی اور ضعیف ہوں۔ لیکن اپنے ہاتھوں میں اتنی قوت محسوس کرتی ہوں کہ اگر یہ کسی ایسے عہد نامہ پر دستخط کریں جس سے قوم کو کوئی نقصان پہنچے اور برٹش گورنمنٹ کی خوشامد ہو تو میں ان کا گلا اسی وقت گھونٹ دوں گی۔" (۲۵)

علی برادران نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ ۷ رجون ۱۹۱۹ء کو انھیں گرفتار کر کے بیتول جیل بھیج دیا گیا۔ اور نظر بندی جیل میں تبدیل ہو گئی۔ ۲۸ ردسمبر ۱۹۱۹ء کو جیل سے رہا ہوئے۔ اور سیدھے امر تسر پہنچے (۲۶) جہاں ایک ہی پنڈال کے نیچے کانگریس، خلافت، جمیعۃ العلما، مسلم لیگ اور دیگر مکتبہ فکر کے حضرات پر مشتمل مشترکہ اجلاس ہو رہے تھے۔ اس لئے کہ جلیاں والے باغ کا خونی حادثہ ہو چکا تھا۔ اس موقع پر ہی علی برادران کانگریس کے ممبر بنائے گئے تھے۔ اور خلافت کا ایک رزولیوشن بھی اسی میٹنگ میں پاس ہوا تھا کہ ایک وفد یوروپ جائے اور خلافت کے بارے میں زبانی طور پر یہاں کی عوام و خواص کو بتائے۔ دراصل اس زمانہ میں لندن میں صلح کانفرنس ہونے والی تھی۔ وفد کے جانے کے سلسلے میں موتی لال نہرو اور گاندھی جی کی بھی یہی رائے تھی کہ کانفرنس سے پہلے ایک وفد یوروپ جائے اور ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی رہنمائی ترکی کے سلسلے میں کرے۔ وفد کے صدر مولانا محمد علی تھے اور ارکان سید حسین، مولانا سید سلیمان ندوی اور ابوالقاسم صاحب سکریٹری آف اسٹیٹ تھے۔ مولانا نے اپنی تقریروں میں کہا کہ جزیرۃ العرب کو ترکی کے تحت رکھا جائے اور اس کے ٹکڑے نہیں کئے جائیں۔ اور ترکی کے خلیفہ کی طاقت کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی بحری، فوجی اور صنعتی طاقت کو مستحکم رکھا جائے۔ انھوں نے کہا: یہ محض مسلمانوں کے جذبات کا سوال نہیں ہے یہ ہمارا

مذہبی عقیدہ ہے۔

۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس ہوئی فاؤنڈیشن کمیٹی کے ۴۷ ممبر بنائے گئے۔ اس کا جلسہ حکیم اجمل خاں صاحب کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس میں حکیم اجمل خاں صاحب نے نیشنل یونیورسٹی کا خاکہ پیش کیا تھا۔ چند عہدہ داروں کے ناموں کا بھی اعلان ہوا تھا۔ حکیم اجمل خاں امیر جامعہ، مولانا محمد علی پرنسپل اور ابوالکلام آزاد ڈین مقرر ہوئے تھے۔

۱۹۳۰ء میں مولانا محمد علی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے۔ اور انھوں نے اپنی تقریر میں کہا میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاؤں گا۔ جب میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ ہوگا۔ یا تو آپ کو ہندوستان کو آزادی دینا ہوگی یا آزاد ملک میں قبر کے لئے جگہ۔"

مولانا کی حیات میں آزادی نہیں مل سکی۔ ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو ہائیڈ ہوٹل پارک لندن میں ان کا انتقال صبح ساڑھے نو (30 9) بجے ہوگیا۔

ٹیونس قاہرہ اور عمان کے آئے ہوئے افراد نے پُردرد مرثیے پڑھے۔ (۲۷)

محلی لنگر خانہ میں مولانا محمد علی کے مکان کا عقبی حصہ جس میں ان کا دھوبی رہتا تھا۔ یہ عمارت اب میدان ہے اس چہار دیواری میں اب سندر لال انٹر کالج، رامپور کے طلبا کی سائیکلیں کھڑی ہوتی ہیں۔
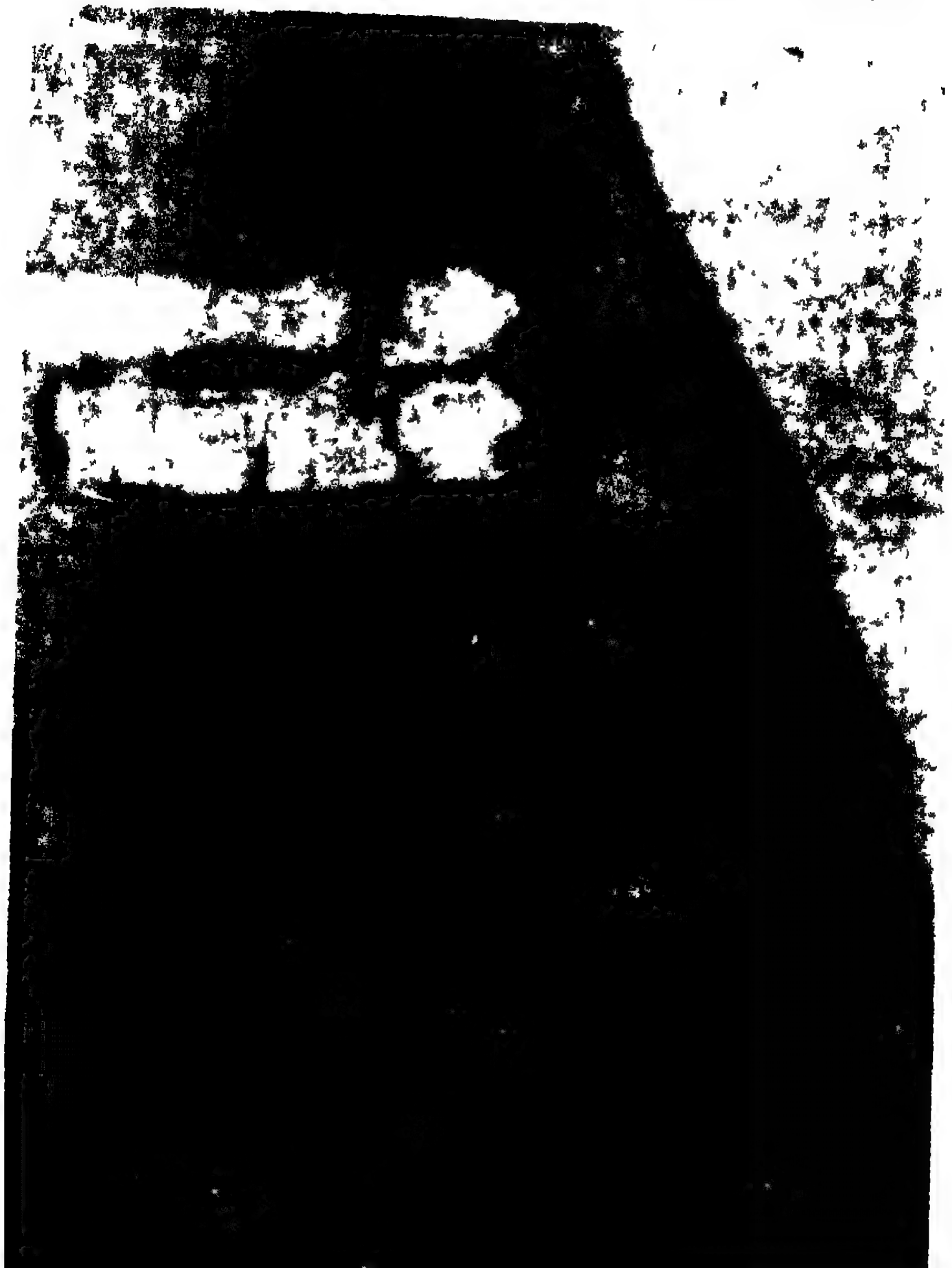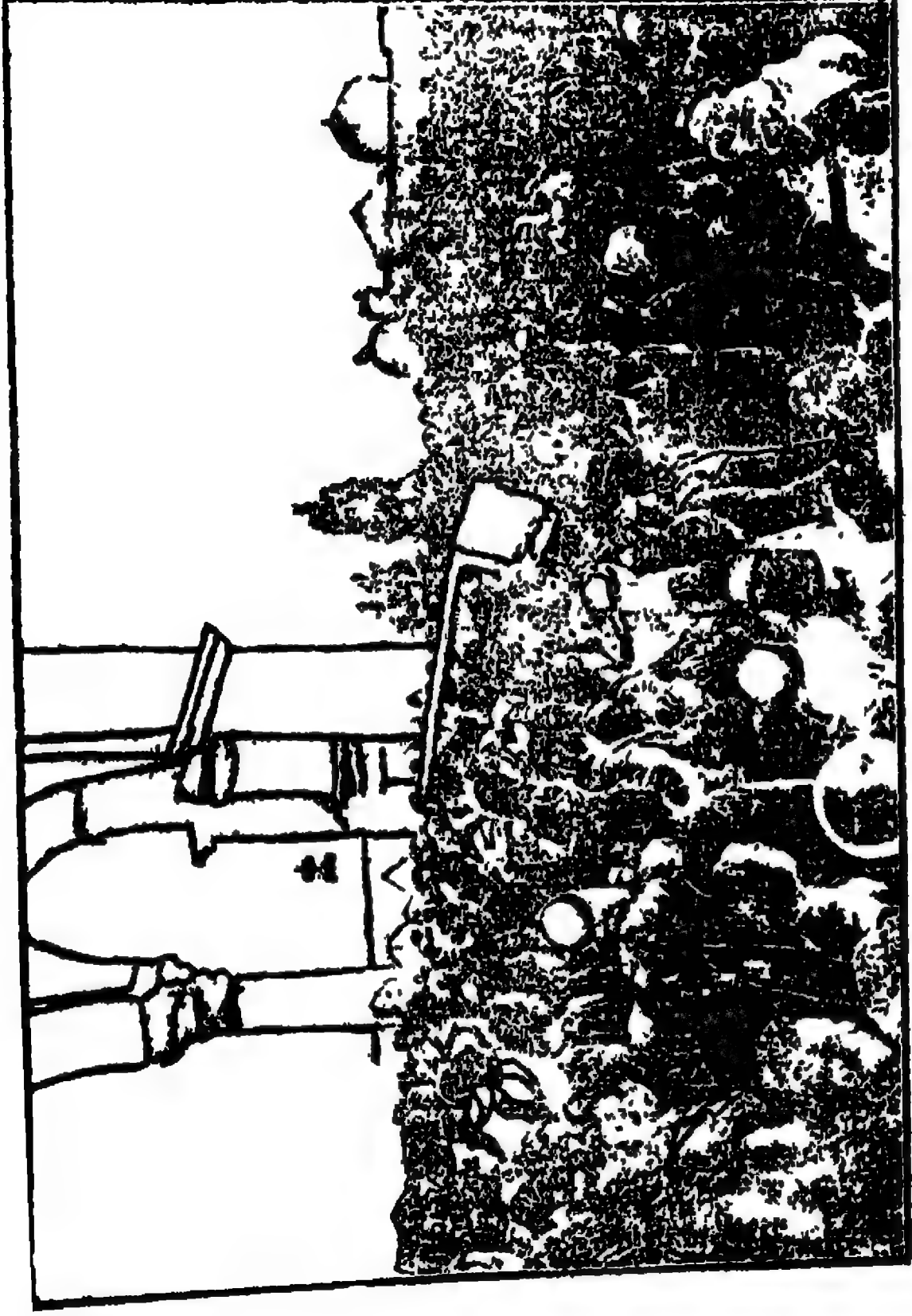
۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو ہائیڈ ہوٹل پارک لندن میں مولانا محمد علی کا انتقال صبح ۳۰-۹ بجے ہوا۔ اور ۲۳ر جنوری کو تابوت جنازہ بذریعہ پانی کے جہاز بیت المقدس پہنچا تو ان کے جنازہ میں شاہ مصر کے نمائندے اور شہر کے ہزاروں علماء اور فضلا جنازہ کے ہمراہ تھے۔

وفات محمد علی

مولانا محمد علی نے اپنی زندگی کا آخری خط یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو لکھوایا تھا جو وزیرِ اعظم انگلستان ریمزے میکڈونلڈ کے لئے تھا۔ دوسری جنوری کو اضافے اور تصحیح کی۔ تیسری جنوری کو محمد علی بیہوش ہو گئے۔ لیکن بیہوش ہونے سے قبل انھوں نے اپنی بیگم سے اپنی بیٹی زہرہ بیگم کو خط لکھنے کے لئے کہا تھا۔ ۳ر جنوری کی صبح میں ناشتہ بھی کیا تھا۔ کھانا بھی کھایا تھا۔ ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو صبح ساڑھے نو بجے ہائیڈ ہوٹل پارک لندن میں انتقال ہو گیا۔(۲۸)

۳ر جنوری کی شام ۵ بجے تک گفتگو کرتے رہے تھے۔ ڈاکٹر سے کہا میں تھک گیا ہوں۔ آرام کرلوں۔ سو گئے۔ شام ۷ بجے جاگے۔ لیکن زبان بند ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کے دماغ پر اتنا بوجھ پڑا، اور انھوں نے اتنا کام کیا کہ دماغ کی رگیں پھٹ گئی ہیں۔ اور اس طرح محمد علی ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو اپنی آخری آرام گاہ کی طرف کوچ کر گئے۔

محمد علی چونکہ ہائیڈ ہوٹل پارک لندن میں مقیم تھے۔ اور دن میں میت کو ہوٹل سے باہر نہیں لایا جاسکتا تھا۔ اس لئے ۵ر جنوری ۱۹۳۱ء کو شب میں ۱۲ بجے ان کی میت کو لفٹ کے ذریعہ ہوٹل سے نیچے لایا گیا۔ مولانا شوکت علی، عبدالرحمٰن صدیقی اور مظفر علی (مولانا کے خاندان کے ایک ڈاکٹر) نے غسل دیا۔ اور شام ۶ بجے لیڈ بجٹن ہال میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔(۲۹)

زہرہ بیگم (مولانا محمد علی کی صاحبزادی) کو بیگم محمد علی نے ایک خط وفات پر لکھا تھا۔ اس خط سے مولانا کی علالت اور وفات کی تفصیلات ملتی ہیں

بیگم محمد علی کا ایک خط

لندن   ۹ر جنوری ۱۹۳۱ء

پیاری زہرہ! پیار

میں زندہ ہوں، لیکن مردوں سے بدتر۔ نہ معلوم میری قسمت میں کیا لکھا ہے کہ اب تک زندہ رہی۔ جنکی دنیا کو ضرورت تھی وہ مجھ کو اور تم کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اسی کا ہر وقت خوف رہتا تھا۔ وہ سامنے آکر رہا۔ میری ایک بھی قبول نہیں ہوئی۔ (ہندوستان جانے کے لئے ان کا کہنا تھا)

جب پورا کام ہو جائے گا۔۔۔ (جاؤں گا)

میری ایک بات نہیں سنتے تھے۔ اس لئے مجبور ہو دیکھتی رہتی تھی جب ۲ر دسمبر کو زیادہ بیمار ہو گئے تھے اور ہوش آگیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ آپ ان سے کہئے کہ ہندوستان جلد چلے جائیں۔۔۔ ڈاکٹر مانک نے کہا۔۔۔ آپ کے گردے کام نہیں کر رہے ہیں۔ تمہارا علاج سوائے آرام کے کچھ نہیں ہے۔۔۔ آپ آرام کیجئے۔ اور یہاں کی سردی بھی آپ کے لئے اچھی نہیں ہے۔۔۔ میں تو آپ کو یہی رائے دیتا ہوں کہ آپ ہندوستان جلد چلے جایئے۔

کہا ! اچھا اگر آپ کی یہی رائے ہے تو میں ۱۶ر کو یا پھر ۲۳ر کو جہاز سے چلا جاؤں گا۔

یکم کو ۸ بجے ایک جگہ جانا تھا، مجھ سے کہا وہاں ضرور جانا۔ دوسرے روز۔۔۔ میں تم کو اور بھائی جان کو خط لکھ رہی تھی۔۔۔ کہا میری بیٹی زہرہ کو لکھ دو۔ ۲ر کو میری بری حالت ہو گئی تھی لیکن بچ گیا۔ آج تھک گیا ہوں (یعنی ۳ر ۱۹۳۱ء کو) ورنہ خود خط لکھتا۔ میں نے کہا میں نے سب لکھ دیا ہے۔۔۔ اسی روز جب میں گئی ہوئی تھی لکھواتے رہے (یعنی یکم جنوری کو)۔۔۔ اس کی غلطی نکالتے رہے۔ رات کو ۱۱ بجے سو گئے۔ (یکم اور ۲ر جنوری کی درمیانی

شب) جس طرح روز اٹھتے تھے دو تین مرتبہ اٹھ کر پیشاب کیا۔

صبح آٹھ بجے اٹھ کر مجھے آواز دی کہ اب اٹھئے۔ میرا منھ دھلوا دیجئے۔ ۱۳ر جنوری خوب دانت صاف کئے۔ منھ ہاتھ اپنے ہاتھ سے دھویا۔۔کافی پیتے رہے ٹوسٹ کھاتے رہے۔۔۔میں نے کہا جس قدر لوگ ہندوستان سے آئے ہیں انھوں نے (ان سب نے) جہاز میں انتظام کر لیا (ہندوستان واپس جانے کے لئے) آپ نے ابھی تک نہیں کرایا ہے تو کہا کہ زاہد آجائے تو ۱۶ر کے جہاز سے یا ۲۳ر کے جہاز سے انتظام کرتا ہوں۔زاہد آئے تو ان سے کہا کہ ٹیلیفون کرو۔۔۔ہندستانی ہوٹل سے مونگ کی کھچڑی منگا کر کھائی۔۔۔اتنے میں پانچ بج گئے۔۔۔۔کہا میں تھک گیا ہوں۔اب سو جاؤں۔۔۔۔ ۷ بج گئے۔ نرس نبض دیکھنے لگی۔ آواز گلے سے نکلی۔۔ آنکھیں کھلی ہوئی۔اور اٹھنا چاہتے ہیں۔

ہاتھ اٹھایا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں ہاتھ دبایا تو مسکرائے گویا یہ کہ پہچانتا ہوں۔لیکن زبان نہیں چلتی تھی۔۔۔۹ بجے دل کے ڈاکٹر نے کہا فالج ہوا ہے۔ایک ہاتھ ایک پیر بیکار ہے۔

(۱۴ر جنوری ۱۹۳۱ء) صبح سوا نو بجے ہم سب کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔"

انا للہ وانا الیہ راجعون
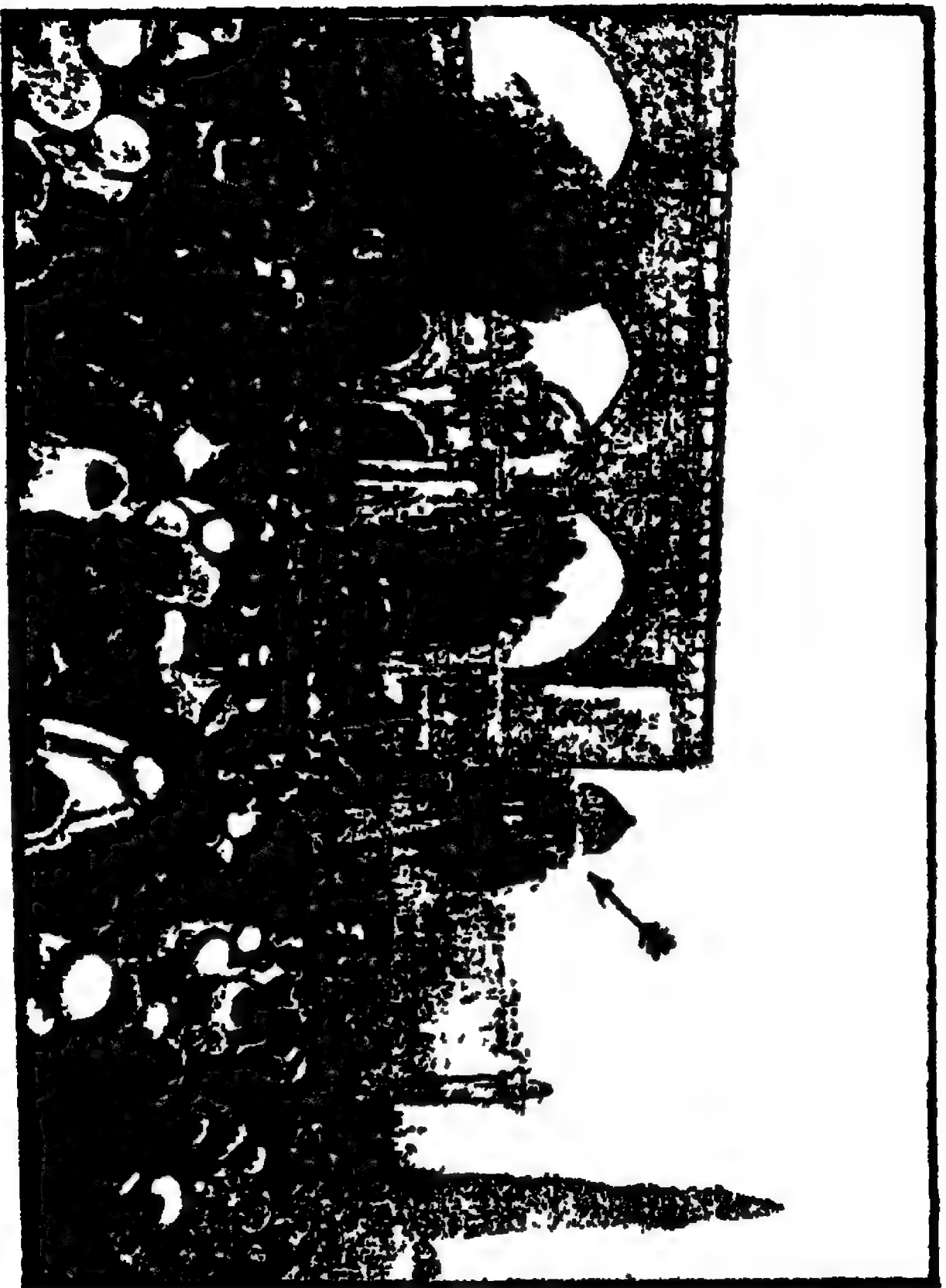
مولانا شوکت علی (واقفا علی المنبر وحوله عظماء الاسلام)

تدفین

مولانا محمد علی کے انتقال کی خبر جیسے ہی ہندوستان پہنچی لکھنؤ، کلکتہ، بمبئی، اجمیر، دھلی اور علی گڑھ سے تار دیئے گئے کہ ان کی میت کی تجہیز و تکفین اور قبر یہاں بنائی جائے۔
لیکن تیسرے دن تار آیا کہ فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ مولانا کو بیت المقدس میں دفن کیا جائے۔ مولانا شوکت علی اور ان کی بیگم امجدی بانو نے اجازت دیدی۔ خورشید علی مہر نے لکھا ہے
"شہید ملت کی نعش ۹ر جنوری کو بعد نماز جمعہ لندن سے بندرگاہ ٹیلری کو روانہ کی گئی اس وقت گول میز کانفرنس کے مندوبین، وزیراعظم وزیر ہند کے قائم مقام موجود تھے۔ پی۔ این او کمپنی کے جہاز میں تابوت کے لئے ایک کمرہ مخصوص تھا۔ ۱۳ر جنوری کو تارکنڈا جہاز مارسیلز پہنچا۔ ۱۵ر جنوری کو جزیرۂ مالٹا پہنچا۔ پورٹ پر کثیر التعداد افراد نے پہنچ کر اپنے شہید معظم کی زیارت کی۔ ۲۱ر جنوری کو تارکنڈا نامی جہاز ان کی میت کو لے کر پورٹ سعید پہنچا۔
۲۱ر جنوری کو جہاز پورٹ سعید پہنچا مصر میں سرکاری طور پر میت کا خیر مقدم کیا گیا۔ جس راستے سے تابوت گذرنے والا تھا وہاں دونوں طرف چھتوں پر کثیر التعداد خواتین و مرد کھڑے تھے۔ اسٹیشن پر تل رکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ خورشید علی مہر نے لکھا ہے ریل کی پٹری کے دونوں جانب ہزار ہا عرب کھڑے تھے۔ (۳۰)

وہاں شاہ مصر کے نمائندہ کی حیثیت سے وزیراعظم مصر اور شہر کے مشائخ موجود تھے۔ سرکاری فوج آگے چل رہی تھی اس کے پیچھے تابوت تھا تابوت کے پیچھے نائب جلالۃ الملک نائب رئیس انور بے اور ہزاروں کی تعداد میں افراد کھڑے تھے اور تابوت کے ساتھ شریک جنازہ ہوئے۔ مسجدِ عباس میں نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ شہزادہ محمد علی نے غلافِ کعبہ کا

ایک ٹکڑا تابوت میں رکھنے کے لئے دیا(۳۱) ۲۳؍ جنوری کو یہ تابوت یروشلم پہنچا تو وہاں کی ساری دکانیں بند ہو گئیں۔ عربی اخبارات اور روی اور تعزیت کے بیانات سے بھرے تھے۔ جلوس میں آگے آگے مولانا شوکت علی اور مفتی اعظم، ان کے پیچھے دو لاکھ سے زیادہ افراد تھے۔ امیر عبداللہ شاہ حسین کے قوانصل، پروٹسٹنٹ اور گریک چرچ کے نمائندے بھی موجود تھے، جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ تونس، قاہرہ، عمان کے آئے ہوئے اصحاب نے پردرد مرثیے پڑھے احمد شوقی نے اپنا مرثیہ اسی جلسے میں پڑھا تھا۔ بینک سیما کمپنی مصر کی طرف سے عبدالعظیم آفندی نے اس تاریخی جلوس کی فلم لی تھی۔(۳۲)

۲۳؍ جنوری ۱۹۳۱ء بروز جمعہ ۳؍ رمضان المبارک ۲ بجے مسجد عمر کے مغربی دالان کے شمالی حصے میں انہیں دفن کیا گیا ان کی وصیت کے مطابق ان کا کفن کھدر کا تھا۔ مولانا محمد علی کی بھی آرزو تھی کہ انہیں حجاز میں دفن کیا جائے انہوں نے اپنے مقالہ کشکولِ گدائی میں لکھا تھا:

> "اس ذاتِ پاک سے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے التجا ہے کہ اگر اس کوچے ہی میں ایک مشتِ استخواں کے لئے دو مشتِ خاک پاک نصیب ہو جائے تو بڑا کرم ہوگا لیکن اس سعادت سے محروم رہوں۔۔۔ جہاں کہیں بھی موت آئے اس راستے میں آئے جس میں محمد اور علی کو آئی تھی۔۔ اگر ایک دن مرنا ہے تو موت مانگتا ہوں زمین حجاز میں۔"(۳۳)

تعزیتی پیغامات

مولانا محمد علی کی اہمیت اور عربوں میں ان کی قدر و منزلت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ طنطاوی جوہری تفسیر القرآن کی بیسویں جلد مکمل کر رہے تھے۔ کہ مولانا کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء میں جب یہ شائع ہوئی تو مولانا کے جنازہ کی تصویر اور تدفین کی تفصیل اس میں موجود تھی۔ طنطاوی جوہری سے جب یہ معلوم کیا کہ حضرت تفسیر اور مولانا

کے واقعات اور تصویر۔ ؟ یہ کیا؟ جواب ملا کہ میری خدا سے دعا ہے کہ لوگوں کو مقام محمد علی سمجھنے کی توفیق عطا کرے مولانا کا جب انتقال ہوا اس وقت ملک الشعرا احمد شوقی بک اپنی زندگی کی آخری دہائی میں تھے ان کی پیدائش قاہرہ میں ۱۸۸۸ء میں ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب رشید رضا اور سید جمال الدین افغانی نے فکر و نظر کی نئی راہیں اہل اسلام کے سامنے کھولی تھیں۔ مصر کے انقلاب کے رہنماؤں میں احمد شوقی کا بھی شمار ہے۔ شوقی کی تعلیم فرانس میں ہوئی اس لئے فرانسیسی ادب پر بھی ان کی نظر تھی۔ ان کا مجموعہ الشوقیات چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ الشوقیات کی تیسری جلد مرثیوں سے متعلق ہے ۱۹۴۳ء میں دار الکتب المصر قاہرہ سے شائع ہوئی تھی اس کتاب کے صفحہ ۱۲۔ ۱۳ پر وہ مرثیہ موجود ہے جو انہوں نے قاہرہ کے اس ماتمی جلسہ میں پڑھا تھا جو مولانا محمد علی کے سلسلے میں کیا گیا تھا۔ مرثیہ کا ترجمہ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کیا ہے ہماری زبان (انجمن ترقی اردو دہلی) مولانا محمد علی نمبر ۸ر اگست ۱۹۷۹ء ص ۶ پر شائع ہوا ہے ترجمہ اس طرح ہے۔

ایک گھر جو ہدایت کی زمین پر اور ہدایت ہی جس کا آسمان ہے۔۔۔ جس کی چہار دیواری اور جس کی عمارت کی بنیاد ہے۔

فتح اس کی نشانیوں میں سے ہے پاکیزگی اس کے اوصاف میں سے ہے اور قدس اس کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

اس کے ٹیلے ہدایت کی وادیوں پر جھکے رہے ہیں اور اس کے دروازہ کو وہ سیٹی کو تک رہے ہیں۔

اس کے دروازہ کی کنجیاں ہم سے کون چھین سکتا ہے؟ اور اس کے ابواب کا جلال اور اس کے صحن کی پاکیزگی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اطراف میں نماز پڑھی ہے اور اللہ کی نوازشوں کا اس کے علاقے میں استقبال کیا ہے۔

آج اسی سرزمین کے ماتم نے لوگوں کو جمع کر لیا ہے اور اس کے آسمان کے جشن

میں فرشتوں کا جشن ہو رہا ہے۔

اے بیت المقدس اپنے چمن کو آراستہ کر لے اس کے لئے جو تیری مٹی میں آرہا ہے اور اس کے پانے کا جشن کر۔

کیونکہ یہ اللہ جل جلالہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے یہ ہندستان کی تلوار ہے جب وہ بے نیام ہو۔

نبی صلی علیہ وسلم نے اپنے براق کی جائے قیام کو اس کے لئے کھول دیا ہے۔ اور ان بلندیوں کو جنھیں آپ نے شرف قدوم بخشا تھا۔

یہ ایسا جواں مرد بہادر ہے جس نے ہمیشہ مشرق کے حقوق کا اپنا بوجھ اٹھائے رکھا اور اسلام کے مسائل جس کے افکار تھے۔
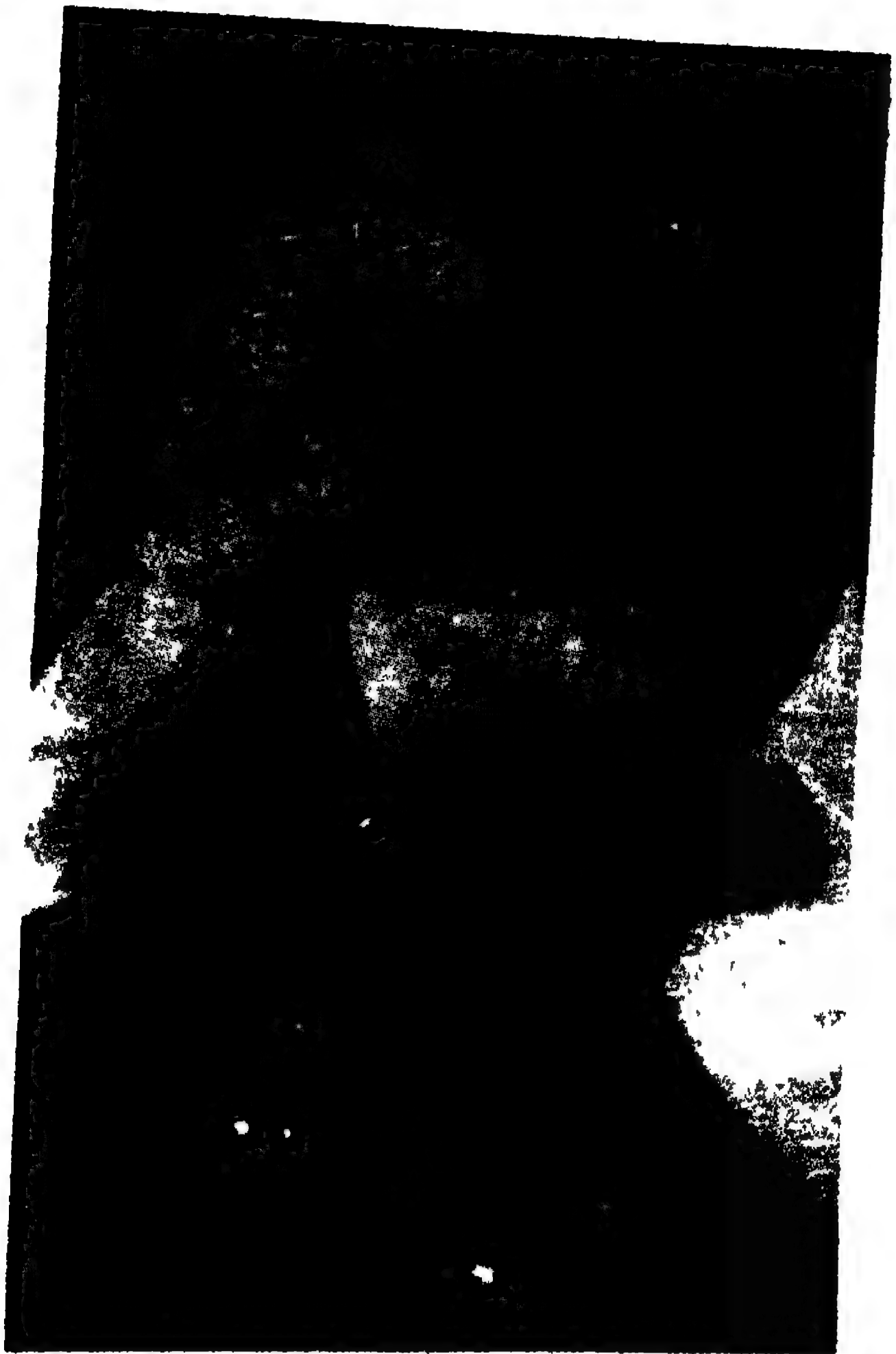
احمد شوقؔ

احمد شوقی کا عربی کا مرثیہ جو مولانا کی وفات پر انھوں نے کہا تھا اور اسے ان کے ماتمی جلسے میں قاہرہ میں پڑھا تھا۔

مولانا محمد علی

بیت(۱) علی ارض الهدی وسمایه ... الحق حائطه و أس بناه
الفتح من اعلامه الطهرمن ... اوصافه دانقدس من اسمائه
تحنو مساکبه علی شعسوالهدی ... وتُظل سدته عنی صیبائه
من دا یمارعنا مقالد بابه ... وحلال سدته وطهر فنائه
ومحمد صلی علی حساته ... واستقبل السحابو فی ارجائه
والیوم ضم الناس ماتم ارضه ... وحوی الملائک مهرجان سمائه
یاقدس مهی من ویاصک ربرةً ... لرىل تنهک واحتفل بلقلبه(۲)
مهو من سیوف الله حل حلاله ... اومن سیوف الهندِ عند قضائه
فتح النبی له مباح براقه ... ومعارج التشریف من اسرائه
بطل حقوق الشرق من احماله ... وتصیته الاسلام من اعبائهِ
لم تنسه الهند العزیزة رقةً ... للشرق اوسهراً علی اشیائهِ
وقباله سُح الهنود فهل نری ... دعوا الزعیم مکفنا نقائهِ
النیل یذکر فی الجو صوته ... والترک لا ینسون صدق بالائهِ
قل للزعیم محمدٍ نزل الاسی ... (بالنیل) واستولی علی بطحائه
یمشی الیک بحمعهِ وبدمعه ... والی احیک بقلبهِ وعزائهِ
احترته محواک فی اطرافهِ ... ولوانتظرت حراک فی احشائه
ولقد تعود ان تمر بارضهِ ... مر الغمامِ بظِلتهِ وبمائه
ثم فی حوارِ الله مابک غربته ... فی ظلِ بیتٍ أنت من أبنائه
الفتح وهو قضیته قدسیة ... یاطالمانا صلتُ دون لوائه
افتی بدفنک عند سیدةِ القریٰ ... هفتٍ ارادالله فی امنائه
بلدوبهوه الاکر مون قصورُهم ... دقبورُهم وقف علی نزلائهِ

قد عشت تنصره وتمنع اهله
عوناً فکیف تکون من غربائهِ

مولانا ظفر علی خاں، ایڈیٹر زمیندار نے مولانا کی وفات پر مندرجہ اشعار میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

جس وقت ہو رہی تھی خلافت کی کانٹ چھانٹ
اور دشمنوں کی رد میں دردانیال تھا

خیبر سے چل کے تابہ سوادِ طرابلس
پھیلا ہوا صلیب پرستوں کا جال تھا

مغرب کا عزم تھا کہ عرب پارہ پارہ ہوں
ایرانیوں کی تاک میں دیو شمال تھا

برقِ تفنگ کوند رہی تھی حجاز پر
ناموسِ خواجہ دوسرا پائمال تھا

دیتا تھا بوسہ قدس لوائے صلیب کو
لتھڑا ہوا لہو میں نشان ہلال تھا

ارضِ حرم تھی خونِ مسلماں سے لالہ رنگ
اسلام کا خود اپنے ہی گھر میں یہ حال تھا

اس جاں گسل جہاد میں کیونکر شریک ہو
ہندوستاں کا عقدہ یہی ایک سوال تھا

آخر کیا یہ عقدہ محمد علی نے حل
حالانکہ ساری قوم میں قحط رجال تھا

محروم تھا اگرچہ وہ تیغ و تفنگ سے
لیکن زباں میں جوہر سحر حلال تھا

ملت کے احتجاج کی قوت تھی پشت پر
اور آگے آگے اس کے نبی کا جلال تھا

اس لشکر گراں نے نصاریٰ کو دی شکست
ممکن وہ ہو گیا جو اک امر محال تھا

ملت کو حس نے فتح 'مبیں' کی نوید دی
اسلام کا یہ قاصد فرخندہ فال تھا
ہند اور عرب کو حس نے ہم آغوش کر دیا
پیوند قدس ہوکے وہ اُس کا وصال تھا
میں اس کے حق میں اس کے سوا اور کیا کہوں
ہندوستان میں آپ وہ اپنی مثال تھا

محمد علی کے لئے علامہ اقبال کا خراج عقیدت

محمد علی جوہر

یک نفس جانِ نراد اوتپید اندر فرنگ
تامژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں درگذشت
اے خوشا مشت غبار او کہ در جذب حرم
از کنار اندلس و از ساحل بربر گذشت
خاک قدس او را بہ آغوش تمنا درگرفت
سوئے گردوں رفت زاں را ہے کہ پیغمبر گذشت
می نہ گنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیز اسود و احمد گذشت
جلوہ او تا ابد باقی بہ چشم آسیا است
گرچہ آں نور نگاہ خاور از گذشت

ماخذ: مختصر سوانح محمد علی

(۱) حافظ احمد علی شوق تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۴۵۹، ہمدرد پریس، مارچ ۱۹۲۹ء دھلی۔

(۲) فرمان کا عکس ملاحظہ ہو ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی مولانا محمد علی جوہر کی اردو ادبی خدمات کا
تنقیدی جائزہ ضمیمہ، ۱۹۸۶ء، رام پور۔

(۳) روزنامہ خلافت، بمبئی۔ ۲۹ر اپریل ۱۹۳۲ء (مضمون محمد علی کی ابتدائی زندگی
از مولانا شوکت علی۔)

(۴) محمد سرور خطوطِ محمد علی ص ۱۷۵ مکتبۂ جامعہ اکتوبر ۱۹۴۰ء پہلا ایڈیشن۔

(۵) روزنامہ خلافت بمبئی ایڈیٹر مولانا شوکت علی۔ ۶ر مئی ۱۹۳۲ء

(۶) ایضا مورخہ ۶ر مئی ۱۹۳۲ء محمد علی کی ابتدائی زندگی، مولانا شوکت علی۔

(۷) رامپور اسٹیٹ گزٹ ۲۰ر جنوری ۱۹۰۲ء جلد ۴ نوٹ روبکار پر ۱۴ر جنوری ۱۹۰۲ء
کی تاریخ موجود ہے۔

(۸) رامپور اسٹیٹ گزٹ ۱۵ر مارچ ۱۹۰۲ء

(۹) محمد سرور خطوطِ محمد علی ص ۱۷۵۰ مکتبۂ جامعہ اکتوبر ۱۹۴۰ء پہلا ایڈیشن۔

(۱۰) مضامینِ محمد علی ص ۱۵

(۱۱) مضامینِ محمد علی، مرتبہ محمد سرور، آپ بیتی، بحوالہ ہمدرد ۱۷ر جون ۱۹۲۷ء، ص ۱۵
مکتبۂ جامعہ، پہلا ایڈیشن ۱۹۳۸ء

My Life a Fragment Afzal Iqbal, Page, 33

(۱۲) ابو سلمان شاہجہاں پوری مکتوبات رئیس الاحرار، ص ۲۲۳، ماڈرن پبلشرز ۸۲
گول ایمپریس مارکیٹ کراچی۔ ۱۰ر دسمبر ۱۹۷۸ء

(۱۳) ابو سلمان شاہجہاں پوری : مکتوبات رئیس الاحرار ص : ۲۲۴' ماڈرن پبلشرز' ۸۶ گول
امپریس مارکیٹ کراچی۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء
(۱۴)(۱۵)(۱۶) ایضاً (۱۷) ابو سلمان شاہجہاں پوری ۔ مکتوبات رئیس الاحرار ، ص ۲۲۳
(۱۸) ابو سلمان شاہجہاں پوری (مرتبہ) مکتوبات رئیس الاحرار ، ۲۲۵ (۱۸) ایضاً۔
(۱۹) ایضاً : ص : ۲۲۷۔ (۲۰) ایضاً ، ص ، ۲۳۴۔ (۲۱) رئیس احمد جعفری سیرتِ محمد
علی ، ۲۴۹
(۲۲) محمد سرور (مترجم) مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے ، ص ۱۲۹
(۲۳) خورشید علی مہر سیرتِ محمد علی ، ص ، ۳۴' حامد حسین اینڈ سنز نئی روشنی' کوچہ
چیلان' دھلی ۱۹۳۱ء
(۲۴) رئیس احمد جعفری سیرتِ محمد علی ، ص ، ۲۵۰' مرزا ابوالحسن لکھنوی۔ مسٹر محمد علی
کی سوانح عمری بنگال آرٹ اسٹوڈیو' ۱۹۱۸ء
(۲۵) محسنِ اعظم، اسلام نظر بندان چند اہم خطوط'
(۲۶) جواہر لال نہرو ، میری کہانی ، ص ، ۸۴ ، حصہ دوم۔
(۲۷) سیرتِ محمد علی ۔ خورشید علی مہر ' ۱۹۳۱ء ص ۸۸۔۸۹
۔ صباح الدین عبدالرحمٰن : مولانا محمد علی کی یاد میں ، ص ، ۲۶۲۔
(۲۸) سیرتِ محمد علی ۔ خورشید علی مہر ' ۱۹۳۱ء ص ۸۸' کوچہ چیلان' دھلی۔
(۲۹) سیرتِ محمد علی خورشید علی مہر ، ص ۸۸، کوچہ چیلان، رسالہ نئی روشنی، دہلی۔
۔ مولانا محمد علی کی یاد میں ، صباح الدین عبدالرحمٰن ، ص، ۲۶۲
"پورٹ سعید ۔ ۲۱ر جنوری تارکنڈا نامی جہاز مولانا محمد علی کی میت کو لے کر یہاں پہنچ
گیا۔۔۔ جہاں آج صبح نماز جنازہ ہوئی" تار مولانا شوکت علی ۔
(۳۰) ایضاً۔ (۳۱) اخبار مدینہ بجنور۔ ۲۵ر جنوری ۱۹۳۱ء
(۳۲) سیرتِ محمد علی : خورشید علی مہر ' ۱۹۳۱ء ص ۸۸۔۸۹۔ رسالہ نئی روشنی دہلی۔

محمد علی پر الزام ہے کہ اُن کے جذبات میں شدت تھی۔ اس لئے زندگی کے بعض شعبوں میں وہ توازن قائم نہ رکھ سکے۔ ایک عاشق کے جذبہ کی بنیاد ہی شدت پر ہوتی ہے۔ چاہے وہ مجازی ہو یا حقیقی یا ملک و قوم کا، لیکن اس میں صداقت شرط ہے۔ مولانا کے وہ اشعار جو خالص غزل کے ہیں اُن میں جذبے کی صداقت کے ساتھ ساتھ ایک عاشق کے آداب کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ـ مولانا محمد علی کی یاد میں صباح الدین عبدالرحمٰن، صفحہ ۲۶۲
ـ سیرتِ محمد علی رئیس احمد جعفری
(۳۲) روزانہ ہمدرد دھلی ۲۷/اپریل ۱۹۲۸ء 'مقالہ 'کشکول گدائی'۔
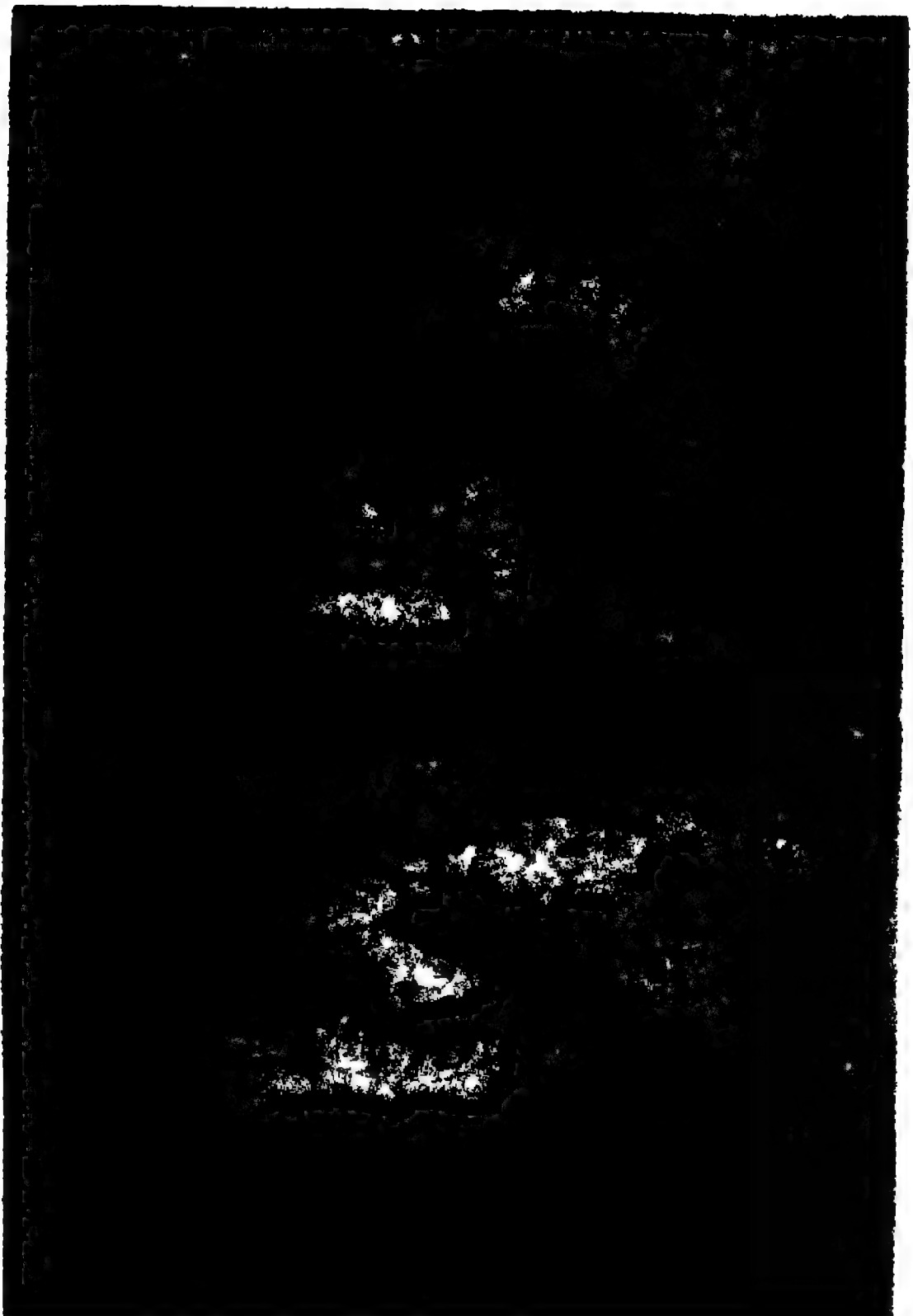
ماخوذ از روداد کانگریس ۳۹واں اجلاس منعقدہ ۲۶،۲۷ر دسمبر ۱۹۲۴ء بہ مقام بلگام (بشکریہ 'جامعہ')

مولانا محمد علی اور جنگِ آزادی

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے مشاہیر نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جس سے آزادی کی تحریک اہم منازل سے گزری۔ اور اس جدوجہد میں صرف علم کا ہی سہارا نہیں لیا گیا بلکہ قید و بند کی سختیاں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ اس زمانے میں ایک مکتبۂ فکر سیاست کو مذہب سے الگ رکھنا چاہتا تھا اور دوسرا مذہب اور سیاست کو ہم آہنگ کرتا تھا۔ آخر الذکر کا نظریہ تھا کہ مذہب ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ اور اس کی روشنی میں معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں زندگی کے مسائل کا حل مذہب کی روشنی میں تلاش کرنا چاہئیے۔ اوالذکر میں جواہر لال نہرو(۱)، اور ان کے رفقاء کار تھے۔ اور آخر الذکر میں مولانا محمد علی، گاندھی جی، مدن موہن مالویہ اور ان کے ہم خیال تھے۔ مولانا محمد علی کی سیاسی زندگی کے بارے میں عتیق صدیقی نے تحریر کیا ہے

> "۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کو ہفت روزہ کامریڈ کے اجرا کے ساتھ محمد علی کی عملی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔"(۲)

لیکن قیادت کرنے کا جذبہ مولانا محمد علی میں بچپن سے ملتا ہے۔ محفوظ علی بدایونی نے ان کی طالب علمی کے زمانہ کے بعض واقعات تحریر کئے ہیں

> "محمد علی اور میرا ساتھ سب سے پہلے ۱۸۸۸ء میں ہوا۔ جب ان کی عمر دس برس کی تھی۔ امتیاز(۳) کے ساتھ بریلی کے اسکول میں پڑھنے کے لئے آئے۔ اور بورڈنگ ہاؤس میں دو کمرے، میرے کمرے سے چھوڑ کر مقیم ہوئے۔"(۴)

بریلی اسکول کی طالب علمی کے زمانہ میں بڑے درجات کے طلبا نے ایک انجمن

بنائی تھی مولانا محمد علی نے بھی چھوٹے درجات کے طلبا کی ایک انجمن بنالی، اس انجمن کا باقاعدہ جلسہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ محمد علی نے جلسہ کی تاریخ کی اطلاع کے لئے اپنے ہاتھ سے ایک اشتہار لکھا۔ جلسہ گیارہ تاریخ کو ہونے والا تھا۔

لیکن محمد علی نے اشتہار میں گیارہ تاریخ کو 10st (ٹین فرسٹ) لکھا تھا۔ محمد علی اس اشتہار کو اُچک اُچک کر، کود کر دیوار پر چسپاں کر رہے تھے۔ محفوظ علی نے جب ان سے تاریخ کی طرف اشارہ کر کے معلوم کیا کہ یہ کیا؟ تو کہنے لگے "ٹین فرسٹ گیارہ تاریخ"۔ محفوظ علی نے ان کے ہلکے سے کان کھینچے۔ اور تاریخ درست کر کے لکھ دی۔ بعد میں یہی محمد علی گیارہ تاریخ کو ٹین فرسٹ لکھنے والے، انگریزی کے بہت بڑے انشا پرداز بنے۔ (۵)

مولانا محمد علی جب علی گڑھ پہنچے تو فکر و نظر کے اُن پر مزید دروازے کھلے۔ انھوں نے کھیل کے میدان سے لیکر علمی میدان تک نمایاں حیثیت حاصل کی۔ موصوف نے سجاد حیدر یلدرم، سید وزیر حسن اور چند دیگر ساتھیوں کے ہمراہ علی گڑھ میں چاندنی کے ایک مشاعرہ میں بنیاد ڈالی۔

علی گڑھ میں مشاعرہ کی بنیاد

علی گڑھ کا یہ مشاعرہ کرکٹ کے لان میں چاند کی چودہ تاریخ کو ہوتا تھا۔ اس میں شاعر کے سامنے شمع پیش نہیں کی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ بارش کی وجہ سے چاند کی چودہ تاریخ کو مشاعرہ نہیں ہو سکا بعد میں مشاعرہ ڈائننگ ہال میں ہوا۔ اس موقع پر محمد علی نے غیر طرحی شعر بھی کہا تھا۔

فرش زمرد نہیں وہ چاندنی نہیں لطفِ مشاعرہ تو گیا چاند کے ساتھ

مولانا محمد علی نے اس مشاعرہ کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو تحریر بھی کیا تھا

> "وہ مشاعرہ جسے بعدہ 'حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں کا ہی ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہیں کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔' (۶)

مولانا محمد علی نے آکسفورڈ میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ایک انجمن بنائی تھی اور اس کا نام نورتن رکھا تھا۔ محمد علی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر (نورتنوں کے ساتھ) ہندوستانی طلبا کے مسائل حل کرتے۔ مولانا شوکت علی نے محمد علی کی وفات کے بعد مولانا عبدالماجد دریا بادی کے کہنے پر، محمد علی سے متعلق اپنی یادداشتیں لکھنا شروع کی تھیں۔

یہ یادداشتیں قسط وار خلافت بمبئی میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی ہیں۔ مولانا شوکت علی لکھتے ہیں

> "محمد علی جون ۱۸۹۸ء انگلستان گئے۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد ہی لنکن کالج آکسفورڈ میں داخل ہو گئے۔۔۔۔ ہندوستانی خاص دوستوں کے ساتھ ایک سوسائٹی بھی قائم کی تھی۔ جس کا نام 'اکبر کے نورتن' درباریوں کی

مناسبت سے نور تن رکھا تھا۔ اور اس کا ایک خاص کلب بھی تھا۔ کھانے
کے کپڑے بھی خاص وضع کے تھے۔ جلسے بھی کرتے تھے۔ عام لوگوں کو
اس میں شرکت کی اجازت نہ تھی۔"(۷)

اس طرح قیادت کرنے کا جذبہ محمد علی میں، طالب علمی کے زمانہ سے ملتا ہے۔ لندن کی طالب علمی کے زمانے میں بھی محمد علی ہندوستانی طلبا کی گفتگو میں غیر ہندوستانیوں کی موجودگی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے مسلم لیگ کا دستور اساسی بنایا تھا۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ ان کی سیاسی زندگی کی ابتدا ۱۹۱۱ء سے ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں مولانا محمد علی مسلم لیگ کے صدر چنے گئے لیکن قیدِ فرنگ کی وجہ سے جلسے میں نہیں آ سکے۔ اور کرسیٔ صدارت پر ان کی تصویر رکھی گئی۔(۸)

مولانا نے اپنے خیال کے اظہار کے لئے اخبارات کا انتخاب کیا تھا۔ ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر کی ایما پر انھوں نے مضامین لکھنا شروع کر دیے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں ٹائمز آف انڈیا میں مولانا کا مضمون کئی قسطوں میں موجودہ بےچینی پر اظہارِ خیال Thoughts on Present Discontent شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں تقسیم بنگال پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا نے تحریر کیا تھا

"اکتوبر ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کے احکام جاری کر کے بنگال کو عرصۂ محشر بنا دیا۔ ہندستان کی کل آبادی اس وقت تیس کروڑ تھی۔ لیکن اس کے ایک صوبے کی آبادی نو کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اس ساری آبادی پر گورنمنٹ کے علاوہ تسلط تھا تو فقط اس جماعت کا جسے بنگالی کہتے ہیں یعنی جو صرف علاقۂ بنگال کے ہنود کی جماعت ہے۔ اس تسلط کے باعث عملاً مسلمانانِ بنگال اپنے بہت سے حقوق سے محروم تھے۔ ان کی بڑی تعداد مشرقی حصہ بنگال میں آباد تھی۔"(۹)

اس مضمون میں مولانا نے تقسیم بنگال سے پیدا ہونے والی بےچینی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مسلمانوں کو اس بےچینی سے دور رکھنا اصل تدبر ہے، اس مضمون کی مقبولیت کا حال یہ تھا کہ ٹائمز سے انڈین اسپکٹیٹر (Indian Spectator) نے نقل کیا۔ اور بعد میں کتابچے کی شکل میں چھپا۔(۱۰)

نوٹ محمد علی نے تقسیم بنگال کے بارے میں لکھا ہے
بنگال میں اعلیٰ ذات والے ہنود اکثر زمیندار تھے۔ برہموں میں اعلیٰ ذات کا احساس برتری ہمیشہ سے تھا۔ برہموں میں اعلیٰ ذات کے تصور، مسلم مبلغین کی تبلیغ اور مساوات کی برابری کے احکامِ شریعت کی وجہ سے اکثر مسلمانانِ بنگال ہنود سے مسلمان ہوئے تھے۔ اس طرح مسلمان کاشتکار کے درمیان امیری اور غریبی کے فرق، مذہب کے فرق، اور ذات پات کے فرق نے لارڈ کرزن کو موقع دیا اور اس نے بنگال کے دو حصے کر دیئے۔ مشرقی بنگال اور مغربی بنگال انھیں، سماجی عدم مساوات کے باعث برہمو سماج کی بنیاد پڑی تھی۔
محفوظ علی بدایونی نے لکھا ہے

> " دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ کی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے ساتھ مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔۔۔ قواعد و ضوابط کی تیاری کا سارا کام محمد علی ہی نے کیا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے وقت کے مناسبت سے چند مضامین انگریزی میں لکھ کر اخبار میں چھپوائے تھے۔ ان مضامین کو غالباً نومبر ۱۹۰۷ء میں خاکسار نے یکجا کر کے بمبئی گزٹ کے مطبع میں Thoughts on Present Discontent کے نام سے چھپوا کر شائع کیا۔ کوئی کاپی کہیں مل جائے تو اس پر ناشر کا نام M A Bashir and Co ہوگا۔ M A یعنی خاکسار ہے (یعنی محفوظ علی بدایونی) اور بشیر ایک دوسرا شریک۔"

جب ملک وملت کی خدمت کا جذبہ اور بڑھا تو محمد علی نے ایک وسیع دائرہ میں رہ کر ملک و قوم کی

خدمت کرنا چاہی اور انھوں نے صحافت کے بحرِ ذخار میں اپنی کشتی ڈال دی۔

"میں نے ۱۹۱۰ء میں ریاست بڑودہ کی ملازمت سے اس نیت سے علیحدگی اختیار کی تھی کہ اس سے زیادہ وسیع دائرہ میں قدم رکھ کر ملک وملت کی خدمت کروں تو کامریڈ نکالنے کلکتہ گیا تھا"۔ (۱۴)

مولانا محمد علی علیگ تھے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں شبلی کے لیکچر سنے تھے۔ اور ان کے گھر اپنے بھائی مولانا ذوالفقار علی خاں کے ہمراہ جاتے تھے۔ انھیں سر سید احمد خاں سے بے انتہا عقیدت تھی۔ اس کا اظہار ان کی نظم سر سید احمد خاں سے بھی ہوتا ہے۔ لیکن انھیں سر سید کا اسیر یا ان کے قلی نظریات کا حامی نہیں کہا جا سکتا۔ سر سید نے ہندستانی مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنا چاہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم پہلے علمی اعتبار سے مستحکم ہو مولانا محمد علی بھی قوم کے لئے تعلیم کی اہمیت ضروری سمجھتے تھے، اور تعلیمی نظریات اور نصاب کے سلسلے میں ان کا ایک اپنا نظریہ تھا۔ جامعہ ملیہ کا قیام مولانا کا تعلیم سے دلچسپی اور ان کے تعلیمی نظریات کا ثبوت ہے۔

۱۹۱۳ء میں مدینہ میں ترک مدینہ یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔ دولتِ عثمانیہ نے اس کے لئے ۱۳لاکھ (تیرہ لاکھ) روپیہ سالانہ دینا منظور کیا تھا۔ بعض اخبارات نے اس پر یہ اعتراض کیا تھا کہ جنگ کے زمانہ میں یہ مصارف ترکی کو نہیں بڑھانا چاہئیں لیکن مولانا محمد علی نے یونیورسٹی کے قیام کی حمایت کی تھی۔ ہمدرد و کامریڈ میں محمد علی نے اس سے متعلق مضامین لکھے (۱۳) لیکن سر سید اور محمد علی میں علمی خدمت کے جذبے کی مماثلت کے علاوہ انگریز دشمنی کا اختلاف ملتا ہے۔ مولانا نے اپنی سیاست کی بنیاد ہی انگریز دشمنی اور غیر ملکی سیاست پر رکھی۔ لیکن سر سید احمد خاں ہندوستانیوں کو انگریز مخالفت اور غیر ملکی سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگِ طرابلس اور بلقان کی جنگ کے موقع پر ۱۹۱۲ء میں محمد علی کی ہمدردیاں غیر علاقائی مسلمانوں کے ساتھ تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ ترک انگریز سے برسرِ آزما تھے۔ مولانا ترکوں کی محبت میں سرشار تھے۔ ایک مرتبہ وہ ترکوں

کی ہار کی خبر سن کر خودکشی تک پر آمادہ ہو گئے تھے۔ بلقان کی جنگ کے موقع پر ہلالِ احمر انجمنیں شہر شہر، قائم ہوئیں۔ ہندوستانیوں نے روپیہ بھیجا جو بیشتر ترکی قرضے کے طور پر تھا۔ اور یہ روپیہ چونکہ قرض کی شکل میں تھا۔ لیکن کبھی ہندوستانیوں کو واپس نہیں ملا۔ ندوستان سے ۱۹۱۳ء کے بعد بھی ترکی کو روپیہ ہندوستانی عوا ۱ نے بھیجا جس کی تفصیلات ہمدرد، کامریڈ اور دیگر اخبارات میں ملتی ہیں۔

کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک سیاسی اور مرکزی حیثیت تھی۔ اور انگریز کے مقابلے میں خلیفہ کی طاقت دنیا کی دوسری طاقت تھی۔ مولانا محمد علی کا نظریہ تھا کہ بحیثیت 'مسلماں' دنیا کے تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لیکن اس 'ملیّت' کے نظریے کے ساتھ وہ قومیت کے منافی نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کسی ملک میں ملتیں الگ الگ بھی ہوں (الگ الگ مذاہب کے ماننے والے) تب بھی قومیت ایک ہو سکتی ہے۔

بی اماں نے اپنے ایک خط میں لکھوایا ہے

میرے لڑکوں کو ترکی سے اس سے زیادہ ہمدردی نہیں ہے جتنی کہ انھیں چین سے ہے۔ لیکن ہم میں سے ہر شخص کو جو قرآن کریم پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ حکم دیا گیا کہ وہ کُل مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھے۔ اور ان کے ساتھ ہمدردی اور مہربانی کا اظہار کرے۔ اس وقت تک کوئی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں ہے جب تک وہ مسلمانانِ ترکی کے ساتھ آزادانہ ہمدردی کے اظہار میں کوشاں نہ ہو"

۔۔۔ ایران، مراقش، اور طرابلس کے مسلمان ترکی کے مسلمانوں سے ہمدردی کے کم مستحق نہ تھے۔ (۱۴)

آل انڈیا میڈیکل مشن طبی وفد درمیان میں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری بیٹھے ہوئے ہیں۔

لفٹیننٹ کرنل انور بے درمیان میں بیٹھے ہوئے اور ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد (بشکریہ اسلامک ونڈرس بیورو)

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی (بشکریہ اسلامک مندرس بیورو)

طبّی وفد

ترکوں کی محبت کی سرشاری کی وجہ سے جنگِ بلقان کے موقع پر محمد علی نے ایک طبّی وفد ترتیب دیا۔ جسے زخموں کی تیمارداری اور علاج کے لئے بلقان بھیجا گیا تھا۔ اس وفد کی قیادت کے لئے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا نام انتخاب کیا گیا تھا۔ مولانا محمد علی نے اس وفد کو مختار احمد انصاری کی قیادت میں ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو ہندستان کے ساحل سے روانہ کیا۔ اور وفد ۴ر جولائی ۱۹۱۳ء کو ہندوستان واپس آیا۔

اس وفد کی اہمیت کا اندازہ شبلی کے اس عمل سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب وفد لکھنؤ سے روانہ ہوا اس وقت رخصت کرنے کے لئے شبلی بھی پہنچے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ٹرین کی بوگی میں دروازہ پر کھڑے تھے کہ شبلی نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بوٹ کا بوسہ لے لیا۔ جب مجمع نے معلوم کیا کہ حضرت یہ کیا تو علامہ شبلی نے کہا یہ اسلام کے مجسمۂ غربت کے پاؤں ہیں۔ مولانا شبلی نے ترکوں پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں شہر آشوب، بہت مشہور ہے۔

یہ سیلاب بلا جو بلقان سے بڑھتا آتا ہے — اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتح ایوبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جنابِ حضرتِ باری

کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری (۱۵)

طبّی وفد کو وہاں جاکر دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ ایک حصے کی خدمات میدانِ جنگ کے لئے لی گئی تھیں۔ میدان جنگ میں جانے والے حضرات کو گیلی پولی میں رکھا گیا تھا۔ میدانِ جنگ والے حصے کے بارے میں روزنامہ ہمدرد ۱۲ر مارچ ۱۹۱۳ء تحریر کرتا ہے

"مشن کے اس حصے میں جو گیلی پولی روانہ ہوا ہے، علاوہ ڈاکٹر انصاری کے ڈاکٹر رحمٰن شریک تھے۔ جو ایڈنبرا سے آکر شامل ہوئے ہیں اور مصری ڈاکٹر فوٹو بے بھی ہیں۔ جنھیں عثمانی ہلالِ احمر نے مشن کو دے دیا ہے۔ (مشن سے مراد ہند سے گیا ہوا طبی وفد جو اسلامی مشن ہلالِ احمر کے تحت گیا تھا ہند سے گیا ہوا طبی مشن کا ایک حصہ جو میدان جنگ کے لئے مقرر کر دیا گیا تھا۔) اس مشن کو ہلال احمر ترکی نے ڈاکٹر فوٹو بے کو دے دیا تھا۔ ڈاکٹر فوٹو ترجمانی کرتے رہیں گے۔ خلیق الزماں صاحب اس جماعت کے مہتمم اور عبد العزیز صاحب انصاری منصرم گودام ہیں۔ نور الحسن صاحب کے پاس ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے طبی مشن کے علاوہ بلقان ایک مشن اور بھی گیا تھا۔ جس کا نام Bombay Poor Muslim Mission تھا۔ روزنامہ ہمدرد ۶ / اپریل ۱۹۱۳ء میں ص ۲ پر ڈاکٹر انصاری کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ اس خط سے پہلے اداریہ میں ہمدرد بمبئی کے مشن کے بارے میں تمہید کے طور پر لکھتا ہے

"اس کی ترتیب میں تین فریق حصے دار تھے۔ یعنی چند مسلمان نوجوان اور انجمن ضیا الاسلام نے تو بمبئی سے مدد دی اور ڈاکٹر سہروردی نے کلکتے سے مشن کے لئے کچھ کوشش کی۔ مدراس کے ڈاکٹر محمد حسین صاحب مقرر کئے گئے۔ جو مدراس سے چلے تو اس لئے تھے کہ آل انڈیا مشن میں شریک ہو کر ترکی جائیں۔ لیکن بمبئی میں سن کر کہ ایک مشن انھیں ڈائرکٹری پیش کر رہا ہے۔ بجائے دہلی آنے کے وہیں سے اس میں شریک ہو گئے۔ لیکن ڈاکٹر انصاری مرحوم کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مشن میں جس میں محمد حسین صاحب شامل ہو گئے تھے، بمبئی کے لوگوں نے اس مشن کا نام غربا رکھا۔ سہروردی نے اس کا نام سہروردی مشن رکھا ہمدرد لکھتا ہے

> "اس لئے یہ مشن کہیں غربا بمبئی کا مشن کہلاتا ہے۔ کہیں سہروردی مشن اور کہیں پہلا ہندوستانی مشن کہلاتا ہے۔ خود مشن نے اپنا پہلا نام ہندوستانی مشن رکھا ہے" (۱۶)

اس مشن کے اختلاف کی وجہ سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے اپنے طبی مشن سے ڈاکٹر اظہر فیضی کو جو آل انڈیا میڈیکل مشن کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہو کر تشریف لے گئے ہیں، نے ان کی خدمات مشن کو دیں۔ خیال تھا کہ ڈاکٹر اظہر فیضی کی شخصیت کی وجہ سے شاید پہلے ہندستانی مشن کے اختلافات دور ہو جائیں لیکن وہ اس مشن کے ممبران کے باہمی اختلافات کی وجہ سے واپس طبی مشن میں آ گئے۔ طبی مشن جس کے انچارج ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے، ان کے مشن اور مریضوں کے درمیان ترجمہ کا کام ڈاکٹر فواد بے کر رہے تھے۔ یہ عربی اور ترکی کے ماہر تھے۔ مختار احمد انصاری اپنے خط میں مشن کی کارگزاری کے سلسلے میں مولانا محمد علی کو لکھتے ہیں

"۶ر مارچ کو شفاخانے میں ۱۵ مریض آئے۔ ان میں سے صرف دس ایسے ہیں جن کے پاؤں کا گوشت سرد ہوا میں رہنے سے اور برف میں رہنے سے پھٹ گیا ہے۔ تمام اراکینِ وفد ان مریضوں کی دوادارو اور تیمارداری بہت خوشی اور نہایت جانفشانی سے کر رہے ہیں۔ خصوصاً قاضی بشیر الدین نورالحسن اور عبدالعزیز صاحبان نے جس سرگرمی اور تندی سے مریضوں کی خدمت کی ہے اور کی تعریف و توصیف حدِ مبالغہ سے باہر ہے ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی لگاتار اور ان تھک کوششیں ہمارے شاخانے کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ بنان میں قابلِ داد ہیں۔۔۔ میں بلا پس و پیش کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا شفاخانہ یہاں کے سب شفاخانوں سے بہتر ہے" (۱۷)

ہندوستانی طبی مشن نے مختلف جگہ اپنے Hospitals کی شاخیں قائم کیں۔ ہندوستانی طبی مشن کی کارکردگی دیکھنے کی غرض سے ترکی کے اعلیٰ عہدے دار اور سماجی کارکن اکثر آتے تھے۔

'ہمدرد' میں ترکی سے ارسال کردہ خطوط شائع ہوئے ہیں ان خطوط سے ترکوں کا

ہندوستانیوں کی قیمتی خدمات کے لئے اظہار تشکر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نعیم لکھتے ہیں۔

"اس ہفتے کی سب سے زیادہ ضروری خبر ہزا یکسلینسی احمد پاشا
کمانڈر انچیف افواج عثمانی کی معہ اسٹاف کے ہمارے شفاخانے عمر بے،
میں تشریف آوری کے متعلق ہے۔"
۱۶ ار مارچ کو ۴ بجے شام کو یکایک ہزا یکسلینسی مع اسٹاف گھوڑوں پر
سوار خادم کوئی سے ہمارے شفاخانے میں تشریف لائے۔ وہ چائے کا
وقت تھا۔ اور ممبران وفد چائے کے لئے تیار تھے۔ ہزا یکسلینسی نے
بھی چائے کی دعوت قبول فرمائی اور ممبروں کے ساتھ بینچ پر بیٹھ کر
چائے نوش فرمائی۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا۔
"ہم اور ہماری افواج مسلمانان ہند کے از حد ممنون ہیں کہ انھوں نے
ہماری امداد کی۔۔۔۔ ہمارا شکریہ مسلمانان ہند کے گوش گزار کرا دیا
جائے۔۔۔۔"(۱۸)

ہمدرد ۷ ر مئی ۱۹۱۳ء سلسلۂ خاص، نمبر ۶۴ وامداد مصیبت زدگان مقدونیہ کے عنوان سے
ایک رپورٹ میں مریضوں کی تعداد بتاتے ہوئے لکھتا ہے۔

"ماہ فروری میں کیمپ ہاسپٹل سے ۱۱۴ بیماروں کو بالاوسط روزانہ دوا ملتی
رہی، شفاخانہ کی نفع رسانی اور کارکنوں کی جانفشانی و کارکردگی کا بہتر
انداز مندرجہ ذیل اعداد سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مختلف بیماریوں میں	مرد	عورت	اطفال
جن کا علاج کیا گیا	۱۲۹۹	۱۰۸۳	۸۹۵
شرح اموات	۲	۴۶	۹۴

گویا ماہ جنوری کی ۵ ۲۰۳ مزید معالجہ مریضوں کے علاوہ اس ماہ میں شفاخانے میں
داخل ہو کر صحت یاب ہوئے۔ ۱۲۴ جاں بر نہ ہوسکے۔ مرنے والوں میں کم از کم ۳۶ پچاس

برس سے اوپر، ۳۲ کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ بچوں میں ۲۰ ایک برس کے اندر اندر تھے۔"(۱۹)

ترکی میں کیمپ ہاسپٹل کی جہاں جہاں برانچیں تھیں ان علاقوں میں وبائی بیماریاں مثلاً پیچش چیچک، اور زہریلے بخار موجود تھے۔ کیمپ ہاسپٹل کے ڈاکٹروں نے ان بیماریوں پر قابو پایا اور مریضوں کو صحت یاب کر کے دوسرے خیموں میں بھیج دیا۔

ہمدرد لکھتا ہے

"مسٹر لمب فرماتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اس امداد اور ہمدردی کا ترکوں پر گہرا نقش ہو گیا ہے۔ اکثر افراد رعایا کو تو اس شفاخانہ کی ' ر کارکردگی سے پہلی دفعہ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان بھی کوئی ملک ہے۔"(۲۰)

اس وفد کی اہمیت اس لئے بھی بہت زیادہ ہے کہ ہندوستان یوروپ کے تحت تھا۔ اور طرابلس، بلقان اور ترکی میں یوروپی طاقتیں درپۓ آزار تھیں، یوروپ ایشیا کو اپنے مقابلے کمزور دیکھنا چاہتا تھا۔ ہندوستانیوں کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ اس جنگ کے موقع پر آیا وہ اس قوم کی وفاداری کریں جس کی رعایا ہیں۔ یا ترکوں کا ساتھ دیں جو یوروپ کے ظلم کا شکار تھے۔ (ہندوستان کی عوام اور ترک دونوں یوروپی طاقتوں کے مظالم کا شکار تھے۔)

میری معلومات کے مطابق ترکی قوم کی اس آڑے وقت میں جس طرح ہندوستانیوں نے مدد کی کسی دوسرے ملک نے نہیں کی۔ انھیں تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیہ جمع کر کے بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ خزانے کے تمسکات بھی خریدے گئے۔

اس کی تفصیل آئندہ سطور میں بیان کی جائیں گی۔ ادویات اور دوسری امداد اس کے علاوہ تھیں۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ لیکن مولانا محمد علی نے ہندوستانی قوم میں ترکوں کی ہمدردی کا جذبہ جس طرح پیدا کر دیا اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

مسجد مقدس کانپور کا ایک بیرونی منظر (بشکریہ اسلامک ونڈرس بیورو)

مسجد مقدس کانپور کا صحن اور نقوش خونین اسامنے صحن کی دیوار ہے۔ اس پر جو دھبے نظر آرہے ہیں وہ اُن شہدا کے خون کی یادگار ہے جن کے خوں چکاں اجساد صحن مسجد میں تڑپے۔ خون کے فواروں نے دور تک اپنی چھینٹوں کے نشان قائم کردیئے۔

(بشکریہ اسلامک ونڈرس بیورو)

ایک آٹھ سال کی لڑکی جس کا شانہ چھڑوں سے زخمی ہو گیا تھا۔
(بشکریہ اسلامک وِنڈرس بیورو)

مسلم وکلا کی ایک جماعت جنھوں نے مظلوموں کی وکالت کی۔ (بشکریہ اسلامک ونڈرس بیورو)

کانپور کی مسجد

کانپور میں مچھلی بازار میں ایک قدیم مسجد تھی، ۱۹۱۲ء میں انگریزی سرکار کے دورِ حکومت میں، حکام نے یہ چاہا کہ سڑک سیدھی کردی جائے۔ سڑک کے سیدھا کرنے میں مسجد کے غسلخانہ کے حصے درمیان میں آتے تھے۔ چنانچہ یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو مسجد کے ایک حصے کو سرکاری حکام نے شہید کردیا۔ عوام بھڑک اٹھی، ہندوستانی اخبارات نے خبریں شائع کیں، محمد علی نے واقعہ کی تصدیق خود کی اور ایک دیانت دارانہ صحافی کی حیثیت سے، اس کے بعد اپنے اخبار میں اس سے متعلق لکھا۔ اس سلسلے میں ابوالحسن لکھنوی نے تحریر کیا ہے

"یہ کارروائی ملکہ وکٹوریہ کے اعلان مورخہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے سراسر خلاف تھی۔ مسجد کی شہادت کے ایک ماہ بعد مسلمانانِ کانپور عیدگاہ میں صلاح و مشورہ کرنے کی غرض سے جمع ہوئے۔ اختتام جلسے کے بعد سیکڑوں لوگ۔۔۔ سیدھے مسجد کی طرف چلے اور وہاں پہنچ کر بغیر ریختہ وغیرہ کے اینٹوں کو ایک دوسرے پر ڈھیر کرنا شروع کردیا۔ جو نئے سرے سے بنائے جانے کی نشانی تھی۔ پولیس نے گولیاں چلائیں۔"(۲۱)

اس مسجد کے منہدم ہونے کے سلسلے میں مولانا محمد علی سر جیمس مسٹن سے ملے لیکن ان کا کہنا تھا کہ مسجد کے غسلخانہ مسجد کا حصہ نہیں ہیں۔ جب ہندوستان میں شنوائی نہیں ہوئی تو محمد علی وزیر حسن کے ہمراہ یوروپ گئے۔ خیال تھا کہ کہیں گرفتار نہیں کرلئے جائیں اس لئے سفر چھپ چھپا کر کیا تھا۔ ۶/ جون ۱۹۲۸ء کو مولانا عبدالماجد دریابادی اور ظفر

الملک کو ایک ہی خط میں لکھتے ہیں

"تیسرا سفر سید وزیر (۲۲) حسن کی معیت میں ۱۹۱۳ء میں چھپ چھپا کر ہوا تھا۔ کہ کہیں میرے کرم فرما مسٹن صاحب جن سے دو ہفتے پیشتر ہم سدھار رہے ہیں سنتے ہی میری گرفتاری کا وارنٹ نہ نکال دیں۔ ایم۔ علی اور ڈبلیو حسن کے نام سے دھلی سے ٹکٹ خریدے گئے تھے۔ سورج نکلنے سے پیشتر شوکت صاحب کے ساتھ دھلی کے اسٹیشن سے عید الفطر کے دوسرے دن اس طرح روانہ ہوا تھا کہ گویا شوکت صاحب کو پہنچانے آیا ہوں۔ گھر میں نہ بچوں کو خبر تھی۔ نہ نوکروں کو اور سامان بھی یہ کہہ کر بند ھوالیا تھا کہ شملے جا رہا ہوں۔ وہاں سردی پڑتی ہے۔ گرم کپڑے زیادہ رکھنا، کانپور کی مسجد شہید ہو چکی تھی سو سے زیادہ مسلمان جن میں بوڑھے بھی تھے اور بچے بھی قید تھے۔" (۲۳)

مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن جب لندن پہنچے ہیں، اس وقت وہاں کی پارلیمینٹ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مولانا محمد علی نے وہاں کے افراد کو ہندوستانیوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کے بارے میں بتایا۔ مولانا محمد علی سر جمیس سابق گورنر صوبہ متحدہ سے ملے۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لندن سے لارڈ ہارڈنگ وائسرائے کو ہدایت بھیجی گئی۔ وائسرائے بذات خود کانپور پہنچے۔ ہسپتال میں انھوں نے زخمیوں کی عیادت کی۔ اور مسجد کے منہدم حصے کی دوبارہ تعمیر کی اجازت دی۔

چوائس آف دی ٹرکس ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم چھڑی لندن ٹائمز نے ایک مضمون چوائس آف دی ٹرکس کے عنوان سے لکھا، جس میں ترکوں کو دھمکی دی گئی تھی۔ محمد علی اسے برداشت نہیں کر سکے۔ اور انھوں نے بھی اسی عنوان سے لندن ٹائمز کے مضمون کا جواب لکھا۔ ۲۶ر ستمبر کو مولانا کا یہ مضمون کامریڈ میں شائع ہوا۔ ۳ر نومبر کو کامریڈ کی ضمانت ضبط

کرلی گئی اور اس پاداش میں کامریڈ کو دس سال بند رہنا پڑا۔
نظر بندی کے دوران انھیں تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ اور اس مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اسلام میں زندگی کے ہر شعبہ کا حل موجود ہے اس لئے انھیں یہ یقین ہو گیا کہ ہندوستان کی آزادی کی کوئی راہ وہ اسلام کے ذریعہ سے نکال لیں گے۔ اس کی بہت سی مثالیں علامتی طور پر ان کے اشعار میں بھی موجود ہیں اس طرح مولانا کا یہ نظریہ اور بھی پختہ ہو گیا کہ مذہب کو سیاست سے جدا نہیں رکھا جا سکتا۔
چنانچہ غلام بھیک نیرنگ کو لکھتے ہیں

"۔۔۔ تبلیغ میرا دین و ایمان ہے۔ خلافت تنظیم مسلمانان کا نام ہے اور قیام امن کے لئے اس تنظیم کی ضرورت ہے۔ اسلام گوشہ نشینوں اور تسبیح ہلانے والوں کا مذہب نہیں ہے۔ سیاست بھی تنظیم مسلمانان کا ایک لازمی جزو ہے۔ اور ہم کو ایک اسلامی سیاست ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہے۔ جس میں غیر مسلموں کے گروہ کے ساتھ ہمارا سیاسی تعلق صاف اور غیر مشتبہ نظر آسکے۔"(۲۴)

علی برادران تقریباً پونے پانچ سال کی نظر بندی کے بعد ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے تھے۔ جہاں جمیعۃ العلما کانگریس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ اس سے قبل جلیان والے باغ کا خونی حادثہ پیش آچکا تھا۔
علی برادران کا مختلف اسٹیشنوں پر پرستان آزادی نے خیر مقدم کیا۔ اور امرتسر پہنچنے پر ان کا غیر معمولی خیر مقدم کیا گیا۔ علامہ اقبال نے اس موقع پر مندرجہ ذیل اشعار کہے تھے

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرہ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافہ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپر زاغ و زغن در قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

کانگریس اور محمد علی مولانا محمد علی پہلی بار اس موقع پر کانگریس کے ممبر بنائے گئے۔ گاندھی جی بھی پہلی بار اس اجلاس میں باضابطہ شریک ہوئے تھے۔ علی برادران کے علاوہ چوٹی کے مسلم لیڈران موجود تھے۔ محمد علی نے کانگریس کی صورتِ حال کا تذکرہ کرتے ہوئے ہمدرد میں تحریر کیا ہے

"۔۔۔۔ہماری ملک دوستی اور وطن پروری کا امتحان ۱۹۲۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اور تین چار سال میں کانگریس والوں نے وہ قربانیاں کیں جو اس سے پہلے ۳۳ چونتیس سالوں میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ یہی ایک فرق نہ تھا جو ابتدائی کانگریسیوں اور اس زمانہ کے کانگریسیوں میں تھا۔ یہ بات بھی اب نمایاں ہو گئی تھی کہ پہلے کانگریس فقط ہندو کانگریس تھی جس میں چند سربر آوردہ پارسی بھی شامل تھے۔ مگر اب وہ قومی کانگریس تھی جس میں پہلی بار مسلمان اور سکھ بھی بحیثیت ملتوں کے شامل ہوئے تھے۔(۲۵)

آزادی کی مانگ ۳۱/دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں کانگریس کے اجلاس میں مولانا محمد علی نے اپنے تقریر میں آزادی کی مانگ بھی کی تھی:

"خدا نے مجھے ویسا ہی آزاد پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ جارج پنجم کو۔۔۔۔ آپ سے میری ذاتی اپیل ہے کہ آپ اسے اچھی طرح محسوس کریں کہ ہم یہاں اس لئے جمع نہیں ہوئے ہیں کہ دوزانوں جھک کر یہ درخواست کریں کہ ہم کو جیل خانوں سے آزاد کرادو۔ ہم کو پھانسی کے تختے سے

بچاؤ۔ میں اپنے لئے اپیل نہیں کرتا۔ ہمیں چند آدمیوں کی رہائی کی فکر نہیں ہے۔ ہم چند آدمیوں کو آزاد کراکر سارے ملک کو غلام بنانا نہیں چاہتے۔ میں اس ملک کے نام پر بول رہا ہوں جس کی آزادی ہم کو بہت زیادہ عزیز ہے۔ بہ نسبت کسی شخص واحد کی آزادی کے۔ میں ضرور جیل بھیج دیا جاؤں۔۔۔۔ لیکن ہندوستان کو آزاد ہونے دیجئے۔ تاکہ کوئی شخص آئندہ کسی ہندوستانی مرد اور عورت کے بارے میں یہ نہ کہہ سکے کہ تو پیدائشی غلام ہے۔"(۲۶)

۱۹۲۳ء میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس بارے میں جواہر لعل نہرو نے لکھا ہے

"دسمبر ۱۹۲۳ء کا سالانہ اجلاس کوکناڈا میں ہوا مولانا محمد علی نے مجھے میری مرضی کے خلاف مجبور کیا کہ ان کی صدارت کے دوران میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکریٹری کا عہدہ قبول کروں۔ ایسی حالت میں کہ ملک کے آئندہ پروگرام کے متعلق کوئی بات صاف طور پر میرے ذہن میں نہ تھی۔ میں کوئی انتظامی ذمہ داری قبول کرنا نہیں چاہتا تھا۔"(۲۷)

یہ جواہر لعل نہرو کا اعتراف ہے کہ ملک کے آئندہ پروگرام کے بارے میں ان کے ذہن میں کوئی خاکہ نہ تھا لیکن مولانا کے ذہن میں مستقبل کا واضح تصور تھا۔ اور وہ ہندو مسلم اتحاد کو ہندستانی آزادی کے لئے بنیادی چیز سمجھتے تھے۔

جب کبھی بھی ہندستان میں مذہب کو ملکی مفاد کے بجائے ذاتی مفاد میں استعمال کیا گیا ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر ہوا ہے۔ مولانا ۱۹۲۸ء میں ہندوستان سے باہر تھے۔ جواہر لال نہرو نے تحریر کیا ہے :

"یہ ہندوستان کی بد قسمتی تھی کہ وہ ۱۹۲۸ء میں گرمیوں میں یوروپ چلے گئے۔ اس زمانہ میں فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے کی جان توڑ

کوشش کی گئی۔ اور کامیابی کی امید ہو چلی تھی۔ اگر محمد علی اس وقت
موجود ہوتے تو یقین ہے کہ حالات کچھ اور ہوتے لیکن ان کے واپس
آنے تک پھوٹ پڑ چکی تھی۔ اور جب وہ آئے تو انھیں ناچار مخالف
گروہ کے ساتھ ہونا پڑا۔" (۲۸)

جواہر لال نہرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی کو مجبوراً کسی گروہ کے ساتھ ہونا پڑا تھا۔ اس لئے کہ حالات بالکل بدل چکے تھے۔ نہرو جی کے جملوں میں کتنی حسرت ہے۔ ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

"اپنے زمانہ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے دور
ہونے لگے۔ یا کانگریس ان سے دور ہونے لگی۔ یہ صورت بہت آہستہ
آہستہ واقع ہوئی۔ اس کے بعد بھی وہ کئی سال تک کانگریس اور آل
انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شریک ہوئے۔ اور زور شور سے
حصہ لیتے رہے۔" (۲۹)

خلافت کا ریزولیوشن ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے اجلاس میں ہی پاس ہوا تھا۔ اور یہ طے کیا گیا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات و خیالات کا اظہار کرنے کے لئے ایک وفد لندن جائے۔ لندن میں صلح کانفرنس ہونے والی تھی۔ جس میں جزیرۃ العرب اور ترکی کے بارے میں طے کیا جانا تھا۔ خیال تھا کہ جرمنی کے ساتھ ترکی کو بھی شکست ہو گی اور ترکی کی شکست کے بعد اس کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ ترکی کا امپائر خلیفہ کہلاتا تھا اور اس کے تحت جزیرۃ العرب کے علاقے اور بعض دیگر مسلم علاقے بھی آتے تھے۔ ترکی کی شکست کے بعد جزیرۃ العرب کے تمام علاقے اس سے نکل جاتے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی مرکزی حیثیت اور قوت کے قیام کو نقصان پہنچتا دنیا کی نظر میں جو ان کی سیاسی حیثیت تھی وہ ختم ہو جاتی۔ اس کے علاوہ اگر انگریزی خیال یا تہذیب و تمدن اور ان کی لابی (Lobby) کا کوئی شخص ترکی کا سربراہ بنا دیا جاتا تو انگریز کی قوت اور بڑھتی۔ اور اس طرح انگریز کے پیر ہندوستان میں اور مضبوطی سے جم

جاتے۔ علی برادران اور ان کے رفقاء کار نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ باور کرلیا کہ ترکی کا امپائر چونکہ خلیفۃ المسلمین ہے۔ حجازِ مقدسہ اس کے زیرِ نگرانی ہے۔ اور ان علاقوں پر غیر اللہ کی حکومت نہیں ہو سکتی۔ یہ رسول اللہ کا صریح حکم ہے۔ مولانا محمد علی کا نظریہ بھی یہی تھا انگریز اور فرانسیسیوں کے قبضے میں اسلامی حکومتوں کے علاقے پہنچ چکے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد ترکی کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی۔ قسطنطنیہ اور تھریسر اور سمرنا پر یونانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ بیت المقدس اور عراق پر صلیبی پرچم لہرا رہا تھا۔ شام پر فرانس کا قبضہ تھا۔ اس وقت امرتسر میں مولانا محمد علی نے ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو اپنی تقریر میں کہا تھا

> توحید کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے، اس کی غلامی کی جائے اس کے گھر کی حفاظت کی جائے۔ شعائرِ اسلام کی نگہداشت کی جائے۔ یہ ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ میری نظر میں اپنی ماں اور بیوی کی حرمت سے اس کی عزت زیادہ ہے۔ میں جان اور متاع اس پر نثار کرنے کو تیار ہوں۔"(۳۰)

ابوالکلام آزاد نے 'اتحادِ اسلامی' کے عنوان کے تحت تقریر کرتے ہوئے ۷ ار اکتوبر ۱۹۱۴ء میں کلکتہ میں کہا تھا

> "خواہ مصری ہو' خواہ نائجیر یا کا وحشی ہو، خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک لیکن اگر وہ مسلم ہے تو وہ ایک خاندانِ توحید کا عضو ہے۔"(۳۱)

اس سے قبل خدامِ کعبہ انجمن (۳۲) بنائی گئی تھی۔ جس کا مقصد حرم پاک کی خدمت تھا۔ اور مسلمانانِ کے دیگر مسائل بھی یہ انجمن حل کرتی۔ خلیفہ کے ختم ہوتے ہی مقدس مقامات پر دوسروں کی حکومت ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے ہر مسلمان کے دل میں انگریز سے ایک نفرت کی لہر دوڑنے لگی۔

اور مسلمان خلافت کے نام پر متحد ہونے لگا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خلافت تحریک میں بہت سے وہ ممبران بھی شامل تھے جو خدام کعبہ انجمن کے ممبر تھے۔ مولانا کا نظریہ تھا کہ ظالم اور جابر حکومت میں رہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یزید کی حکومت میں رہے۔ اس لئے کوئی مسلمان یزید سے تعاون نہیں کر سکتا۔ اور مسلمانوں میں انگریز سے حقارت و نفرت کے ساتھ اس کی ہر چیز سے ایک لاتعلقی کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ اور یہ جذبہ عدم تعاون تحریک کی بنیاد بنا۔ گویا غیر شعوری طور پر مسلمانوں کے ذہن اور دل و دماغ میں عدم تعاون پیدا ہو چکا تھا مولانا محمد علی کا کہنا تھا کہ انسان صرف اللہ کی غلامی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ وہ جمہوریت پسند واقع ہوئے تھے۔ ان کے تصورات میں شاہوں کا وجود نہیں تھا۔ اس زمانے میں گھر گھر چرخہ کاتا جاتا اور عورتیں چرخہ کاتتے ہوئے گایا کرتی تھیں۔ "بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو ساتھ ہیں تمہارے شوکت علی بھی جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔"

خلافت وفد مولانا محمد علی بائیں سے چوتھی نشست پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ (بشکریہ اسلامک وِنڈرس بیورو)

خلافت وفد

۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء میں علی برادران رہا ہو کر سیدھے امر تسر پہنچے تھے۔ علی برادران کو کانگریس کا ڈیلی گیٹ بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد قومی تحریک میں جوش و عمل اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ جواہر لعل نہرو نے لکھا ہے

"علی برادران اس زمانہ میں نظر بندی سے رہا ہو کر کانگریس کی شرکت کے لئے امر تسر پہنچے تھے۔ اب قومی تحریک نے ایک نئی صورت اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔" (۴۳)

امر تسر میں ہی خلافت کا ریزولیوشن (Resolution) پاس ہوا۔ اور یہ طے کیا گیا کہ ایک وفد ہندستان سے یورپ جائے۔ اس لئے کہ لندن کی صلح کانفرنس میں ترکی اور جزیرۃ العرب کا فیصلہ ہونا تھا۔ ترکی کی شکست سے اس کے حصے بخرے ہونے کا امکان تھا۔ ہندوستانیوں کے جذبات اتحادیوں اور انگریزوں کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے۔ صباح الدین عبدالرحمن نے لکھا ہے۔

"مولانا محمد علی نے ایک ہندو مسلم لیڈروں کا مشترکہ وفد ترتیب دیا۔ جو اس وقت کے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ سے ملا۔ اور ہندوستان کی مسلم رعایا کے جذبات سے مطلع کیا۔ اس وفد میں گاندھی جی اور پنڈت موتی لال بھی شامل تھے۔" (۴۴)

(گاندھی جی اور موتی لال نہرو ہندوستان میں وفد کے ہمراہ لارڈ سے ملے تھے۔)

یہ وفد یکم فروری ۱۹۲۰ء کو روانہ ہوا۔ اس وفد کا بنیادی مقصد خلافتِ ترکیہ کو بحال رکھنے کے لئے ہندستانیوں کے جذبات کی ترجمانی اور ہندوستان میں ہندوستانیوں کو ان کے

جمہوری حقوق اور آزادی کی مانگ کرتا تھی۔ یہ وفد ہندوستانیوں کے جذبات کی ترجمانی کر کے ہندوستانیوں کے لئے صحیح فیصلہ کرانا چاہتا تھا۔ ہندوستان سے روانگی کے وقت اس وفد کے ساتھ لوک مانیہ تلک، گاندھی جی اور موتی لال نہرو کی نیک خواہشات تھیں۔ وفد کے ہمراہ یہ حضرات نہیں گئے تھے۔ اس وفد کے صدر مولانا محمد علی تھے، سیکریٹری حسن محمد حیات اراکین میں سید حسین اور سید سلیمان (۳) ندوی شامل تھے۔ مسٹر مانٹیگو اپنی علالت کی وجہ سے وفد سے نہیں مل سکے۔ (۴) لیکن ان کی جانب سے جے۔ اے فشک۔ برگ، ایس کے براؤن ملے۔ مولانا محمد علی کا کہنا تھا کہ خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ اسکی سلطنت بحری، سیاسی اقتصادی اور صنعتی اعتبار سے مستحکم ہو۔ محمد علی نے یوروپ میں اپنی تقریر میں کہا

> "یوروپ کے جغرافیہ دانوں کے لئے عرب محض ایک جزیرہ نما ہے۔
> جو چاروں طرف سے زمین سے گھرا ہوا ہے۔
> لیکن مسلمانوں کے لئے یہ ایک ایسا جزیرہ ہے جس کی سرحد دجلہ اور فرات سے ملتی ہے۔ اس میں حجاز، یمن اور عرب کے صوبوں کے علاوہ شام فلسطین اور ملحق علاقے بھی شامل ہیں۔ یہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح حکم ہے کہ ان علاقوں میں غیر مسلموں کا تسلط نہ ہو۔
> یہ خیال کیا جارہا ہے کہ امریکہ فرانس برطانیہ کے عیسائیوں کو ان علاقوں کا اقتدار سپرد کردیا جائے۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے ہم ہندوستان کی حکومت پھر برطانیہ کی حکومت پر یہ واضح کردیں کہ کوئی مسلمان اس کے لئے رضامند نہیں ہوگا۔" (۳۵)

انھوں نے کہا:

> "ایک ایسا ادارہ جو مذہبی اور دنیاوی دونوں ہو اس کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔۔۔ ہمارا خیال ہے کہ بلقان کی جنگ کے بعد خلیفہ کے

اقتدار کو اتنا کم کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکتا اور
نہ مؤثر طریقہ دین کا حامی بن سکتا ہے۔ اسلئے ہم اسے پہلی جیسی
پوزیشن پر دیکھنا چاہتے ہیں۔"(۳۶)

"ہم لوگوں کو اس کا احساس ہے کہ اتحادیوں اور ان کی حکومتوں کی رعایا
کا یہ فرض ہے کہ وہ ان سے وفاداری کا ثبوت دیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے
کہ خلیفہ کی جانب سے اپنے پر عائد فرائض کو ہم بھول جائیں۔ ترکوں
کے خلاف یوروپ میں جو بھی پروپیگنڈہ ہے اسکی بنیاد اس خواہش پر
ہے کہ علاقہ عثمانی کو ہضم کر لیا جائے۔"(۳۷)

مولانا نے بے انتہائی مدلل تقریر کی (تقریر میں انگریزی سے ترجمہ) بعض جملے جنہیں انگریز پرست افراد نے دھمکی سے گردانہ تھا مولانا کی صاف گوئی اور نڈرپن کو ظاہر کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا

"ترکوں کے ساتھ سمجھوتا کرنے میں مسلمانوں کے جذبات کا احترام
نہیں کیا گیا تو معاملہ بہت زیادہ بگڑ جائے گا۔"(۳۸)

سید حسین نے بھی اپنی تقریر میں تقریباً وہی باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ "خلافت کے مسئلے میں گاندھی جی نے علما سے جرح کر کے خود کو مطمئن کیا تھا۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندو مسلمانوں کا ساتھ اس لئے دیں کہ اگر کبھی ان پر وقت پڑے تو وہ ہندوؤں کا ساتھ دیں۔ مولانا محمد علی نے پیرس میں ۲۰؍اپریل ۱۹۲۰ء کو اپنی تقریر میں کہا

"ہم جو آپ کے سامنے حاضر ہوئے ہیں۔ ترکوں کے معاملے کو پیش
نہیں کرتے ہیں۔ ہم صرف مسلمان اور ان ہمدردان ملک کا مسئلہ پیش
کرتے ہیں۔ جو اس مسئلے میں مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ ہمارا قضیہ یہ
ہے ہم آپ سے صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ آپ ہمارے لئے صرف
ایک چیز چھوڑ دیں۔ اور وہ ایک چیز وہ ہے جو تمام ذرائع سے زیادہ عزیز

ہے۔ یعنی ہمارے ضمیر کی آواز "(چیمبرز) ہم فرانس والوں کے پاس اس لئے آئے ہیں کہ آپ ہمیں بچائیں اور ہمارا روحانی تقدس قائم رکھنے کے لئے ہماری مدد کریں۔"(چیمبرز)(۳۸)

انھوں نے کہا

"میں پہلے عرض کر چکا ہوں جو چیز ہمیں یہاں لائی ہے وہ ترکی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ملک ہندوستان، الجیریا اور ٹیونس کا مسئلہ نہیں ہے وہ بتائے خلافت کا مسئلہ ہے۔ خلافت پرستانِ توحید کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔"(۳۹)

مولانا کا کہنا تھا کہ اسلام کے تین بڑے مقام مکہ، مدینہ اور بیت المقدس کے علاوہ نجفِ اشرف، کاظمین، کربلائے معلیٰ شریفین اور بغداد متبرک مقام ہیں۔ خلیفہ کے تحت رہنا چاہئیں۔ ہمارے یہی عین مطالبات ہیں، خلافت کے ٹکڑے نہ کئے جائیں اور حفاظت دین کے لئے دنیاوی اقتدار حاصل ہو۔ عرب میں اسلامی تصرف حاصل ہو۔ اور کوئی نگراں یا اعلیٰ محافظ نہ ہو۔ خلیفہ جس طرح اب تک کیلی بردار رہے ہیں رہیں۔" اور ہندوستانی قوم کو آزادی ملے۔

وفد وزیر اعظم انگلستان لارڈ جارج سے بھی ملا وفد میں محمد علی، سید حسین، مولانا سید سلیمان ندوی، محمد حیات اور اے ایل فشر کے علاوہ سر فریڈرک ولیم ڈیوٹ بھی شامل تھے۔ لارڈ جارج اس وقت یوروپ میں ایک ہیرو کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ اس لئے کہ جنگِ عظیم میں انھوں نے جنگ کا بہترین نقشہ ترتیب دیا تھا۔

اس جنگ سے ترکی کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ اصل میں مسلمانوں کی قوت کو تقسیم کرنا تھا۔ انگریز قوم امپائر تھی اور اسکی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی مرکزی حیثیت کو ختم کرنے کی غرض سے شام، عرب، عراق، مصر، یمن، آرمینا، تھریس، ملیشیا کے نام پر جمہوریت کا نعرہ بلند کیا گیا۔ جبکہ انگریز کی حکومت ہندوستان

میں جمہوریت کا نعرہ لگانا سخت جرم تھا۔ چرچل کا کہنا تھا کہ یہ جنگ ترکوں کے خلاف صلیبی جنگ ہے۔ ترک اعداد و شمار کی بنیاد پر ثابت کرتے تھے کہ تھریس میں ان کی (ترکوں کی) اکثریت ہے۔ آرمینیوں کو کافی نقصان پہنچا تھا۔ ترکوں پر ان کے قتل کا الزام لگایا گیا اخبارات نے ترکوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا شروع کیا۔ ترکوں کی جانب سے ان کی تردید کی جاتی تو اخبارات شائع نہ کرتے تھے۔ حکومتِ برطانیہ نے یہ طے کیا کہ ترکوں کے خلاف جھوٹے الزامات لگا کر اُن کا پروپیگنڈہ کیا جائے۔ اور یہ پروپیگنڈا اتنا زیادہ ہو کہ سچ مانا جائے۔ اور یوروپ کے اخبارات نے ایسا ہی کیا۔ ان حالات میں وفد لارڈ جارج سے ملا تھا۔ اور مولانا محمد علی نے انتہائی جرئتمندانہ لہجے میں تقریریں کیں تھیں۔

محمد علی نے انگلستان میں اپنی تقریر میں کہا کہ ہم لوگ یہاں پر ایک مذہبی مسئلہ لے کر آئے ہیں۔۔۔ ہم لوگوں کے نزدیک مذہب محض مراسم یا عقائد کے مجموعہ کا نام نہیں ہے۔ یہ پوری زندگی کا اخلاقی اور معاشرتی نظام ہے۔۔۔ اسلام میں لسانی، جغرافیائی اور سیاسی حدود ایسے نہیں ہیں جو انسانوں کے میل ملاپ اور ہمدردی میں رکاوٹ بن جائیں اسلام زندگی کو قومی National نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے مافوق القومی Super National طریقے سے دیکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام کے دو مرکز رہے ہیں ایک تو ذاتی اور دوسرا مکانی۔ ذاتی مرکز کا تعلق خلیفہ سے ہے۔ جو کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین سمجھا جاتا ہے۔۔۔ مکانی مرکز جزیرۃ العرب ہے جو پیغمبروں کی سرزمین بھی ہے۔ بلقان کی جنگ کے بعد خلیفہ کی سلطنت اتنی محدود ہو کر رہ گئی ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ خلیفہ کے پاس جو باقی رہ گیا ہے باقی رہنے دیا جائے۔۔۔ ترکی کے وقار کو برقرار رکھا جائے۔

مولانا محمد علی چاہتے تھے کہ خلیفہ کے پاس جو بھی علاقہ باقی ہے کم از کم اتنا ہی رہنے دیا جائے لیکن اسکی بحری، بری و فوجی طاقت کو قائم رکھا جائے۔ لیکن لارڈ جارج نے ایک نہیں مانی لارڈ جارج ترکی کے حصوں کی تقسیم کی ذمہ داری روس پر ڈالنا چاہتے تھے۔ لائڈ جارج نے مختلف

اوقات میں مختلف بیانات دیئے۔ جو آپس میں اختلافی تھے۔ لارڈ جارج کی غداریوں کی ہندستانی پریس نے خوب مذمت کی۔

یوروپ میں خلافت وفد کے لئے ایک جلسہ ۲۲ر مارچ ۱۹۲۰ء کو ایکس ہال میں اینگلو روتا من سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ہوا۔ جس میں مارڈیوک پکتھال، لیڈیز ، آرنلڈ جانسٹن، بی۔جی۔ہارنی ایڈیٹر بمبئی کرانیکل۔ جے۔ایم۔ پارکر (برٹش کمیٹی آف انڈین نیشنل کانگریس) ایم۔ٹی۔ قادر بھائی (انجمن ضیاالاسلام' بمبئی) مسز سروجنی نائیڈو، اور مولانا محمد علی تھے۔ جلسہ مارڈیوک پکتھال کی صدارت میں ہوا وہ اینگلو اوٹا من سوسائٹی کے صدر تھے۔

اس وفد کو کیمبرج مسلم ایسوسی ایشن Association کی جانب سے ایک عشائیہ بھی دیا گیا۔ اور ایک جلسہ بھی کیا گیا۔ یہ وفد ایڈنبرا اور آکسفورڈ بھی گیا اور وہاں پر جلسوں کو مخاطب کر کے ہندستانیوں کے مسائل کو محمد علی نے وہاں کے عوام کے سامنے رکھا۔ مانچسٹر Manchester میں بھی بی۔جی ہارنی کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا۔ ۴۰

مولانا نے ایکس ہال کے جلسے سے پہلے امریکہ کو بھی تار کے ذریعے ہندوستانیوں کے جذبات سے آگاہ کیا تھا۔ کیونکہ جنگ میں وہ اتحادیوں کا حامی تھا۔ فرانس میں بھی جلسہ ہوا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے عربی میں تقریر کی تھی جس کا ترجمہ ٹیونس کے ایک مسلم مترجم نے کیا تھا۔

۱۴ر مارچ ۱۹۲۰ء کو اس وفد کا خیر مقدم موسیو پرتلی نے کیا جو فرانس کے وزیرِ خارجہ کے عہدہ پر فائز تھے۔ ایک دوسرے جلسے میں یہاں پر شام کے مشاہیر، ٹیونس چین، مصر اور روس کے نمائندہ بھی شامل تھے۔ ان جلسوں میں مولانا محمد علی نے انگریزی میں تقاریر کیں۔ ان جلسوں میں ایک قرارداد کے ذریعہ وفد کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔

یہ وفد انگلستان میں ہی تھا کہ سپریم کونسل نے صلح نامہ پر دستخط کر دیئے۔ اس صلح نامہ کی روسے ترکی کی طاقت کو کم کر دیا گیا تھا۔ بعض دفعات اس طرح تھیں

"ترکی کو مصر، سوڈان اور سائپرس سے اپنے حق سے دست بردار ہونا

ہو گا۔ ترکی کو مراکش اور ٹیونس پر فرانسیسی محافظت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ ترکی کو اپنی بحری، بری اور ہوائی طاقت کو کم سے کم کرنا ہو گا۔ سلطان کے محافظ دستے سات سو ہوں گے۔ اندرونی امن اور اقلیتوں کو محفوظ کرنے کی خاطر پچاس ہزار لشکری رکھے جاسکتے ہیں۔ ترکی کے بحری بیڑے جو جنگ میں پکڑے گئے وہ ضبط کر لئے جائیں۔ ترکی کو بحری، بری اور ہوائی فوجوں کو رکھنے کی اجازت نہ ہو گی۔

ترکی کے خزانے پر بھی نگرانی رکھی جائے گی جب تک کہ یہ اطمینان نہ ہو کہ اس نے بین الاقوامی ذمہ داریاں پوری کیں۔

ترکی امپائر کی طاقت کو ختم کر کے مسلمانوں کی قوت کو ختم کر دیا گیا۔" (۴۰)

یونان، برطانیہ اور فرانس ممالک ترکی کو ختم کرنے کے درپہ آمادہ تھے۔ شام فرانس کی نگرانی میں، عراق اور فلسطین برطانیہ کی نگرانی میں آگیا۔ حجاز کو آزاد ریاست تسلیم کیا گیا لیکن اس طرح کہ ایک طویل عرصہ تک انگریز کے ہاتھ کا کھلونا بنی رہی۔

صلحنامہ کی شرائط کو لارڈ چیمسفورڈ Lord Chemsford ہندوستانی وائسرائے نے اخبارات میں اس پریس نوٹ کے ساتھ شائع کرایا کہ 'کونسل نے بڑے غور و خوص اور احتیاط کے ساتھ فیصلے کئے ہیں'۔ بعض باتیں مسلمانوں کے لئے تکلیف دہ ہوں گی۔۔۔ برطانوی امپائر کے آڑے وقت مسلمان بہت کام آئے۔ انھوں نے بادشاہ سلامت کی آواز پر تعاون کیا۔۔۔ یقین ہے ترکی پھر سے ابھر کر اسلام کا ستون بن جائے گا۔

اب برطانوی امپائر ایک مضبوط بنیاد پر نئے اصولوں کے ساتھ قائم ہو چکا ہے۔ اس کے اندر ہندوستان کے مسلمان اپنی سیاسی ترقی اور مادی خوشحالی کے لئے پورے کوشاں ہو سکتے ہیں۔ جنگ عظیم سے پہلے ترکی برطانیہ کا دوست تھا۔ اس صلحنامہ کے ذریعہ یہ رشتہ پھر جلد قائم ہو جائے گا۔ اور یقین ہے کہ ترکی پھر سے اسلام کا ستون بن جائے گا۔ اور یہی

امید ہے کہ یہی خیال مسلمانوں کو صلحنامہ کے شرائط بہت صبر اور تحمل کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ کرے گا۔ اور وہ برطانیہ کے تاج کے وفادار رعایا بنکر رہیں گے۔

انگریز کے عمل اور چیمسفورڈ کے اس بیان کے بعد ہندوستانی مسلمانوں میں انگریز سے نفرت کی لہر اور بھی تیز ہو گئی۔ ہندوستانی انگریز کی عیارانہ چالوں سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا حسرت موہانی ڈاکٹر کچلو، میاں محمد چھوٹانی، مولانا شوکت علی کے دستخطوں سے اس کا جواب تحریر کیا گیا۔ اور اس میں لکھا گیا کہ ترکی کے ساتھ نا انصافی ہوئی ہے۔ اور مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ وفد انگلستان میں ہی تھا کہ مولانا شوکت علی اور دیگر مسلم رہنماؤں نے عدم تعاون تحریک چلانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور اس سلسلے میں گاندھی جی نے ۲۲ر جون ۱۹۲۰ء کو لارڈ چیمسفورڈ کو ایک خط بھی تحریر کیا تھا۔ اور اس میں یہ لکھا کہ صلحنامہ میں ترمیم ضروری ہے۔ ورنہ عدمِ تعاون تحریک میں ہندوؤں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں۔

خلافت کے بارے میں گاندھی جی نے اپنے ایک خط میں تحریر کیا تھا

"مجھ پر آپ کا تھوڑا بہت اعتماد رہا، میں بھی برطانوی امپائر کا فرمانبردار، اور خیر خواہ ہوانے کا دعویٰ کرتا ہوں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ خلافت کے سوال پر اپنی رائے کو ظاہر کر دوں۔ جب جنگ شروع ہوئی میں لندن میں تھا۔ انڈین والنٹیر ئس ایسوسی ایشن کی تنظیم کر رہا تھا۔ اس وقت سے مجھے خلافت کے مسئلے سے دلچسپی ہوئی۔ لندن کے مسلمانوں کو تشویش تھی کہ جنگ میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ جب ۱۹۱۵ء میں ہندوستانی آیا تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی یہی تشویش تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کو جب پوشیدہ صلحاموں کی خبریں معلوم ہوئی تو برطانویں ارادوں کی بے اعتمادی

پیدا ہوئی۔ اس پر مایوسی طاری ہو گئی۔ اس وقت میں اپنے مسلمان
بھائیوں کو مایوس نہ ہونے کی نصیحت کی۔ مسلمانوں کے رہنماؤں نے
مسلمانوں کو تشدد کے طریقے نہ اپنانے پر قائم رکھا۔ صلح کی شرائط ان
کے خلاف ہیں جو برطانوی وزراء نے مسلمانوں سے کئے تھے۔ میں
ایک پکے ہندو کی حیثیت سے اپنے مسلمان ہموطنوں کے ساتھ پوری
دوستی کا حق ادا کرنا چاہتا ہوں۔

میں بھارت کا نالائق سپوت ہونگا اگر ان مسلمانوں کی آزمائش کے وقت انکا ساتھ نہ دونگا۔ میری حقیر رائے میں وہ حق پر ہیں۔ مسلمان اور ہندوؤں دونوں کو برطانوی انصاف روپے پر اعتماد نہیں میں نے مسلمان دوستوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ آپ کی حکومت کی حمایت نہ کریں۔ ہندوؤں سے بھی یہی کہا ہے کہ وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ مسلمانوں نے جو آپ کے پاس تحریر بھیجی ہے۔ (تحریر بھیجی گئی تھی کہ صلحنامہ کے شرائط میں ترمیم کی جائے۔) اس میں آپ سے درخواست ہے کہ اسکی رہنمائی آپ خود کریں۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو ترکِ موالات کی تحریک بھی لابدی سمجھی جائے۔

بمبئی ۲۲ر جون ۹۲۰ء مجھ کو فخر ہے کہ میں آپکا فرمانبردار خادم ہوں
ام۔ کے۔ گاندھی (۴۱)

گاندھی جی کا جب خط اخبارات میں شائع ہوا تو ہندوؤں میں بھی انگریز کے خلاف نفرت کی لہر تیز ہو گئی۔ تحریکِ خلافت بظاہر ترکی امپائر کی حمایت کے لئے تھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس کا رخ انگریز کی مخالفت کی طرف مڑ گیا اور ہندوستانیوں کے علاوہ اس کا دائرہ اثر دوسرے ممالک میں بھی بڑھتا گیا۔ اس طرح ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں خلافت تحریک کی وجہ سے دنیا کے دوسرے ممالک کی ہمدردیاں شامل ہو گئیں۔

مدن ہون مالویہ جی نے بھی اس تحریک کے سلسلے میں بیان دیا۔
خلافت کے سلسلے میں بابو سمپورنا تھ نے اپنی خود نوشت سوانح میں تحری کیا ہے۔

"مہاتما جی کی قیادت میں کانگریس نے اس کی حمایت کی۔ نتیجہ میں بہت سے مسلمان کانگریس میں آگئے تو بہت سے ہندو خلافت تحریک میں حصہ لینے لگے۔ بابو جی کا خیال ہے کہ یہ اصولاً مسلمانوں تک محدود رہتی تھی۔ مگر حالات نے اسے مشترک کردیا۔ میں بھی مجلسِ شوریٰ بنارس، خلافت کمیٹی کا ممبر بنایا گیا۔ مجھ میں اور ہندوؤں جیسا جوش ولولہ اس سلسلے میں کبھی پیدا نہ ہو سکا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک ادارے کے لئے جس کے لئے کوئی عقلی بنیاد باقی نہیں تھی۔ حمایت کرنے کی کیا تاویل اور توجیہہ ہو۔ میں نے خلافت کمیٹی کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔ آہستہ آہستہ اور ہندو بھی الگ ہونے لگے۔ بلکہ قوم پرست مسلمان بھی۔

ڈاکٹر عابد رضا خاں بیدار نے بابو جی کے بیان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

بابو جی کا یہ بیان ان کی کتاب کے عام دھارے سے کچھ الگ سا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خلافت تحریک بابو جی کے مذہب سے الگ ایک دوسرے مذہب کے ایک مخصوص ادارے کے لئے چل رہی تھی۔ لیکن بابو جی کی قومی تحریک یقیناً کوئی مذہبی تحریک تو نہیں تھی اس کے دو پہلو تھے۔ منفی طور سے تو یہ انگریزوں کا اقتدار کم اور کمزور کرنا اور اثباتی طور سے تحریک آزادی کو مضبوط کرنا بابو جی مہاتما گاندھی کی فراست کو سمجھ نہیں سکے جنھوں نے خلافت تحریک کو محض اس لئے اپنایا تھا جس سے ہندو مسلمان قدم سے قدم ملا کر چلیں گے۔ اور ان کی متحدہ ضرب برطانوی باشندوں کو توڑنے میں زیادہ آسانی سے کامیاب ہوگی۔ بقولِ جواہر لال خلافت کا نقشہ گاؤں گاؤں پھیل گیا تھا۔" (۴۲)

خلافت وفد کی واپسی کے بعد مولانا محمد علی کی مقبولیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ مدن موہن مالویہ اور دیگر ہندو خوب سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان سپاہیوں سے انگریز جھوٹے وعدہ کر کے جنگ میں ان سے اپنی پالیسی کے تحت کام لے لیا کرتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے صلحنامہ میں مسلمانوں کے مذہبی تقدس کا خیال نہیں رکھا تھا۔

مولانا محمد علی کو اس کے بعد انگریز سے اس قدر شدت کی نفرت ہوگئی کہ وہ تمام ایسے ادارے جو حکومت کی مدد سے چلتے تھے۔ ان کی امداد کو حکومت سے لینا پسند نہیں کرتے

تھے۔ علی برادران نے گاندھی جی کو اپنے ہمراہ لیا۔ اور پورے ہندستان کے دورے کرنا شروع کئے۔ بہت سے وکلا نے پریکٹس چھوڑدی، بہت سے ملازمین نے ملازمتیں ترک کردیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ تحریکِ خلافت اور تحریک عدم تعاون ایک دوسرے میں ضم ہو چلی تھیں تو غیر ذمہ دارانہ بات نہ ہوگی۔

یہ بات با آوازِ دہل کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستانی مسلمان کو خلافتِ ترکی کے نام پر متحد کیا گیا تھا۔ ہندوستانی مسلمان اپنی تاریخ سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتا تھا۔ دوسرے ترکی کے علاقوں میں یوروپی طاقتیں ترکی کے خلاف سورش کرتیں، حملے کرتیں، اور کہیں کہیں خلافتِ ترکی سے، ان کے علاقوں کو نکالنے کے لئے سازشیں کرتی تھیں۔ یوروپ ہندوستانیوں کا بھی دشمن تھا۔ اس لئے محمد علی نے دشمن کے اس مخالف کی مدد کرنا شروع کی۔ جس سے یوروپ کی طاقت نہ بڑھ سکے۔ اگر ترکی میں یوروپی طاقتوں کو کامیابی ملتی تو ہندوستان میں اس کے قدم مضبوط ہوجاتے۔ اور ممکن تھا کہ آزادی کی منزل ہم سے دور ہوجاتی۔

مولانا محمد علی انگریز سے کسی مسئلے میں بھی تعاون کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی ان کی درس گاہِ علمی تھی۔ انھیں سرسید اور علی گڑھ سے عقیدت تھی۔ لیکن انگریزی حکومت کی جانب سے اسے امداد ملتی تھی۔ اس لئے انھوں نے ایک درس گاہ محمود الحسن اور حکیم اجمل خاں کی تائید و تعاون سے قائم کی۔ جو جامعہ ملیہ کہلائی۔

۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اس کے لئے مولانا شوکت علی کے کہنے پر مسودہ گاندھی جی نے ریل میں مرتب کیا تھا۔ (۱۵) لیکن خلافت کانفرنس میں ترکِ موالات کی تجویز منظور ہو چکی تھی۔ جواہر لال نہرو نے لکھا ہے

> "۱۹۲۰ء میں سیاسی تحریک اور خلافت کی تحریک نے ساتھ ساتھ قوت پکڑی۔ دونوں ایک ہی راستے پر چلنے لگیں۔ آخر جب کانگریس نے گاندھی جی کا ترکِ موالات کا پرامن اصول تسلیم کرلیا۔ تو دونوں

بالکل مل گئیں۔ خلافت کمیٹی پہلے ہی یہ اصول تسلیم کر چکی تھی۔"(۴۳)

آزاد نے اپنی تقریر میں ۲۵ راگست ۱۹۲۱ء میں مجلس خلافت کے جلسے کے صدر کی حیثیت سے اپنی تقریر میں کہا۔

خلافت کمیٹی نے احکام شرع کے ماتحت فیصلہ کیا کہ ترک معاملات مسلمانوں کے فرائض میں سے ہے۔ آپ کی تحریکِ خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے۔"(۴۴)

گاندھی جی کو محمد علی اور شوکت علی نے اپنے ہمراہ لے کر ہندوستانی کے دورے شروع کئے۔ ہندوستانی انگریز سے پہلے سے ناراض تھے۔ ان کی آواز پر وکلا نے پریکٹس ترک کر دی، ملازموں نے ملازمتیں چھوڑ دیں۔ یوروپ کے کپڑے پہنا ترک کر دئے۔

صباح الدین عبدالرحمن نے لکھا ہے

"کانگریس کی تنظیم پرانی ضرور تھی۔ لیکن علی برادران نے خلافت کمیٹی کی تنظیم عوامی پیانے پر اس زبردست طریقے پر کی کہ کانگریس کی تنظیم اس وقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔"(۴۵)

علی برادران کو جو مقبولیت اس وقت حاصل تھی وہ اور کسی لیڈر کو نہیں تھی۔ مولانا محمد علی کا کمال یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں کو انھوں نے شیر و شکر کر دیا تھا۔ اور پوری ہندوستانی قوم ایک لاوے کی طرح امیر غریب، اعلیٰ اور ادنیٰ سارے سماجی بندھنوں کو توڑ کر ایک قوم ہو چکی تھی۔ اور محمد علی کا کہنا بھی یہی تھا کہ ملت قومیت کے منافی نہیں۔ اور خدا نے کان الناس اُمتہ واحدۃ۔ کا جو حکم دیا ہے محمد علی نے اس کی اپنی زندگی میں عملی تصویر پیش کر دی۔

خلافت کی وجہ سے یوروپ کی عوام کو بھی ہندوستانیوں کے جذبات کا احساس ہوا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ میکڈونلڈ نے ایک نو آبادی کے اضافے کا اعلان کیا تھا۔ جس کی عملی شکل ۱۹۴۷ء میں ہمیں دیکھنے کو ملی۔ میکڈونلڈ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا تھا۔

"مجھے امید ہے کہ چند سال نہیں بلکہ چند ماہ میں ہماری سلطنت میں ایک اور نو آبادی کا اضافہ ہوگا۔ وہ نو آبادی ایک دوسری نسل کی ہوگی۔ اور وہ اس سلطنت میں مساوی درجہ پر شامل ہو کر اپنے عزتِ نفس کو برقرار رکھے گی۔ میری مراد اس نو آبادی سے ہندوستان ہے۔"

مولانا محمد علی اسلام اور ہندوستان کے لئے زندگی بھر کام کرتے رہے۔ مولانا کی صحت روز بروز گرتی جارہی تھی۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے انھیں ان کے دوستوں اور اطبانے منع کیا۔ صحت اس قابل نہیں تھی کہ وہ کوئی لمبا سفر کر سکیں۔ لیکن وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے لندن چلے گئے۔ کانفرنس انگلستان اور ہندوستان کے درمیان ایک باعزت سمجھوتے کے لئے کی گئی تھی۔ مولانا کا کہنا تھا کہ ایک سپاہی کا فرض منصبی ہے۔ کہ جب اس کا ملک خطرے میں ہو تو اپنی جان کی پرواہ نہ کرے اور اس کے تحفظ کے لئے ہر ممکن کوشش کرے۔ محمد علی کا کہنا تھا کہ میں اپنی ساری زندگی کام کے لئے زندہ رہا اور اس وقت کام سے منھ موڑنا ایسا ہی ہے جیسا کہ بزدل کرتے ہیں۔

محمد علی کو یقین تھا کہ وائسرائے ہند لارڈ ارون ہندوستانیوں کے مسائل کو اپنے وعدہ کے مطابق اچھوت جماعت، لبرل جماعت، ہندستانی شہزادگان اور مسلم اقلیت (ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت) کی تائید میں محمد علی کے ہمراہ اپنی آواز بلند کریں گے۔ اور ہندستانی مسائل کو یوروپی حکمرانوں کے سامنے پرزور الفاظ میں پیش کریں گے۔ ویسے بار بار کے تجربہ نے مولانا پر یہ واضح کر دیا تھا کہ برطانوی حکومت 'اتحادِ عمل' کے لئے کوئی ایسا پہلو قبول نہیں کرے گی جس سے ہندوستانیوں کو اپنی حکومت قائم کرنے اور آزادی کا موقع ملے۔

مولانا نے اہل وطن کے سامنے ایک ایسا طریقۂ انتخاب پیش کیا جو فرقہ وارانہ ذہنیت کو نہیں ابھرنے دیتا۔ یہ مخلوط انتخاب کا

طریقہ تھا۔ جس کے لئے ہر ہندو کو مسلمان کے پاس اور ہر مسلمان کو ہندو کے پاس، اپنے انتخاب کے لئے جانا پڑتا۔ اور اپنی قوم کے ساتھ، دوسری قوم کے ووٹ بھی کم از کم ۵ فی صد لانا پڑتے جب وہ کامیاب سمجھا جاتا، اس سے فرقہ پرستی کے خاتمے کے ساتھ باہمی میل جول اور روابط بھی مزید بڑھتے۔ انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک بار پھر ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کو پورے زور و قوت کے ساتھ برطانوی حکمرانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ اور ان پر یہ بھی واضح کردیا جائے کہ تحریکِ خلافت، اور دوسری تحریکوں کی وجہ سے جن کا رخ ہندوستان کی آزادی کی جانب مڑ گیا تھا اور اس سے عوام کا ذہن اس طرح تعمیر ہو چکا تھا کہ وہ "آزادی" سے کم کی بات پر راضی ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ کیفیت برطانوی سامراج کے لئے سامنے رکھ دی جائے۔ ان کے ذہن پر اس قدر غیر معمولی زور پڑا کہ ان کے دماغ میں خون بہنے لگا، فالج کا اثر ہوا۔

کراچی جیل کی لاری میں بیٹھتے ہوئے مولانا محمد علی

مقدمہ کراچی

۱۹۲۱ء میں فوج میں بغاوت پھیلانے کے الزام میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولوی حسین احمد دیو بندی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو امرتسری، پیر غلام مجدد مٹیاروی، مولوی نثار احمد کانپوری، بھارتیہ کرشنا تیر تھ جی عرف ونکٹ رام پر ایک مقدمہ چلایا گیا تھا، یہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں مقدمہ کراچی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ ۸ر، ۹ر اور ۱۰ر جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ (۴۶) ۸ر جولائی کو کانفرنس کا سیشن پانچ بجے سہ پہر شروع ہوا۔ اس سیشن میں مولانا محمد علی صدر تھے۔ صدر نے اعلان کیا کہ اب سبجیکٹ کمیٹی (مجلس مضامین) کا انتخاب ہوگا۔ ہر صوبے سے پانچ ممبران لئے جائیں گے اور صوبۂ سندھ اور بمبئی سے دس ممبر لئے جائیں گے (۴۷)۔ ۹ر جولائی کے جلسے میں حسین احمد (شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم کے محبِ صادق) نے ایک ریزولیوشن پیش کیا۔ جلسے میں تقریباً دو ہزار افراد تھے۔ ان میں ہندو، مسلم، سکھ، پٹھان، یعنی مختلف اقوام کے افراد شامل تھے۔ بحیثیت صدر مولانا محمد علی نے ریزولیوشن نمبر ۶ کو باآواز بلند پڑھ کر سنایا۔

ریزولیوشن نمبر ۶

> "آل انڈیا خلافت کانفرنس کا یہ جلسہ غازی مصطفیٰ کمال پاشا اور حکومتِ انگورہ کا تہہ دل سے ان کی شاندار فتوحات اور بقائے حکومتِ اسلامیہ کے لئے سرفروشانہ کوششوں کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہے۔ اور رب العزت کی بارگاہ میں دعا کرتا ہے کہ وہ جلد سے جلد غیر حکومتوں کی تمام افواج کو سلطنتِ ترکی کے ہر گوشے سے خارج کر دینے میں

کامیاب ہوں۔ اس کے ساتھ یہ جلسہ اس امر کا صاف اعلان کرتا ہے
کہ ہر مسلمان پر انگریزی فوج میں اس وقت نوکری کرنا، نوکر رہنا،
بھرتی ہونا یا اس میں دوسروں کا بھرتی کرانا شرعاً قطعی حرام ہے۔ اور
مسلمانوں کا بالعموم اور علماء کا بالخصوص یہ فرض ہے کہ اس باب میں
شریعت کے احکام، فوج کے مسلمانوں تک پہنچائیں۔ علاوہ ازیں یہ
جلسہ اس امر کا بھی اعلان کرتا ہے کہ اگر انگریزی حکومت، حکومتِ
انگورہ کے خلاف بالواسطہ یا اعلانیہ خفیہ طور پر کوئی جنگی کارروائی
کرے گی۔ تو مسلمانانِ ہندستان مجبور ہوں گے کہ کانگریس کو اپنی
معیت میں لے کر قانون شکنی یعنی Civil Disobedience
شروع کر دیں۔ اور آئندہ کانگریس کے سالانہ جلسہ میں جو احمد آباد
میں ہونا قرار پایا ہے۔ ہندوستان کی کامل آزادی اور ہندوستان میں
جمہوری حکومت کا اعلان کر دیں۔" (۴۸)

چنانچہ مولانا محمد علی اور ان کے دیگر ساتھیوں پر فوج میں بغاوت پھیلانے کا الزام لگایا گیا۔ کلکتہ سے مدراس جاتے ہوئے۔ مولانا محمد علی اور ان کے دیگر ساتھیوں کو والٹیر اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا کے ہمراہ بیگم محمد علی، مہاتما گاندھی، اور آزاد سجانی تھے۔

گرفتاری کے بعد ان پر مشہور مقدمہ مقدمۂ کراچی ۲۶ر ستمبر ۱۹۲۱ء سے خالق دینا حال کراچی میں مسٹر ایس۔ ایم۔ تلاٹی کی عدالت میں چلایا گیا۔ اس مقدمہ میں ملزمان کی حیثیت سے ا۔ مولانا محمد علی رامپوری، ۲۔ مولوی حسین احمد صاحب دیو بندی، ۳۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ۴۔ پیر غلام مجدد، ۵۔ مولوی نثار احمد صاحب کانپوری، ۶۔ مہاراج سری بھارتی کرشنا تیرتھ جی عرف ونکٹ رام گرو شنکر آچاریہ جی، ۷۔ مولانا شوکت علی۔

مسٹر تلاٹی مجسٹریٹ نے جب ملزمان کے نام اور ولدیت دریافت کرنا شروع کی تو مولانا محمد علی نے کہا کہ وارنٹ میں لکھے ہیں۔ اور گرو شنکر اچاریہ نے کہا کہ "ہم لوگ اپنے

مذہب کی رو سے موجودہ سنیاس کی حالت میں اپنے باپ کا نام نہیں بتا سکتے البتہ گرو کا نام بتا سکتے ہیں۔"

۲۸ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی نے عدالت میں کہا

"میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے گزشتہ خلافت کانفرنس منعقدہ کراچی کی صدارت کی تھی۔ اور میں نے گوکک ضلع بلگام کی کانفرنس کی طرح یہاں بھی وہ قرارداد مرتب کی تھی جو حکومت انگورہ سے خلاف برطانوی جنگی نقل و حرکت کے امکان سے تعلق رکھتی تھی۔۔۔ ہم نے حکومت کو دو باتوں کے متعلق آگاہ کیا اول یہ کہ ہم کانگریس کی معیت میں قانون شکنی کی ابتدا کریں گے اور دوم یہ کہ انڈین نیشنل کانگریس کے آئندہ اجلاس دسمبر میں ہندوستان کی آزادی اور انعقاد جمہوریہ ہند کا اعلان کریں گے۔" (۴۹)

مولانا محمد علی کے اس بیان سے ان کی سیرت کا ایک انتہائی اہم پہلو سامنے آتا ہے کہ عدالت کے خوف سے وہ جھوٹ نہیں بولے۔ اور دوسرے انھوں نے ہندوستان کی آزادی اور ایک جمہوری حکومت بنانے کا اعلان ۱۹۲۱ء کے لئے کر دیا تھا۔

مولانا محمد علی اور ان کے ساتھیوں پر دفعہ ۱۲۰ ب بشمول ۱۳۱ تعزیرات ہند استغاثہ دائر کیا گیا تھا۔ یعنی ملکِ معظم کی فوج کے مسلمان افسروں اور سپاہیوں کو فرائض انجام دہی سے باز رکھنے کی سازش کی تھی۔ اس کے علاوہ علی برادران پر دفعہ ۵۰۵ بشمول ۱۰۹ اور ۱۱۷ تعزیراتِ ہند کے تحت بھی دعوی کیا گیا تھا۔

مولانا کو (محمد علی اور شوکت علی کو) اس مقدمہ میں دو سال کی سزا ہو گئی۔ ان کا بہت مشہور شعر ہے

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

خلافت تحریک کا سب سے بہتر پہلو یہ تھا کہ خلافت کے نام پر مسلمان منظم ہو گیا۔ اور

صلحنامہ ترکی کے بعد جس میں ترکی کے حقوق سلب کردئے گئے تھے۔ مسلمانوں کے دل و دماغ میں انگریز کے خلاف شدید نفرت پیدا ہونے لگی۔ وہ انگریز کی حکومت کو ظالم و جابر اور اسلام دشمن کی حکومت سمجھنے لگا۔ اور اس کے چنگل سے آزادی کو اپنا مذہبی فریضہ تصور کرنے لگا۔ ہندوستان میں دوسری اقوام بھی تھیں۔ اور بلاشک و شائبہ وہ بھی انگریز کی حکومت میں رہنا یا اس سے تعاون کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ لیکن مسلمانوں نے اور بالخصوص محمد علی نے ہندوستان کی آزادی کو اپنا مذہبی فریضہ قرار دیا۔ مسلمان تیزی کے ساتھ کانگریس میں شامل ہونے لگے۔ وہ مسلمان جو مسلم لیگ کے ممبر تھے۔ ان میں سے بہت سے کانگریس کے ممبر بن گئے۔ گرو شنکر اچاریہ، گاندھی جی اور بعض دیگر اہلِ ہنود کی خلافت تحریک میں شرکت سے ہندو مسلم اتحاد کی جو تصویر اس وقت ہندوستان میں ابھر کر آئی تھی اس سے انگریز پر ایک دہشت طاری ہونے لگی۔

سری گرو شنکر اچاریہ اور مسئلہ خلافت

خلافت کے مسئلہ میں وینکٹ رام عرف بھارتی کرشنا تیرتھ جی سری جگت گرو شنکر اچاریہ جی، محمد علی کے ہمنوا تھے۔ ان پر بھی مقدمہ چلایا گیا تھا۔ عدالت میں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے بیان کے بعد سری گرو شنکر اچاریہ جی کے بیان کا نمبر آیا انھوں نے بیٹھے بیٹھے بیان دینا شروع کیا۔ عدالت نے ان سے کہا

مجسٹریٹ کھڑے ہو کر بیان دیجئے۔

شنکر اچاریہ جی (کرسی پر بیٹھے بیٹھے) سوائے اپنے روحانی گرو کے ہم لوگ کسی شخص کے سامنے کھڑے نہیں ہو سکتے ہم جیل خانہ جا سکتے ہیں۔ مصائب برداشت کر سکتے ہیں، لیکن سیاسی کے قوانین کے خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ عدالت کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا ہمارے لئے اس سے آسان ہے کہ ہم مذہبی قوانین کی خلاف ورزی کریں۔

مجسٹریٹ جب تک آپ کھڑے نہیں ہوں گے میں آپ کا بیان نہیں لکھوں گا۔

مولانا محمد علی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے مجسٹریٹ کو مخاطب کر کے کہا

"کیا آپ کسی مذہب کے پابند نہیں ہیں۔ کیا آپ اپنے مذہب کی حفاظت میں وطن کو خیر باد کہہ کر اس ملک میں نہیں آئے۔؟ آج آپ ایک سنیاسی کے مذہب پر دست درازی کرتے ہیں۔ آپ کو شرم آنی چاہئے۔" (۵۰)

دستاویز ثبوت الف ۶ میں سی آئی ڈی نے گرو شنکر اچاریہ جی پر الزام لگایا تھا کہ انھوں نے بھی کراچی میں خلافت کے جلسے میں شریک ہو کر حکومت کی مخالفت کی تھی۔ گرو شنکر اچاریہ جی نے بیان دیتے ہوئے کہا

"میں اس موقع پر اپنی کامل اور عظیم الشان مذہبی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے شاستروں کی رو سے اس بیان کی تائید و تصدیق کرتا ہوں۔۔۔ ہندوؤں کے لئے کاشی کی مثل مکہ بھی متبرک مقام ہے۔ نیز ان کتب میں دنیا کی آخری تباہی کے اسباب و وجوہ کا ذکر کرتے ہوئے نشاندھی کی گئی ہے کہ جب دنیا لامذہب اور کثرت معاصی کے باعث تباہ کردنی و برباد شدنی ہو جائے گی تو صفحۂ ہستی پر مقامِ امن دو ہوں گے۔ مکہ و کاشی۔۔۔ اگر آج میں مکہ کو کاشی کی طرح مقدس نہ سمجھوں تو مجھے (میں) اس منصبِ جلیل پر فائز ہونے کے لائق نہیں۔" (۵۱)

گرو شنکر اچاریہ کے اس بیان سے ہم اُس قومی یکجہتی کا اندازہ کر سکتے ہیں جس کی وجہ سے ہم آزادی کی منزل تک پہنچے۔ وقت بدلا، حالات بدلے، شدھی سنگھٹن اور تنظیم و تبلیغ کی سرگرمیاں تیز ہوئیں۔ اور انگریز نے ہندستانیوں کو آپس میں لڑوانا شروع کر دیا۔ گاندھی جی چورا چوری کے واقعہ کے بعد اپنی تحریک کو واپس لے چکے تھے۔ ہندو، مسلمان، سکھ جیلوں کو بھر چکے تھے۔ تحریک کی واپسی نے ملک میں مایوسی کی فضا کو پیدا کر دیا تھا۔

انگریز بہادر نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہندو مسلم فساد کرانا شروع کر دیئے۔ ہندوستان کا اتحاد پاش پاش ہونے لگا۔ محمد علی نے ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کی۔ مسجد سے سامنے باجا بجاتے ہوئے گذرنا اس وقت بھی ایک اختلافی مسئلہ تھا۔ مولانا نے کوکناڈا کانگرس سے خطبہ میں کہا تھا

"اگر شارع عام سے جلوس لیجایا جاسکتا ہے اور باجانوازی پر کوئی قانونی تحدید نہیں ہے تو پھر ایک مسلمان کو بھی کسی ہندو یا غیر مسلم کی باجا نوازی پر اعتراض نہ ہونا چاہئے۔ تا وقتیکہ یہ چیز مسلمان کے کسی خاص معاملہ اور امتیازی حقوقِ عبادت اور مذہب میں مداخلت نہ کرے۔"(۵۲)

تحریکِ خلافت نے ملک کی آزادی کے لئے مذہب کو بنیاد بنا کر علما سے فتویٰ لئے تھے۔ عدم ترکِ تعاون کے سلسلے میں علما نے سرکاری امداد اور خطابات کو قبول نہ کرنے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ہندو مسلمانوں کے اتحاد اور انگریز کی حکومت کے خلاف فتووں کی وجہ سے انگریزی حکومت کے پیر اکھڑنے لگے تھے۔ لیکن بعض ناعاقبت اندیش افراد نے مذہب کو اس طرح بنیاد بنایا کہ ہندو مسلم کے بیچ ایک کھائی پیدا ہونے لگی۔

مولانا محمد علی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے ہندوستان کی رہنے اور بسنے والی ملتوں کو ایک قوم کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے اور باہمی اتحاد کی انھوں نے ہمیشہ کوشش کی

"مجھے اپنی غلامی کے احساس کا غلبہ دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جس وقت تک ہم تمام ان پارٹیوں کو جو سوراج چاہتی ہیں متحد نہ کرلیں اس وقت تک ہم اپنی زنجیروں کو نہیں توڑ سکتے۔ آپ نے توقع ظاہر کی کہ بمبئی کی کانفرنس میں لیڈران کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔"(۵۳)

شدھی اور سنگھٹن کے سلسلے میں مولانا محمد علی نے تحریر کیا تھا۔

"سنگھٹن کا جواب تنظیم کو نہ ہونا چاہئے۔"(۵۴)

مولانا محمد علی اپنی علالت کے باوجود گول میز کانفرنس میں گئے ء ان کی صحت سفر کے لائق نہ تھی مولانا محمد علی نے انگلستان کے وزیر اعظم کے نام ایک خط بھی تحریر کیا تھا جو تاریخ میں آخری مشورہ(۲) کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا شوکت علی نے گول میز کانفرنس کی شرکت کے سلسلے میں لکھا ہے

"میرا بھائی ہندوستان کے مفاد کی خاطر نڈر اور ان تھک کوششوں کے ساتھ کام کرتا رہا۔۔۔ صحت جسمانی بد سے بدتر ہو چکی تھی۔ دوست و اطبا متنبہ کر رہے تھے کہ ہندوستان کو نہ چھوڑے جبکہ جان خطرہ میں

ہو۔اس نے کسی کی نہ سنی اور انگلستان کو روانہ ہو گیا۔ تاکہ گول میز کانفرنس میں شریک ہو جو ہندوستان وانگلستان اور اس کے شہریوں کے درمیان ایک صحیح اور باعزت سمجھونہ کے لئے منعقد کی گئی تھی۔۔۔ایسی حالت میں جبکہ چند ساتھی برگشتہ ہو گئے ہوں۔ اور ان کا ایک اہم گروہ اس کے مشورے سے انکار کر دے اور اس لائحہ عمل کو قبول نہ کرے جس کو تمام مختلف الآرا مسلمانوں کی ایک زبردست اکثریت نے بالاتفاق منظور کر لیا ہو۔ محمد علی نے کہا میں تمام عمر کام کے لئے زندہ رہا۔ اور اس وقت اپنے آرام و صحت کی خاطر کام سے منہ موڑ لینا ایسا فعلِ مجرمانہ ہوگا جو صرف۔۔۔ بزدلوں کے لئے موزوں ہے۔"(۵۵)

مولانا محمد علی کا وائسرائے ہند لارڈ ارون پر بھروسہ تھا۔ اس لئے انھوں نے طے کیا تھا کہ اچھوت جماعت، لبرل جماعت، شہزادگان، مسلم پبلک کی کثیر جماعت کے مطالبات کے لئے آواز بلند کریں۔ مولانا محمد علی نے مشروط انتخاب کی صورت پیش کی جو دونوں کو پسند ہونا چاہئے تھی۔(۵۶)

مولانا محمد علی کا کہنا تھا کہ 'ہندو مسلم سوال' کا نام اقلیتوں کا سوال رکھنا غلط ہے۔ ہندوستان میں بلا شبہ کچھ اقلیتیں ضرور ہیں۔ اور یقیناً ہم کو ان کے لئے ایسا انتظام کرنا چاہئے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ آئندہ حکومت ہند ایک یا دو اقوام کی حکومت نہ ہوگی۔ بلکہ تمام ہندوستانیوں کی حکومت ہوگی جس میں ذات اور عقائد کا امتیاز باقی نہ ہوگا۔(۵۷)

آزادی کے بعد ہندو مسلم کس طرح رہیں گے

اُس وقت انگریز نے یہ مسئلہ پیدا کر دیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندو اور مسلم قوم کس طرح رہے گی؟ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے لئے یہ مسئلہ پیدا کرنا ضروری تھا۔
چنانچہ مولانا محمد علی نے اس سلسلے میں کچھ حل پیش کئے تھے۔ جس میں اقلیتوں کے تحفظ کا خصوصیت سے خیال رکھا گیا تھا۔ محمد علی کا کہنا تھا

"اصل مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر ان کو پورے حقوق دیئے جائیں۔ اور ایسے صوبوں میں جہاں ان کی اقلیت ہے ان کے حقوق کو محفوظ کیا جائے۔ اور ہندو قوم کے ساتھ منصفانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی غرض سے ہونا چاہئے۔ کہ یہی عمل ہندو قوم کے ساتھ کیا جائے۔ جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہر قوم کو ہر صوبہ پر جہاں وہ تعداد میں زیادہ ہے پورے حقوق دیئے جائیں اور جہاں تعداد میں کم ہے اس کے تحفظ کا انتظام کیا جائے۔"(۵۸)

مولانا محمد علی انتخابِ جداگانہ کے حق میں تھے لیکن بعد میں ان کے نظریے میں تبدیلی آگئی تھی

> "بیس برس پہلے میں جداگانہ انتخاب کے مصنفوں میں سے ایک تھا
> میں نے محسوس کیا اب اس کا وقت گذر گیا۔"(۵۹)

مولانا محمد علی نے ایک دوسری تجویز پیش کی۔ جس کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ 'سائمن رپورٹ' سے زیادہ بہتر ہے "دونوں کے لئے جگہیں محفوظ کر دی جائیں لیکن امیدوار منتخب نہ سمجھا جائے جب تک کہ وہ

(۱) اپنی قوم کے کم از کم ۴۰ فیصد ووٹ حاصل نہ کرلے اور

(۲) کم از کم دوسری قوم کے کل ڈالے گئے ووٹوں میں سے ۵ فیصدی
حاصل نہ کر لے۔ اگر اس کی قوم اس مقام پر دس فیصدی یا اس سے کم
ہو لیکن اگر وہ اس سے زیادہ ہو تو امیدوار کے لئے ۱۰ فیصدی ووٹ
دوسری قوم کے حاصل کرنا ضروری ہوں گے۔ اس سے تین مقاصد
حاصل ہوں گے

ہر امیدوار کو دونوں قوموں کے پاس اپنی ٹوپی ہاتھ میں لے کر جانا
ہوگا۔ کوئی شخص کسی قوم کا نائب منتخب نہ ہوگا جب تک وہ اس قوم کی
خاصی تعداد کی نیابت نہ کرتا ہو۔ جو دوسری قوم سے تعلقات نہ رکھتا
ہوگا وہ منتخب نہ ہو سکے گا۔"(۶۰)

اگر یہ بات طے ہو جاتی کہ دوسری اقوام کے بھی کم از کم اتنے فی صد ووٹ لانا لازمی ہیں تو شاید فرقے وارانہ تقاریر جلسوں میں عوام کو سنے کے لئے نہیں ملتیں اور اس طرح معصوم ذہن فرقے واریت کا شکار نہ ہوتے۔ لیکن ہمیشہ سیاسی افق پر رد و بدل ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا کی یہ تجویز اس آزاد ہندوستان میں ایک مرتبہ عملی شکل اختیار کر لے۔

ماخذ : مولانا محمد علی اور جنگِ آزادی

(۱) جواہر لعل نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح میری کہانی، میں تحریر کیا ہے
"اُن پر (محمد علی پر) مذہب کا رنگ بہت گہرا تھا۔۔۔میں اس معاملے میں ان کے بالکل برعکس تھا۔ اُن میں اور مجھ میں خدا کے وجود کے بارے میں اکثر بحث ہوتی تھی۔ محمد علی کی یہ عادت تھی کہ کانگریس کی قرارداد میں بھی کسی نہ کسی عنوان سے خدا کا ذکر ضرور کر دیا کرتے تھے۔ میں اس کے خلاف احتجاج کرتا۔" جواہر لعل نہرو، میری کہانی، حصہ اول، مکتبہ جامعہ، دہلی، بار اول ص ۲۰۰، ۲۰۱
(۲) ماہنامہ آج کل مولانا محمد علی نمبر دسمبر ۱۹۷۸ء دہلی۔
(۳) مولانا محمد علا کے چچازاد بھائی امتیاز علی ریاست میں تحصیلدار تھے۔ رام پور کے اسٹیٹ گزٹ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔
(۴) ظریفات و مقالات محفوظ علی بدایونی، مؤلف محی الدین، ص ۹۶، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۲ء
(۵) ظریفات و مقالات محفوظ علی بدایونی، مؤلف محی الدین بدایونی، ص ۱۹۶ انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۲ء

نوٹ ۔ محفوظ علی بدایونی ۱۸۷۰ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ گئے۔ ۱۸۹۶ء میں خیر پور میں اسٹینٹ جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں سومالی لینڈ میں جج مقرر کئے گئے۔ ۱۹۱۷ء میں تجارت کی غرض سے استعفیٰ دے دیا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو انتقال ہوا۔

تاریخ وفات

اٹھ گئے مایۂ صد نازش و اعزاز وطن + شور محشر کا نہ کیوں آہ و فغاں سے اٹھے
ہاتھ آیا مجھے تاریخ کا مصرع نوشہ + میر محفوظ علی آج جہاں سے اٹھے۔

۱۹۴۳ء

علی گڑھ میں مشاعرے کی بنیاد

(۶) خطوط محمد علی مرتبہ محمد سرور، ص ۲۱۷، مکتبہ جامعہ، دھلی۔ محولا شعر کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے "ایک بار چودھویں کو بارش ہوئی تو تیں چاروں مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر Dining Hall میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرحی میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا۔

(۷) روزنامہ خلافت، بمبئی، ۶ر مئی ۱۹۳۲ء، جلد ۱۱، نمبر ۱۰۵، صفحہ ۶، مقالہ محمد علی کی زندگی کی کہانی شوکت علی کی زبانی۔

(۸) 'مسلمانوں کی سب پہلی سیاسی نمائندہ انجمن یعنی مسلم لیگ کی ۱۹۰۶ء میں بنیاد ڈالی اور ۱۹۱۷ء میں اس کا صدر منتخب ہوا۔' (مولانا محمد علی ہمدرد ۷ ار جون ۱۹۲۷ء، مضمون آپ بیتی میری زندگی کے پچاس سال مولانا محمد علی جوہر۔)

(۹) ہمدرد روزنامہ دہلی ۱۳ر جنوری ۱۹۲۷ء ایضا

(10) Select arting and speeches of Moulana Mohd As Vol I By Afzal Iqbal, Mohd Arshad Kashmiri Bazar Lahore Page 1
Thoughts on Present Discountentment Select writing and speaches of Moulana Mohd Ali Vol I By Afzal Iqbal By Mohd Ashraf Kashmiri Bazar Lahore (President) Page No 1

(۱۱) ظریات و مقالات مؤلف محی الدین بدایونی، ص ۱۱۲

(۱۲) روزنامہ ہمدرد ۲۱ر اپریل ۱۹۲۹ء

نوٹ محمد علی نے جب کامریڈ نکالنا شروع کیا اس وقت ریاست بڑودہ میں ملازم تھے۔ ابتدا میں انھوں نے دو سال کی چھٹی لی تاکہ کامریڈ نکالنے کی تیاری کر سکیں۔ ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کو کامریڈ کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ اور مولانا نے ۱۹۱۰ء کے آخر میں ملازمت ترک کر دی تھی۔

(۱۳) روزنامہ ہمدرد ۲۳ر اپریل ۱۹۱۳ء

نوٹ ترکی کا امپائر خلیفۃ المسلمین تھا۔ اور اس کے تحت جزیرۃ العرب کے علاوہ مسلم ریاستیں بھی آتی تھیں۔ خلافت کے قیام کے باعث مسلمانوں کی مرکزی حیثیت تھی اور دنیا میں انگریزی حکومتوں کے مقابلے اس کے تحت آنے والے علاقے بڑی طاقت تھے۔

(۱۴) چند اہم خطوط صدر دفتر انجمن اعانت اسلام۔ دہلی۔ ص ۲۷

(۱۵) زمیندار، لاہور، ۲۹ر ستمبر ۱۹۱۳ء بعنوان تفرقۂ حق و باطل کے تحت شائع ہوئی۔

(۱۶) ۶ر اپریل ۱۹۱۳ء ہمدرد

(۱۷) روزنامہ ہمدرد، دہلی، ۶ر اپریل ۱۹۱۳ء، کالم ۳، صفحہ ۲۔

(۱۸) روزنامہ ہمدرد دہلی۔ سلسلۂ خاص، نمبر ۳۹، ۸ر اپریل ۱۹۱۳ کالم نمبر ۴ ص نمبر ۱

(۱۹) ہمدرد ۷ر مئی ۱۹۱۳ء سلسلۂ خاص، ص نمبر ۱ کالم نمبر ۲۔ (۲۰) ایضاً

(۲۱) ۱۹۱۳ء کے ہمدرد سلسلۂ خاص میں تفصیلات میں موجود ہیں۔ یہ شمارے ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ، جامعہ نگر اور راقم کی ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔

ماخذ کانپور

(۲۲) مسٹر محمد علی کی سوانح عمری مترجم ابوالحسن لکھنوی ۱۹۱۸ء ۲۶۰

نوٹ ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء کو مسلمانان نے احتجاج کیا تھا، جس کے جواب میں مسلمانوں پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔

Life and Times Afzal Iqbal Institute of Islamic Culture, Lahore 1974, Page 94

• سیرت محمد علی، خورشید علی مہر، طبع اول ۱۹۳۱ء، ص ۳۳

• سیرتِ محمد علی رئیس احمد جعفری، ص ۲۴۳۔

• محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق عبدالماجد دریابادی، حصہ اول، ص ۱۸

معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء۔

• مولانا ابوالکلام آزاد نے کانپور کی مسجد کے بارے میں لکھا تھا

کانپور کا دردناک نظارہ۔ زمین پیاسی ہے۔ اس کو خون چاہئے۔

لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا اطرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے۔ مسلمانوں کے۔ ایران میں کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟

مسلمانوں کی۔ سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے۔ مسلمانوں کا ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے۔ خون چاہتی ہے۔ کس کا؟ مسلمانوں کا آخرکار سرزمین کانپور پر خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔

تحریکِ آزادی ابوالکلام آزاد، ص ۲۷

(۲۳) سید وزیر حسن سیکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ

(۲۴) خطوط محمد علی مرتبہ محمد سرور بی۔ اے آنرز (جامعہ مکتبہ جامعہ دہلی اکتوبر ۱۹۴۰ء، ص ۱۷۶۔

نوٹ چند اہم خطوط کے دو ایڈیشن میرے پیش نظر ہیں۔ اوران دونوں میں اکثر عبارات میں فرق ہے۔
نوٹ ۔ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ اگر خلافت ترکی کو ختم کر کے انگریز کسی انگریزی خیال انسان کو امپائر بنانے میں کامیاب ہو گیا تو اس کے قدم ہندوستان میں اور مضبوطی سے جم جائیں گے۔ اور دوسرا خدشہ یہ بھی تھا کہ ترکی کا مخصوص کلچر یوروپی کلچر میں تبدیل ہو جائے گا۔

(۲۵) مکتوبات رئیس الاحرار ابو سلمان شاہجہاں پوری۔ ماڈرن پبلشرز کراچی ص ۸۶، ۱۹۷۸ء

(۲۷) روزانہ ہمدرد دہلی ۲۴ر جنوری ۱۹۲۷ء

نوٹ مولانا محمد علی نے ۲۴ر جنوری ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں لکھا ہے "۱۹۱۹ء ۔۔ پانچ برس کی نظر بندی اور قید کے بعد جب سید ھا امرتسر آیا اور پہلی بار کانگریس کا ممبر بنا تھا" مضامین محمد علی محمد سرور ص ۲۷۲ مکتبہ جامعہ ۱۹۳۸ء

(۲۸) اوراق گم گشتہ رئیس احمد جعفری محمد علی اکیڈیمی لاہور ص ۵۰

(۲۹) میری کہانی پنڈت جواہر لال نہرو ص ۲۰۰۔ مکتبۂ جامعہ ۱۹۳۶ء حصہ اول۔

(۳۰) ایضاً ص ۲۰۵ (۳۱) ایضاً ص ۲۰۴

(۳۲) اوراق گم گشتہ رئیس احمد جعفری، ص ۴۴ محمد علی اکیڈیمی لاہور۔

(۳۳) خطبات آزاد ساہتیہ اکادیمی ص ۱۷، ۱۹۸۵ء

(۳۴) خدام الکعبہ انجمن خدام کعبہ انجمن کے بارے میں روزانہ ہمدرد دہلی کی مختلف اشاعتوں میں اس کے اغراض و مقاصد اور کارکنان کی خدمات کے سلسلے میں خبریں اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۱۶ر مئی ۱۹۱۳ء روزانہ ہمدرد، دہلی، سلسلۂ خاص، ص ۳ پر 'خدام کعبہ' کے عنوان سے اس کا دستور العمل شائع ہوا ہے۔ اس کی رو سے ہر خادم کعبہ کو حلف لینا پڑتا تھا

> " فلاں ابن فلاں خدا کو حاضر ناظر جان کر کلمہ شہادت اشھدان لاالله الله واشھدانٌ محمداً عبده ورسوله کو پڑھ کر اور قبلہ، و کھڑے ہو کر صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ اس قبلہ (قبلہ کی طرف انگلی اٹھا کر) کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لئے دلی جوش سے کوشش کروں گا۔ اور خانہ کعبہ پر غیر مسلم حملہ کے وقت جان و مال سے دریغ نہ کروں گا۔ انجمن خدام کعبہ کے احکام اور قواعد کی پوری پابندی کروں گا۔"

اس تحریک کے سلسلے میں قبلہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے دولت کدہ پر ۶ر مئی ۱۹۱۳ء کو ایک جلسہ ہوا تھا۔ اور وہاں پر یہ دستور العمل ترتیب دیا گیا تھا۔ اس دستور العمل کی اور بھی دفعات ہیں۔ جو ۱۹۱۳ء کے ہمدرد اور دیگر اخبارات میں شائع ہوئی ہیں۔

ماخذ خلافت وفد

(۳۵) میری کہانی جواہر لال نہرو، ص ۸۴، ۱۹۳۶ء
(۳۶) مولانا محمد علی کی یاد میں صباح الدین عبدالرحمن، ص ۱۱، طبع اوّل ۱۹۷۶ء معارف پریس اعظم گڑھ۔
(۳۷) مولانا محمد علی کی یاد میں صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۷ تا ۱۹۔
(۳۸) تقاریر مولانا محمد علی صدیق بک ڈپو، ناقص ایڈیشن، ص ۱۶
(۳۹) ایضاً
(۴۰) ایضاً، ص ۱۱۲، (۴۱) ایضاً، ص ۱۰۷، ۱۰۸، (۴۲) ایضاً، ص ۱۰۰، (۴۳) ایضاً ۱۰۷
(۴۴) تحریکِ آزادی کے چند اہم باب عابد رضا خاں بیدار، ص ۴۵، ۴۶
(۵۱۴) میری کہانی جواہر لال نہرو، ص ۸۶
(۴۵) مولانا محمد علی کی یاد میں صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۱۸

ماخذ مقدمۂ کراچی

(۴۶) مقدمۂ کراچی عبدالقادر بیگ، حصہ اول، ص ۳۰
(۴۷) ایضاً، ص ۵
(۴۸) ایضاً، ص ۵۱
(۴۹) مقدمۂ کراچی صفحہ ۱۱۶۔ ۱۱۷ عبدالقادر بیگ، تاریخ اشاعت نہیں ہے۔ حکیم اجمل خاں کا دیباچہ ہے۔
(۵۰) مقدمۂ کراچی ص ۱۴۳
(۵۱) ایضاً ۳۸۰
(۵۲) تقاریر مولانا محمد علی صدیق بک ڈپو، ناقص ایڈیشن، ص ۲۸
(۵۳) روزانہ ہمدرد ۱۲ر مئی ۱۹۲۴ء (۵۴) ایضاً ۷ر اگست ۱۹۲۵ء

(۵۵) آخری مشورہ مولانا شوکت علی، دیباچہ، ۳۰ / مارچ ۱۹۳۱ء، دریا گنج۔ دھلی۔ ص، الف

(۵۶) ایضاً جمعیت مرکزیہ، خلافت ہند، بمبئی (دیباچہ کے نیچے ۳۰ / مارچ ۱۹۳۱ء تحریر ہے)

(۵۷) ایضاً ص ۲ (۵۸) ایضاً ص ۱۰، ۱۱۔ (۵۹) ایضاً ص ۱۷

(۶۰) آخری مشورہ ص ۱۷، ۱۸۔ (۶۱) ایضاً ص ۲

Life and Times of Mod. As. Afzal Iqbal ۱۹۰

بی اماں

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں خواتین نے بھی مردوں کے دوش بدوش حصہ لیا۔ مولانا محمد علی نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی اسے ہمیشہ سے سرداروں اور رؤسا کا قرب حاصل رہا۔ لیکن ان کی والدہ بی اماں(۱) کا خاندان ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانہ سے اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ اگر عبدالعلی خاں کی شادی کسی ایسے خاندان میں ہوتی جو رؤسا سرداروں یا نوابین کے ماحول کا پروردہ ہوتا تو عین ممکن تھا کہ علی برادران آزادی کے سپاہی بننے کے بجائے حکومتِ انگلیشیہ کے وفاداروں میں ہوتے۔

بی اماں کی ولادت ۱۸۵۲ء میں ہوئی مولانا نے تحریر کیا ہے

"۔۔۔ ۷ ار رمضان المبارک ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء کو میرے والد نے وفات پائی۔ میری والدہ کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی تھی۔"(۲)

یہی سنہ ولادت خاندانی ڈائری میں بھی موجود ہے۔ بی اماں کے اجداد میں محمد درویش علی خاں پنج ہزاری منصب دار، محی الدّین خاں دو ہزاری، حکیم علی خاں دو ہزاری منصب دار فرخ سیر ی اور فرخ سیری شمس الدین خاں ہزاری منصب داری محمد شاہی موجود تھے۔ یہ خاندان امروہہ میں ذی حیثیت اور با اقتدار تھا۔

مولوی آلِ حسن نے بی اماں کے اجداد کے بارے میں تحریر کیا ہے

"۔۔۔ خان عالی شان محمد درویش علی خاں کہ از عمدہ امراؤ ارکین سلطنتِ فرخ سیر بادشاہ بود و منصب جلیل و رتبۂ عظیم داشت جوان خوب رو اجمل احسنِ روزگار و مطمع الانظار بود۔ بادشاہ بادئی النظر التفات و اختصاص می فرمود از دہلی با امروہہ ورود نمود اکثر مردم بسلک

مصدراں جلیل القدر منتظم بودند وقار و اقتدارمی داشتند، غلام مولا خاں بن شمس الدین خاں بن درویش علی خاں باوجود کمالِ ثروت واقتدار عجز وانکسار بے حد داشت۔"(۳)

تاریخ امروہہ کا مصنف اس خاندان کے بارے میں تحریر کرتا ہے

"۔۔۔درویش علی خاں کا گھرانہ عہد سابق سے معزز اور نامور ہے۔"(۴)

حافظ احمد علی شوق مصنف تذکرہ کاملانِ رامپور کے قول کے مطابق

"غدر ۱۸۵۷ء کے وقت تک۔ س بارہ ہزار ماہانہ کی آمدنی کے قریب اس خاندان کے بنی عمام میں موجود تھا (تھی)"(۵)

اودھ کے تسلط کے وقت درباروں کی حاضری کے لئے اس خاندان کے افراد نہیں گئے اس لئے جاگیروں کا کثیر حصہ ضبط ہو گیا اور بقیہ ماندہ ۱۸۵۷ء کی نظر ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے زمانہ میں میرٹھ میں فوج کے باغی ہو جانے کے بعد امروہہ میں بھی اطلاعات آرہی تھیں ۱۸۰۱ء میں انگریزی فوج کے اخراجات کی غرض سے روہیلکھنڈ کا علاقہ جس میں مراد آباد بھی شامل تھا کمپنی کو دے دیا گیا۔ ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء کو امروہہ کے ذی حیثیت خاندانوں (دیوانِ سید محمود اور خاندانِ درویشِ علی خاں) نے درگاہِ حضرت شاہ ولایت علی رحمتہ علیہ میں ایک میٹنگ (مجلسِ مشاورت) کی جس میں شہر کے عمائدو اکابرین کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس میٹنگ کا مقصد یہ تھا کہ اگر دہلی اور میرٹھ کی طرح غدر امروہہ میں بھی ہو گیا تو ہم انگریز علم داری کو درہم برہم کر دیں گے اور اپنی حکومت قائم کرلیں گے اس سلسلے میں تاریخ امروہہ میں تحریر ہے

"۔۔۔خاندانِ دیوانِ سید محمود اور خاندانِ درویش علی خاں کے تعداد و رسوخ کے اعتبار سے اس زمانہ میں امروہہ کے دوسرے خاندانوں کی نسبت شانِ امتیاز رکھتے تھے۔ اور اپنے کو موروثی منصب

دار سمجھتے تھے اور اس لئے شہر کی حکومت کے دعویدار تھے۔"(۶)

غدر شروع ہوا اور ۹ر مئی کو باغیوں نے مرادآباد کا جیل خانہ توڑ ڈالا۔ قیدی آزاد ہو کر سید گلزار علی بن سید اکبر علی ساکن دربار کلاں کے ہمراہ امروہہ پہنچ گئے۔

چنانچہ موروثی منصب داروں کی جمعیت کے ہمراہ ۲۰ر مئی ۱۸۵۷ء کو تھانہ پر حملہ کیا گیا۔ تھانہ کی عمارت کو آگ لگا دی گئی اور تحصیل کا خزانہ لوٹ کر اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ اور دیوان سید محمود اور درویش علی خاں کے اہل خاندان نے حکومت قائم کی۔ درویش علی خاں کے خاندان نے دہلی کے معزول شہنشاہ کو عرضداشت بھی روانہ کیں۔ تاریخ امروہہ میں دونوں عرضداشت موجود ہیں۔

"بعد تقدیم مراسم عبدیت و جانثاری و تجیم لوازم فدویت وانکساری کہ سرمایۂ تفاخر سرمدی است دریں ایام فرخندہ فرجام بہ استماع مژدۂ جاں بخش روح افزائے زیب بخشی افسر و دیہم خلافت الٰہی و زیب افزائے اورنگ شہنشاہی ایں غلامانِ قدیمی و خانہ زادانِ موروثی بیزگان درویش علی خاں منصب دار پنج ہزاری بہ اقبالِ والا جانبازی بکار بردہ و مبازرت و دلیری کردہ استحصال بندوبست انگریزاں از سرکار سنبھل وکل قصبات متعلقہ سرکار موصوفہ ساختہ واز قصبہ امروہہ خاص کو توالش و دیگر متعلقان و خیر خواہانِ انگریزاں را بہ جہنم رسانیدہ والہتادامِ مکان تھانہ و تحصیل گردانیدہ شیخ بشارت علی خاں برادر کلاں خود را کہ از بس منتظم اند مع پانصد کس مبازرو مستور برائے انتظام آنجا گذاشتہ فدویان بتاریخ بست و نہم ماہِ رمضان المبارک ملائکہ پناہ کہ ملجائے جہاں و ماوائے بندگانِ قدیمی و خانہ زادانِ موروثی الدولہ سرفراز الملک نواب محمد ولی داد خانِ بہادر بتاریخ دوم ماہ شوال از پل دریائے ہنڈن واپس کنایندہ ہمراہ خود بمقام مال گڑھ آور ندو بسیار الطاف و بسیار

الطاف فرمودند اکنون ما فدویان مذکور الصدر حسب الارشاد نواب صاحب ممدوح مقیم مستقیم و مستحق منصب موروثی لهذا امید کہ بتفضلاتِ حضرت ظل سبحانی و سایۂ یزدانی بامراہم شہنشاہی و بہ منصب موروثی سرفرازی یافتہ بانتظامِ ملک کشمیر مامور شویم کہ انجام آں بہ اقبال بندگان والا بخوبی خواہی شد الٰہی آفتابِ جہانگیر و کشور کشائے از مطلع جاہ و جلال طالع بعد بحرمت النون الصاد۔

فقط عرضی

عرض فدوی شیخ بشارت علی خاں و فدویان شیخ مہربان علی خاں و مظہر علی خاں و شیخ فیاض علی خاں و شیخ اعتماد الدین خاں و شیخ عباس علی خاں و شیخ عزت علی خاں و شیخ احسن علی خاں و شیخ نصیر الدین علی خاں و شیخ منصب علی خاں و پسر گانِ درویش علی خاں پنج ہزاری خانہ زادِ موروثی ساکن قصبہ امروہہ مراد آباد سرکار سنبھل معروضہ شانزدہم شوال ۱۲۱۷ھ"(۲)

عرضداشت دیگر من جانب شیخ بشارت علی خان

باریابان درگاہ ملائک پناہ خداوند خدائیگاں سکندر شکوہ حق پژوہ حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی شاہ عالم پناہ خلد اللہ ملکہ'

بموقف عرض   می رساند

بعد بجا آوری مراسم عبودیت و انکساری و لوازم فدویت و جان سپاری کہ موجب افتخار دارین است قبل ازیں بتاریخ شانزدہم ماہ شوال سنہ الیہ عرضداشت محتوی حال خدومت مثال یعنی از تاریخ بست و پنج ماہ رمضان المبارک سنہ الیہ مستعد و سرگرم بودن ما فدویان در کار سرکار دولت مدار اعنی استیصال بندوبست انگریزاں از سرکار سنبھل و قصبات متعلقہ آں و روانہ نمودن برادران مہربان علی وغیرہ معہ اعتماد الدین خان وغیرہ غلام ہائے و برادرزاد

ہائے غلام فیاض علی خان وغیرہ معہ رفقائے دیگر چہل تن بجنور معدلت نشور وواپس آوردن نواب عظیم الدولہ سرفراز الملک محمد ولی داد خان بہادر نصرت جنگ لوشاں را از پل دریائے ہنڈن متصل غازی الدین نگر بتاریخ دوم ماہ شوال سنہ صدر برفاقت خود ش بمقام مالا گڑھ برائے انصرام کار بندگان سرکار فیض آثار بلف عرضداشت نواب صاحب موصوف ترسل خدمت ایستادگان پایہ تخت عرش منزلت نمودہ بود کہ بپاسخ آن فرمان قضاجریان بنام نواب صاحب ممدوح نزول اجلال فرمودہ مفتخر دارین ساخت اگرچہ کمترین بسبب بودن بمقام امروہہ بنابر اعانت وممانعت اجرائے تحصیل خیر سگالان نصار از شرف استیعاب دیدار فائض الانوار بس ممتاز نہ گردید لیکن بعد تعین داشتن برادر عزیز ولایت علی خان را برائے انجام کار معروضہ الایہ امروہہ حاضر گردیدن فدوی بمقام مالا گڈھ حسب الطلب نواب صاحب بہادر بہ استماع حکم مندرجہ اش از زبان فصیح البیان نواب صاحب موصوف بدیں منوال کہ ایشاں یعنی فدوی برفاقت نواب صاحب ممدوح حاضر بودہ انتظام صوبۂ ملک دو آبہ پرداختہ بعد انتظام آں مع جماعت حاضر آستان عرش نشان گردد کہ بہ مرادولی بخدمت و مناصب موروثی سرفرازی خواہد یافت بنابر آں خانہ زاد موروثی بہ شرف استماع حکم جہان مطاع آفتاب شعاع انصرام کار سرکار فلک اقتدار دریں نواح وجوار واجد دانستہ بہ رفاقت نواب بہادر مع برادر و برادر زادہائے و غلام زادگان بکار سرکار فیض آثار عرضداشت نواب صاحب ممدوح منکشف رائے جہاں آرائے خواہد بود آیندہ اندریں باب نحوی کہ حکم قضا شیم شرف نفاذ یابد حسب آں بعمل آرد۔ الہی آفتاب دولت واقبال از مطلع جاہ و جلال طالع باد' بالنون و والضاد۔"(۷) عرضی

محمود احمد الہاشمی العباسی کے قول کے مطابق اس خاندان نے امروہہ میں غدر کے دوران اپنی حکومت قائم کرلی تھی اور یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلی۔ جب حالات معمول پر آئے تو بغاوت کو کچلا گیا اور مجاہدینِ آزادی کو باغیوں کا نام دے کر ان کی گرفتاریاں کی گئیں۔ اس وقت بشارت علی خاں اور ولایت علی خاں بی اماں کے حقیقی چچا کو بھی گرفتار کرلیا گیا اس

خاندان کے بعض لوگ یہ کہہ کر نکل گئے کہ اب منہ نہ دکھائیں گے۔ شیخ مظہر علی خاں کے بارے میں تذکرۂ کاملانِ رامپور (۸) کے مصنف نے لکھا ہے کہ یہ روپوش ہو گئے۔ لیکن مولانا محمد علی کے خاندان کی روایت یہ ہے کہ مظفر علی خاں رامپور آ گئے اور کسی طرح رامپور میں روپوش ہو گئے۔ اسی زمانہ میں علی بخش خاں (مولانا محمد علی کے دادا) اور مظفر علی (بی اماں کے والد) کے تعلقات بھی ہو گئے۔ جو بعد میں رشتہ داریوں میں تبدیل ہوئے۔ حافظ احمد علی شوق نے محمد رشد علی خاں ولد مظفر علی خاں کے بارے میں تحریر کیا ہے

"آٹھ سال کی عمر میں اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے ہمراہ رامپور آئے اور یہیں مقیم رہے۔۔۔ آپ کی ہمشیرہ کی شادی راقم الحروف کے چھوٹے چچا عبدالعلی خاں مرحوم سے ہوئی جن کے فرزند شوکت علی خاں بی۔ اے اور محمد علی خاں آکسن مالک اخبار کامریڈ اور ہمدرد ہیں۔"(۹)

بی اماں نے جس ماحول اور گھرانے میں آنکھ کھولی وہ ذی حیثیت ذی علم اور با اقتدار گھرانہ ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت کا مخالف تھا۔ اور یہ مخالفت کا جذبہ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اس نے بی اماں کے خاندان کے افراد کو جامِ شہادت پینے کے لئے مجبور کر دیا۔ بی اماں کی عمر ۱۸۵۷ء میں تقریباً پانچ سال تھی ۱۸۵۷ء کے بعد اس خاندان کے جائیدادیں ضبط ہو گئیں۔ اقتدار ختم ہوا۔ آمدنی بیس ہزار سے گر کر ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ رہ گئی خاندان بکھر گیا۔ کچھ لوگ رامپور آ گئے۔ اور کچھ سنبھل پہنچ گئے۔ بی اماں نے بچپن سے خاندان کی تباہی کے اسباب دیکھے اور بزرگوں سے انگریز کے مظالم کی داستانیں بھی لازمی سنی ہوں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز سے انھیں نفرت ہو گئی۔ اور اسکی حکومت کا تختہ الٹنے کا خواب دیکھنے لگیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد بچوں کی نگرانی ان کے سپرد ہوئی۔ محمد علی دو سال کے تھے اور شوکت علی کچھ بڑے۔ اس لئے ان کے ذہن کی تعمیر انھوں نے اس طرز پر کی کہ ان دونوں نے انگریزی حکومت کے پائے ہلا دئے۔

اس کے برعکس علی بخش خاں (مولانا کے دادا) ۱۸۵۷ء میں اپنے آقا نواب رام پور کے حکم پر انگریزوں کو رسد پہنچا رہے تھے۔

۱۹۱۵ء میں علی برادران نظر بند کر دیئے گئے۔ مولانا کی نظر بندی کے دوران آبادی بیگم زوجہ عبدالعلی ملقب بی اماں اُن کے ہمراہ چھندواڑہ میں تھیں۔ اس دوران انھوں نے بعض خطوط تحریر کیئے ہیں جو کتابی شکل میں چند اہم خطوط کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن تحقیق یہ ہے کہ بی اماں لکھنا نہیں جانتی تھیں۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۰۹ء کو تحصیل سنبھل ضلع مراد آباد کی جائیداد کی ایک رجسٹری ہوئی ہے اس دستاویز کا اندراج محکمہ رجسٹری مراد آباد کے رجسٹر نمبر ایک جلد نمبر ۱۵ صفحہ ۸۷ / ۱۱۴ / ۱۱۸ پر درج کیا گیا ہے۔ اس پر بی اماں کا نشان انگوٹھا ہے۔ اور اسکی تصدیق مولانا شوکت علی نے کی ہے۔

مولانا محمد علی کے علاوہ ان کے برادران نوازش علی خاں، ذوالفقار علی خاں، بندہ علی خاں، محمد علی شوکت علی اور مولانا محمد علی کی زوجہ امجدی بیگم اور مولانا کی بہن محمدی بیگم کے بھی دستخط ہیں۔ اس لئے یہ جواز انتہائی خفیف ہے کہ اُس زمانہ میں عورتوں کے دستخط کے بجائے نشان انگوٹھا ہوتا ہوگا۔ مولانا محمد علی نے بی اماں کی تعلیم کے بارے میں لکھا ہے

"میری والدہ نے سوائے قرآن پاک کے کچھ نہ پڑھا تھا۔ اسکی مدد سے
خود اردو کا بین السطور ترجمہ پڑھنے کی استعداد پیدا کرلی تھی۔" (۱۰)

اس لئے جو پیغامات یا خطوط بی اماں بیگم عبدالعلی، آبادی بانو بیگم کے نام سے شائع ہوئے ہیں وہ 'بی اماں' نے تحریر نہیں کیئے۔ اغلب یہ ہے کہ مولانا محمد علی نے ہی تحریر کیئے ہوں گے۔ (نظر بندی کے دوران چھندواڑہ میں علی برادران میونسپل حدود میں آیا جایا کرتے تھے۔ اور ان سے بھی مختلف افراد ملنے کے لئے آیا کرتے تھے۔) یا بعض ایسے خطوط جو حکومت کو تحریر کیئے جاتے تھے انھیں مسٹر گھاٹے تحریر کرتے تھے اس کا ذکر بی اماں کے خطوط میں ملتا ہے۔ (۱۱) بی اماں اخبارات بھی دوسروں سے پڑھوا کر سنتی تھیں۔ انھوں نے لکھا ہے (لکھوایا ہے)

"میں تمام اردو اخبارات پابندی کے ساتھ پڑھواتی ہوں۔ اور اکثر انگریزی اخبارات کا بھی خلاصہ کروا کر سنتی ہوں۔

'چند اہم خطوط' اصل میں انگریزی میں تحریر کئے گئے تھے۔ اور یہ اردو ترجمہ کی شکل میں شائع ہوئے۔ بی اماں انگریزی سے بالکل ناواقف تھیں۔ اس لئے اغلب ہے یہ خطوط سنٹر گھاٹے قانونی مشیر اور بعض مولانا محمد علی نے تحریر کئے ہوں، بعض خطوط بہت طویل ہیں۔ اور طرز تحریر مولانا محمد علی کی طرح ہے۔ خطوط میں طول نویسی بھی ہے اور جملوں کی ساخت محمد علی کے جملوں کی طرح ہے۔

ان خطوط میں ترکی کی حمایت کو مذہبی فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیگم عبدالعلی کو بی اماں کی طرف سے ایک خط لکھا گیا ہے۔ گو کہ خط قانونی مشیر کی مدد سے لکھوایا گیا ہے۔ لیکن اس کے جملوں کی ساخت اور نفس مضمون یہ بتاتا ہے کہ اس میں مولانا محمد علی کی رائے اور ترتیب مضمون شامل ہے۔

اس خط میں تحریر ہے

"اس وقت تک کوئی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں ہے۔ جب تک وہ مسلمانان ترکی کے ساتھ اسی آزادانہ ہمدردی کے تبلیغ و اظہار میں کوشاں نہ ہو جس آزادی کے ساتھ وہ مسلمانان ایران، ہندستان و عربستان سے ہمدردی ظاہر کرتا ہے۔۔۔ سلطان ترکی کی ایک خاص حالت ہے بحیثیت ایک دنیاوی حکومت کے وہ عالم کے ایک خطے پر جو ترکی کے نام سے موسوم ہے سلطان اسی طور سے حکمراں ہیں جس طریقے سے شاہ کجکلاہ زمیں فارس پر یا امیر افغانستان پر حکومت کرتے ہیں۔۔۔ سلطان ترکی کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ وہ امتیاز کیا ہے۔ خلافت کا ریب بر کرنا ہے۔" (۱۲)

عبدالعلی حاں اور بی اماں کی شادی کے بعد بی اماں کے خاندان کی کئی لڑکیوں کی

شادی بھی علی بخش خاں کے خاندان میں ہوئیں۔ چنانچہ امتیاز علی تحصیلدار(۱۳) کی زوجہ جو عرف عام میں منھی بیگم کہلاتی تھیں۔ بی اماں کے خاندان سے تھیں غالباً یہی وجہ تھی کہ شوہر کے انتقال کے بعد جب بچوں کی پرورش کی پوری ذمہ داری بی اماں پر آگئی تو انکے روابط اور آنا جانا زیادہ تر ان گھرانوں میں تھا جو قلعہ پرستی اور نواب رامپور کے ان عہدہ اوروں میں نہ تھے جو نواب رامپور کی ذات سے متعلق محکموں میں ملازم تھے۔

مولانا کو ۱۹۱۵ء میں رامپور میں نظر بند کیا گیا اور بوجہ علالت انھیں گھر پر رہنے کی اجازت ملی تو انکا قیام امتیاز علی مرحوم کے گھر رہا جنکی شریک حیات منھی بیگم تھیں۔ مولانا کے اس عمل میں بی اماں کی وہ تربیت پوری طرح نظر آتی ہے جو انھوں نے مولانا محمد علی کی کی تھی۔

انگریز دشمنی کا جذبہ علی برادران کو بی اماں سے وراثت میں ملا تھا۔ اور وہ اس جذبہ کے امین، ضامن اور وارث تھے۔

مولانا محمد علی نے لکھا ہے

"ہماری والدہ نے دوسرے کی مدد کے بغیر ہماری تربیت کی۔"(۱۴)

والد کے انتقال کے بعد مولانا کے ایک چچا جو ان کی جائداد کا کام دیکھا کرتے تھے ان کے حسنِ سلوک کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے

"۔۔۔جب دو بھائیوں میں سے چھوٹے یعنی شوکت کو (والدہ نے) انگریزی تعلیم دلوانے کا ارادہ کیا تو وہ چچا جو ہماری جائداد کا انتظام دیکھتے تھے ان کی تعلیم کے مصارف اُنھوں نے دینے سے انکار کردیا۔"(۱۵)

جب اس بیوہ کے حصہ کا روپیہ مولانا کے چچا نے نہیں دیا تو بی اماں کو مجبوراً اپنا زیور رہن رکھوانا پڑا اور اس روپیہ سے مولانا شوکت علی کو جہاں سے پہلے سے (بریلی میں) ذوالفقار علی پڑھ رہے تھے، بغرض تعلیم روانہ کیا۔

مولانا نے بھی تحریر کیا ہے

"۔۔۔میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے
اس مرحومہ کے ذریعہ پہنچایا تھا۔"(١٦)

علی برادان کی تعلیم اور تربیت کے بعد بھی بی اماں کا مقصدِ حیات پورا نہیں ہوا تھا اس لئے کہ انگریز کی جابرانہ اور ناانصاف حکومت ہندوستان میں نقطۂ عروج پر تھی۔ چنانچہ علی برادران کی نظر بندی کے زمانہ میں بی اماں زیادہ تر ان کے ہمراہ رہیں۔ بی اماں نے اپنے خط میں سبر امیم آر کو لکھوایا ہے ۔

"۔۔۔پہلے دن سے میں ان کی جبر یہ جلاوطنی میں شریک ہوں اور ایسا
کرنے پر کبھی نہیں پچھتائی۔ یہ عزت انھیں لوگوں کے لئے ہے جن
کو خداوند تعالیٰ مذہب اور ملک کی خاطر تکالیف و مصائب برداشت
کرنے اور جان دینے کے لئے منتخب کرتا ہے۔"(١٧)

علی برادران کی نظر بندی کے دوران ہی ٧ / ستمبر ١٩١٧ء کو عبدالمجید ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی چارلیس کلولینڈ، ڈائرکٹر محکمۂ خبر رسانی کے حکم پر علی برادران کے پاس پہنچے اور ان کے سامنے ایک معاہدہ پیش کیا اور کہا کہ اگر آپ اس پر دستخط کر دیں تو آپکو رہا کر دیا جائے گا

معاہدہ

"میں بقیہ ایام جنگ میں کوئی ایسا کام کرنے، ایسی تحریر لکھنے یا ایسی بات
کہنے سے معترض رہوں گا جس سے حضور شاہ قیصر کے دشمنوں کی
ہمت افزائی یا امداد مقصود ہو یا معقول طور سے اس کا احتمال ہو۔ میں
کوئی ایسا کام کرنے ایسی تحریر لکھنے یا ایسی بات کہنے سے بھی معترض
رہوں گا جس سے حضور شاہ قیصر کے حریفوں پر حملہ کرنا مقصود ہو یا

معقول طور سے اس کے یہ معنی لگانے کا احتمال ہو۔"(۱۸)

اس معاہدہ کے بارے میں علی برادران عبدالمجید سے گفتگو کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ شرائط نامہ کا جواب تحریر کریں کہ بی اماں کو اس مشروط رہائی اطلاع ملی وہ فوری طور پر برقعہ پہن کر اس کمرہ میں آگئیں جہاں عبدالمجید بیٹھے تھے۔ اور انھوں نے عبدالمجید کو مخاطب کر کے کہا

"۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ گورنمنٹ یہ جان لے کہ اپنی تکالیف سے بچنے کے لئے وہ (علی برادران) سی ایسی بات کا اقرار کریں گے جو ان کے مذہبی احکام یا ملکی فوائد کے ذرا بھی خلاف ہو تو مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک میرے قلب کو اتنی مضبوطی اور ان سو کھے جھریاں پڑے ہاتھوں میں اتنی طاقت دیگا کہ میں اسی وقت ان دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی۔ گو یہ مجھے عزیز ہیں اور کیم وشیم دکھائی دیتے ہیں۔"(۱۹)

بی اماں نے معاہدہ کا مضمون سن کر مندرجہ بالا جواب جو عبدالمجید کو دیا اسکی روشنی میں یہ بات پورے وثوق یقین اور اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ خلافت کے زمانے میں جو منظومات گائی جاتی تھیں وہ بی اماں کے جذبات وعمل کی ترجمانی کرتی ہیں۔

بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دیدو

کا گیت بی اماں کے صحیح جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے قوم وملت کی خدمت کرنے کے لئے انھوں نے اپنے بچوں کی تربیت کی اور اس تربیت کی تکمیل کے بعد بھی ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ استاد کی طرح ایسے موقعوں پر ہمیشہ علی برادران کے ہمراہ رہیں جہاں پیر لڑکھڑانے یا لغزش کر جانے کا معمولی سا شائبہ بھی ہو سکتا تھا۔

بی اماں کے مذکورہ بیان سے ان کے حوصلہ، جرت اور بے خوف وخطر آتش نمرود

میں کود پڑنے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ضعیفی میں بھی ان کے عزاور حوصلہ کا یہ انداز تھا کہ جب ہوم رول لیگ لوک مانیہ تلک۔نے قائم کی تو انھوں نے اپنی بہواور دیگر ممبہ ان کے ہمراہ اس کا حلف لے لیااور سر سبرامنی آئر پریذیڈنٹ ہوم رول کوایک طویل خط لکھا یہ خط انھوں نے مسز اینی بیسنٹ کی نظر بندی کے سلسلے میں صدائے احتجاج بلند کرنے والے جلسے میں پڑھکر سنایا تھااس خط کے تحریر کرانے سے قبل بی اماں اینی بیسنٹ سے نہیں ملیں۔ صرف علی برادران سے خط وکتابت تھی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ بی اماں اپنے عقیدہ اور نظریات وگفتار سے ہی سیاست میں حصہ نہیں لیتی رہیں بلکہ انہوں نے اپنے عقائد کا با آواز بلند اعلان کیااں کا کہنا تھا

"۔۔۔اس زمانے میں محض عقائد ہی کافی نہیں اب تو اس کی ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنے عقائد کا با آواز بلند اعلان کرے"(۲۰)

بی اماں نے مولانا کی سزایابی کے زمانہ میں پورے ہندوستان کے دورہ کئے اور چندہ جمع کر کے مولانا محمد علی جوہر کی تحریک کو فعال و متحرک رکھا۔ مولانا نے تحریر کیا ہے

"۔۔۔ ہمارے جیل میں داخل ہوتے ہی ہم پر باہر کی دنیا کا دروازہ بند ہو گیا۔ تو میری ماں نے ایک ہاتھ میں تسبیح لی اور دوسرے ہاتھ میں عصائے پیری کو لیااور نقاب الٹ کر وہی کام کرنا شروع کیا جو ہم کیا کرتے تھے۔ مگر جسے حکومت نے سخت خطرناک سمجھ کر ہمیں جیل میں ڈال کر ہم سے چھڑالیا تھا۔ میری والدہ اور میری بیوی نے تقریباً چالیس پینتالیس لاکھ روپیہ وصول کیا"(۲۱)

اس پیرانہ سالی کے باوجود بی اماں ہندوستان کے دورہ کرتی رہیں۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں ان کی طبیعت میرٹھ میں خراب ہو گئی۔اس سے قبل وہ پولیٹیکل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے سندھ گئی تھیں۔ واپسی میں انہیں میرٹھ میں آمنہ بیگم (مولانا کی صاحبزادی کی علالت کا تار

ملا جس کی وجہ سے علی گڑھ پہنچیں اور دیر تک صحن میں بیٹھی رہیں۔ بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئیں۔ انہیں بغرض علاج دہلی لایا گیا۔ اس کے بعد ان کی خواہش پر انہیں رامپور لایا گیا۔ مولانا نے تحریر کیا ہے

> "۔۔۔وہاں جا کر طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی ہم لوگ فوراً رامپور گئے۔ مگر کئی دن تک بوجہ امتناعی احکام رامپور میں داخل نہ ہو سکے اور اسٹیشن پر ہی پڑے رہے۔ بی اماں کو جب معلوم ہوا کہ میرے بچے مجھ سے اور میں بچوں سے نہیں مل سکتی تو وہ اسی حالت میں اسٹیشن پر چلی آئیں اور اصرار کیا کہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔ مجبوراً ان کو دتی لانا پڑا۔۔۔ بی اماں کی اب یہ خواہش باقی ہے کہ سوراج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور ہندو مسلمانوں میں اتحاد ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کی موجودہ حالت نے بھی ان کی صحت پر بہت برا اثر کیا"(۲۲)

لیکن افسوس کہ بی اماں کی یہ آرزو ان کی حیات میں پوری نہ ہو سکی ۱۲ر اور ۱۳ نومبر ۱۹۲۴ء کی درمیانی شب میں بی اماں کا انتقال دہلی میں ہوا۔ موصوفہ حضرت شاہ ولی النبی رحمتہ سے بیعت تھیں جو حضرت شاہ احمد سعیدؒ کے خلیفہ تھے۔ بی اماں کو شاہ ابوالخیر صاحب (دہلی کے احاطہ میں مشرقی دوورارہ کے باہر مزار کے برابر برآمدہ میں دفن کیا گیا۔ پہلے قبر پر کتبہ بھی تھا لیکن برآمدہ کی زمین کو غالباً یکساں کرانے کی غرض سے کتبہ اور تکیہ الگ کر دیا گیا ہے اب مزیک کا فرش ہے اور برآمدہ میں قبر کا نشان باقی ہے۔ بی اماں کی وفات پر ملک کے گوشہ گوشہ سے پیغامات آئے جو ۸ر نومبر ۱۹۲۴ء کے ہمدرد میں شائع ہوئے ہیں۔

بی اماں کا ماتم

تعزیت کے پیام

۱۴، نومبر ۱۹۲۴ء

بی اماں کے جو ہند کے "محترم فرزندوں کی محترم ماں تھیں" انتقال کی خبر ابھی سنی۔ پیام تعزیت قبول کیجئے۔ تلسی چندر گوسوائی کلکتہ۔

میرا خلوص آمیز پیام تعزیت قبول فرمائے، سی۔ آر۔ اداس، کلکتہ۔

بی اماں کے انتقال کی خبر سے صدمہ ہوا۔ وہ آپ کی اور ہماری سب کی ماں تھیں "ہندو مسلم" اتحاد کی سچے طور سے حامی تھیں۔ پروفیسر، رو چی رام ساہنی، لاہور

آپ کے رنج و غم سے اور ملک کے نقصان عظیم سے مجھے بھی صدمہ ہے اور آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ مسٹر و مسز دیپ نرائن بھاگلپور۔

میرا دلی پیام تعزیت قبول ہو۔ خدا مرحومہ کی مغفرت کرے۔ محمد اورنگ زیب خاں۔ پشاور۔

آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ والدہ مرحومہ کی مغفرت کے لئے دعا کرتا ہوں۔ غازی محمود۔ لودھیانہ۔

آہ بی اماں

کیوں نہوں پھر فرطِ غم سے ہندوالے بیقرار
حلقہ احرار میں ماتم نہ کیوں ہو آشکار

غم کی اک بجلی گری دل پر سنی جس دم خبر
ہوگئے مبہوت پایا جس گھڑی دلی کا تار

اپنے سر سے آج بی اماں کا سایہ اُٹھ گیا
آج بی اماں سے خالی ہوگیا اپنا دیار

"کیا لکھیں شوکت محمد کو بتاؤ دوستو
کس طرح تسکین دیں انکو جو خود ہوں سوگوار

وہ ارادے وہ ہمت اور وہ قومی معرکے
یاد آتی ہیں وہ بی اماں کی باتیں باربار

دیکھ کر آزاد انکو چین سے سوتی ہیں اب
قید تھے بیٹے تو تھیں انکی جگہ مصروفِ کار

ہے یہی اپنی دعا تم بھی قمر آمیں کہو
جنت الفردوس بی اماں کی ہوجائے قرار

انکی تربت پر سدا ہو رحمتِ حق کا وفور
تاقیامت ہو جہاں میں انکی باقی یادگار

ہم سب کی طرف سے دلی ہمدردی کا پیام قبول کیجئے۔ محترمہ مرحومہ کو خدا جوار رحمت میں جگہ دے۔ "نہرو"۔ الہ آباد۔

انتقال کی خبر سے سخت صدمہ ہوا۔ اس پر الم غم میں ہماری طرف سے پیامِ تعزیت قبول کیجئے۔ شنکر لال (بیٹر)

والد صاحب کو مجھے اور میرے بھائیوں کو بی اماں کے انتقال پر بڑا رنج ہوا۔ اور ہم سب ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا مرحومہ کو بہشت نصیب کرے۔
احمد حاجی صدیق۔ کھتری۔ بمبئی۔

مجھے اور میرے تمام خاندان کو آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔
پرین بہن (دادابھائی نوروجی آنجہانی کی پوتی)

خلافت پریس اور عملہ آپ کے غم واندوہ میں ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور مرحومہ کی بخشش کے لئے ہم دعا کرتے ہیں۔

خلافت پریس۔ بمبئی۔

بی اماں کے ماتم میں ہم آپ کے ساتھ شریک ہیں۔ اللہ ہم سبکو صبر کی توفیق دے۔

ڈاکٹر کچلو، مولانا ظفر علیخاں۔ لاہور

بی اماں کے انتقال سے بڑا صدمہ ہوا۔ پیام ہمدردی قبول کیجئے۔

شیخ صادق حسین۔ امرتسر۔

بی اماں کے انتقال پر بڑا رنج ہوا۔ خدا مرحومہ کو بخش دے۔ خط ارسال ہے۔

اعظم خاں صدیقی۔ چھنڈواڑہ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ و طلبا نے جلسہ منعقد کیا۔ اور وہ سب بی اماں محترمہ کے انتقال پر ملال پر اظہار رنج و غم کرتے ہیں اور مرحومہ کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ برادرانہ پیام ہمدردی قبول فرمائیے۔

شیخ الجامعہ۔ علیگڑھ

دفتر خلافت کے ملازمین دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور مرحومہ کی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں۔

خلافت۔ بمبئی۔

انتقال کی خبر سن کر بڑا صدمہ ہوا۔ خدا مرحومہ کو بہشت نصیب کرے۔ میں فوراً آرہا ہوں۔

معظم علی مراد آباد

آپ اپنے اس غم میں اور متحدہ ہندوستان کے اس ناقابل تلافی نقصان میں میرا دلی پیام ہمدردی براہ عنایت قبول کیجئے۔

علی گل خاں۔ پشاور

بی اماں کے انتقال پر ملال کی خبر ابھی پڑھی مجھے آپکے ساتھ نہایت ہمدردی ہے۔

فضل بھائی کریم بھائی۔ بمبئی

تمام ہندوستان اُس ماں کے انتقال کے غم میں شریک ہے جس نے دو بہادر بچے پیدا کئے اور جو ہمارے دلوں کے ابھارنے کا ذریعہ تھیں۔ میں بلگام کی طرف سے تعزیت کا اظہار کرتا ہوں۔

گنگادھر راؤ دیشپانڈے۔ بلگام

آپ کے اس غم میں شریک ہوں۔ دلی ہمدردی قبول ہو۔

قاسم حسن۔ اورنگ آباد

بی اماں کے انتقال کی خبر سن کر صدمہ ہوا۔ یہ نقصان سارے ہندوستان کا ہے۔ تعزیت کا پیام قبول کیجئے۔

اے رنگاسوامی آینگر۔ مدراس

بی اماں کے انتقال پر خلوص آمیز ہمدردی اور تعزیت قبول کیجئے۔

موتی لال نہرو۔ الہ آباد

بی اماں کے انتقال پر بڑا افسوس ہوا۔ خدا آپ کو اس غم کے برداشت کرنے کی قوت عطا فرماوے اور مرحومہ کو مغفرت نصیب کرے۔

جسونت پرشاد ڈیسائی۔ بمبئی

دلی ہمدردی قبول فرمایئے ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ پروردگار عالم آپ کو اور مولنٰا محمد علی صاحب کو صبر عطا فرمائے۔

عابد۔ بھیکم پور۔ علیگڑھ

بی اماں کے انتقال پر میں آپ کے اس رنج و غم میں شریک ہوں۔ ایک بڑی ذات تھی جو ہم سے جدا ہو گئی۔

عامر مصطفےٰ خاں معین۔ علی گڑھ

انتقال کی الم انگیز خبر اخبارات میں پڑھی۔ میں آپ کے غم میں شریک ہوں۔ خدا آپ دونوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مسٹر و مسز حسین۔ بمبئی

بی اماں کے انتقال کی خبر سن کر صدمہ ہوا۔ براہ عنایت دلی ہمدردی قبول ہو۔

شعیب قریشی بمبئی

افسوس ہے کہ یہ پیام ہمدردی پیش کرنے کی نوبت آئی۔ آپکے اس رنج واندوہ میں تمام اسرامی ہند شریک ہے

سید لال بادشاہ۔ پشاور

آپ کے خاندان اور ہندوستان کے ناقابل تلافی نقصان پر میں ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔ میری محبت کرنے والی اماں کا بھی ابھی انتقال ہوا ہے، امید ہے کہ محمد اس نئے صدمہ کو بہادری سے برداشت کریں گے۔ خدا ہم سب کی مدد کرے۔

ڈاکٹر سید محمود۔ چھپرا

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر کے عملے کی طرف سے مودبانہ اور خلوص آمیز ہمدردی قبول فرمائیے۔

رگھوپتی سہائے وراجہ رام۔ الہ آباد

بی اماں کے انتقال سے بڑا رنج ہوا۔ ان کا انتقال عظیم قومی نقصان ہے۔ اللہ اکبر۔

سری نواس۔ آئنگر۔ مدراس

بی اماں کے انتقال پر ملال پر دلی ہمدردی قبول کیجئے۔

عمر بھائی۔ حامد بھائی۔ بمبئی

بی اماں کا انتقال نہایت رنج کا باعث ہوا۔ خدا اُنکی مغفرت کرے۔

وکیل احمد۔ رائپور

آپ کے قابل احترام ماں کی پر الم خبر موت سن کر افسوس ہوا۔ خدا اُنکی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

شیو پرشاد گپتا۔ بنارس

محترم بی اماں کے انتقال پر بڑا صدمہ ہوا۔ آپ کے اس رنج و غم میں مجھے آپ کے ساتھ

پوری ہمدردی ہے۔ آپ اتنی زبردست ارلوی قوت وقومی کاموں کے ساتھ انتہائی لگاؤ رکھنے والی خاتون کا بدل ملنا ناممکن ہے۔

سیٹھ جمال محمد۔ مدراس

آپ کے اس مُدالم غم میں مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے بی اماں کے انتقال سے ایک قومی و اسلامی نقصان ہوا ہے۔ خدا اُن کی قربانیوں کو اور اُنکی اعلیٰ خدمات کو خدا کے سچے کام کرنے والوں کے لئے ہمیشہ جوش اور ہمت دلانے کا باعث بنائے۔

(سیٹھ) حاجی عبداللہ ارون (کراچی)

بی اماں کے انتقال کی خبر اسلام کے اس نازک موقعہ پر سن کر سخت صدمہ ہوا۔ میری طرف سے دلی تعزیت قبول فرمائے یہ صدمہ نہ صرف آپکے اوپر پڑا ہے بلکہ اسمیں تمام فرزندان اسلام شریک ہیں بعد نماز غائبانہ ادا کی گئی اور مغفرت کے لئے دعا مانگی گئی۔

تھمی سا۔ کریکال

ام الاحرار کے انتقال پر تعزیت قبول ہو۔ یہاں تمام مساجد میں مغفرت کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔

مولنا حبیب الرحمٰن۔ لدھیانہ

آپ اور آپ کے برادر معظم آپ کی والدہ محترمہ کے انتقال پر میرا پیامِ تعزیت قبول فرمائیں۔

مسٹر سی وائی چنتا منی۔ ایڈیٹر لیڈر الہ آباد
سابق وزیر گورنمنٹ (صوبہ متحدہ)

اخبارات کی طرف سے تعزیت

ہم مولنا محمد علیصاحب اور مولنا شوکت علی صاحب کی خدمت میں جو انھیں انکی

والدہ محترمہ کے انتقال پر جنھوں نے تحریک خلافت کے لئے انتھک کوشش کی اور جو بہتوں کے لئے جو اس تحریک میں شریک کار تھے ہمت دلانے کا باعث ہوئی تھیں۔ اُنکے رنج و غم میں تعزیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ہم اُنکی مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

"لیڈر"۔ الہ آباد

مولنا علی اور مولنا شوکت علی کی قابلیت والوالعزمی اور جاں نثاری کے کارناموں سے دنیا حیران تھی۔ لیکن ایکا زار اس وقت عالم آشکارا ہوا۔ جب وہ نظر بند تھے۔ اور سی آئی ڈی کے ایک مقتدر افسر بعض شرائط پر اُن کی رہائی کیلئے بی اماں سے گفت و شنید کر رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ ۔

اگر اپنی تکالیف سے بچنے کے لئے وہ کسی ایسی بات کا اقرار کرلیں گے جو ان کے مذہبی احکام یا ملکی فوائد کے ذرا بھی خلاف ہو تو مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے کمزور دل کو اتنی مضبوطی اور ان کے سوکھے جُھریاں پڑے ہاتھوں میں اتنی طاقت دیگا کہ میں اسی وقت ان کا گلا گھونٹ دونگی"۔

اپنے جلیل القدر فرزندوں کی نظر بندی کے زمانہ ہی میں آپ ملکی و قومی خدمت میں مصروف ہوگئی تھیں۔

اسیران کراچی کی رہائی کے بعد اُس الوالعزم خاتون نے اپنے بہادر فرزندوں کی معیت میں نہ صرف ہندوستان بھر کا دورہ کیا بلکہ لنکا کی دور دراز سر زمین میں بھی آزادی و حُب وطنی کی تبلیغ و اشاعت کیلئے سفر کی صعوبت برداشت کی۔

ام الاحرار کی وفات سے نہ صرف علی برادران اور ایک شفیق ماں کے سایہ عاطفت سے محروم ہوگئے ہیں۔ بلکہ اس سے ہندوستاں کی تحریک آزادی کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی خواتین اور خصوصاً مسلمان مستورات میں جو ملکی و قومی معاملات سے قطعاً بے بہرہ تھیں۔ بیداری کا نتیجہ خیز احساس پیدا کردیا ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ کے لئے ان کی غیر فانی یادگار قائم رکھے گا۔

حق یہ ہے کہ ایسی الوالعزم حب وطن حامیٔ صداقت سر فروش اور جانباز خواتین زمانہ ہمیشہ پیدا نہیں کرتا۔ اور ہندوستان اس نیک نہاد خاتون کا مدت العمر تک ماتم قائم رکھے گا۔

"تنظیم"۔ امرتسر

یہ خبر ہندوستان کے طول و عرض میں انتہائی تحسر و تالم سے سنی جائے گی کہ مولینا شوکت و مولینا محمد علی کی والدہ محترمہ نے اس دار فانی سے رحلت کی۔ انّ للہ وانّ الیہ راجعون

محترمہ مرحومہ نے اگرچہ تقریباً عمر طبعی تک پہنچ کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ موجودہ ہندوستان کے عالم نسوان میں ایسی مردانہ سرشت اور حساس طبع خاتون چراغ لے کر ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی۔

بہر کیف دنیا گذشتنی اور گذاشتنی ہے کوئی ہزار سال بھی جئے تاہم موت سے ناگزیر ہے۔

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید
ز جام دہر مئے کل من علیہا فان

"وکیل" امرت سر

بی اماں کے انتقال پر ہمارے ہندوستان میں نہایت رنج محسوس کیا جائیگا۔ اُنکی حب وطن۔ اسلام سے محبت اور اعتقاد کی پختگی نہ صرف اُن کے لڑکوں کیلئے جنکو انہیں نے تعلیم دی تھی۔ بلکہ دوسروں میں بھی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان جوش و ہمت کے پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔۔۔ یہ اُنکی دلی تمنا تھی کہ وہ اپنی حیات میں سوراج حاصل کر لیں جسکے لئے انھوں نے دفتری حکومت کی زیادتیوں کا ہمیشہ مقابلہ کیا اور ہندو مسلم اتحاد کیلئے ہمیشہ کوشاں رہیں بہر حال انھوں نے اپنے بعد ایک ایسی مثال چھوڑی ہے۔ جو ہندوستانی خواتین اور خصوصاً آزادی ہند کے لئے کار آمد ہوگی۔

ماخذ : بی اماں

(۱) بی اماں کا نام آبادی بانو بیگم تھا۔ ان کی اولادیں انھیں بہو کہتی تھیں اس سلسلے میں مولانا شوکت علی نے لکھا ہے "بی اماں۔۔۔ جن کو ہم سب بچے 'بہو' کہتے تھے۔ اس وجہ سے کہ چونکہ ہمارے دادا کی سب سے چھوٹی بہو تھیں۔ سب بہو بہو کہہ کر پکارتے تھے۔ اور ہم بھی بہو ہی کہتے تھے۔ 'بی اماں' کا نام 'بی اماں' میرے بیٹوں اور خلافت کے کام کرنے والوں نے رکھا تھا۔ یہ نام حامیانِ خلافت اور عام مسلمانوں کی خواہش کے مطابق رکھا کہ انھوں نے ان کو اماں بنایا۔" (۔۔ جامعہ مولانا محمد علی نمبر حصہ دوئم' جنوری و فروری ۱۹۸۰ء بحوالہ روزنامہ خلافت مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۳۲ء' جلد ۱۱' نمبر ۷۳)

(۲) روزنامہ ہمدرد ۱۷ر جون ۱۹۲۷ء آپ بیتی' از محمد علی

(۳) نخبۃ التواریخ مولانا سید آل حسن صاحب عمدۃ المطابع' امروہہ' ۱۸۸۰ء' ص ۱۱۳

(۴) تاریخ امروہہ محمد احمد الہاشمی العباسی' ص ۶۴' تجلی پرنٹنگ ورکس' دہلی۔ یکم اپریل ۱۹۳۰ء۔

(۵) حافظ احمد علی شوق تذکرہ کاملان رام پور' ہمدرد پریس' مارچ ۱۹۲۹ء' ص ۱۳۱

(۶) محمد احمد الہاشمی العباسی تاریخِ امروہہ' ص' ۶۵۔ یکم اپریل ۱۹۳۰ء

(۷) ایضاً ص' ۶۷' ۱۹۳۰ء

(۸) حافظ احمد علی شوق تذکرہ کاملان رام پور' ص ۱۳۱' ۱۹۲۹ء

(۔ راوی خاتون بیگم بنتِ امتیاز علی' خاتون بیگم متوفی ۲۷ر رجب ۱۲۹۵ھ ۷ر اگست ۱۹۷۵ء کراچی)

(۹) ایضاً ص ۱۳۱

(۱۰) ہمدرد ۷ ارجون ۱۹۲۷ء

(۱۱) بی اماں کے خطوط میں تحریر ہے "ہمارے قانونی مشیر مسٹر گھاٹے جو از راہِ شفقت ہماری خط و کتابت کا فرض انجام دیتے ہیں۔ چند اہم خطوط ۔انجمن اعانت نظر بندان اسلام بتاریخ ۱۱ر دسمبر ۱۹۱۷ء ص ۵ پہلا ایڈیشن' بنام مسز بیسنٹ

چنداہم خطوط کے دو ایڈیشن میرے پیش نظر ہیں۔ دونوں میں اکثر عبارتوں کا فرق ہے۔ بی اماں کے خط میں تحریر ہے "یہ خط میں نے مسٹر گھاٹے کی مدد سے لکھا ہے۔" ایضاً ص ۷۔ ۳۔

(۱۲) چند اہم خطوط ص ۷ ۲' انجمن نظر بندان اسلام' دھلی' پہلا ایڈیشن

(۱۳) مولانا محمد علی کے چچازاد بھائی

(۱۴) ماہنامہ جامعہ مولانا محمد علی نمبر حصہ اول' ۸ ۷ ۱۹'ص ۱۳۰۔ 'مولانا کی آپ بیتی'

(۱۵) ایضاً

(۱۶) ہمدرد ۷ ارجون ۱۹۲۷ء

(۱۷) چند اہم خطوط ص ۶۹

(۱۸) ایضاً ص ۱۵۔۱۶

(۱۹) ایضاً ص ۱۷

(۲۰) ایضاً: ص ۸

(۲۱) ہمدرد ۔یکم دسمبر ۱۹۲۶ء مضامین محمد علی محمد سرور' ص ۸۳ 'مکتبہ جامعہ' دھلی۔

(۲۲) ایضاً

روزانہ ہمدرد

بیسویں صدی کے ابتداء میں مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی لہر پیدا ہو چکی تھی ڈھاکہ کی ایجوکیشنل کانفرنس کے بعد ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا دستور اساسی کا بنا اور جداگانہ انتخابات کے مطالبہ کو منظور کرانا اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں مسلمانوں میں سیاسی شعور کو جلا بخشنے اور انگریز سے نفرت کے اظہار کے جذبہ کو ابھارنے میں مسلم صحافت نے تاریخی کردار پیش کیا۔ جس میں مولانا محمد علی کے ہمدرد کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ مولانا صحافت کے ذریعہ ملک وملت کی خدمت کرنا چاہتے تھے اس کا کہنا تھا

"صحافت سے میری غرض صحافت نہیں بلکہ ملک وملت کی خدمت ہے۔"(۱)

محمد علی زیادہ وسیع دائرہ میں رہ کر ملک وملت کی خدمت کرنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے صحافت کے بحرِ ذخار میں قدم رکھا تھا۔

"میں دہلی پہنچا اس وقت میں نے دیکھا کہ اپنے دائرہ عمل کو وسیع کرنے کا موقع ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ میں اردو زبان میں ایک روزنامہ جاری کروں"(۲)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں

"ریاست ہائے رام پور اور بڑودہ میں اچھے خاصے عہدوں پر ملازمت کرنے اور جو جو خدمتیں تفویض ہوتی رہیں انھیں نیک نامی کے ساتھ بجالانے اور چند اور ریاستوں میں ان سے بھی اعلیٰ عہدوں کے دیے جانے مگر مجبوری کی وجہ اسے قبول نہ کرسکنے کے بعد میں نے

دنیائے صحافت میں قدم رکھا۔ اور ملک و ملت کی خدمت کے لئے اس
شعبہ زندگی میں داخل ہوا۔" (۳)

۱۹۱۱ء سے قبل محمد علی کو اخبار کی ایڈیٹری کا تجربہ نہ تھا۔ لیکن محمد علی کا کہنا ہے

"یہ دیکھ کر کہ مسلمان ہندوستان کے پاس ایک اخبار بھی ایسا نہیں جو
صحیح طور پر ان کے خیالات و خواہشات کی ترجمانی یا اصلاح کر سکے میں
نے بسم اللہ و مجرہا و مرسہا کہہ کر صحافت کے بحر دخار میں اپنی کشتی ڈالی
تھی۔" (۴)

محمد علی نے پہلے کلکتے سے ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کو انگریزی میں ہفت روزہ کامریڈ نکالنا شروع کیا
جب کامریڈ نکالنا شروع کیا اس وقت انھوں نے کہا تھا کہ اردو میں بھی ایک روز نامہ شائع
کریں چنانچہ ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء کے ہمدرد میں تحریر کرتے ہیں

"کامریڈ نکالنے کلکتے گیا تھا۔۔۔ اس وقت طے کیا تھا۔۔۔ ایک روز
نامہ اردو میں بھی شائع کیا جائے۔"

صحافتی نظریات

مولانا محمد علی کے ایک شناسا نظام الدین نے گجرات سے ایک اخبار نکالنا چاہا اور محمد علی کو بھی لکھا کہ آپ اس سلسلہ میں مشورہ دیں اس وقت تک وہ بڑودہ میں ملازم تھے۔ لیکن کبھی کبھی ٹائمز میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ مولانا محمد علی نے انھیں صحافت کے لئے مندرجہ ذیل اصول لکھ دیئے۔(۱)

۱۔ "اخبار ذاتیات سے مبّرا ہو نہ کسی دشمن کے خلاف کچھ لکھا جائے نہ خواہ مخواہ دوستوں کی تعریف کے قصیدے گائے جائیں۔

۲۔ کسی شخص یا اخبار کی رائے کے خلاف کچھ لکھنا ہو تو وہ مخالفت محض رائے تک رہے۔ ذات کا حصہ شامل نہ ہو۔

۳۔ جو کچھ لکھا جائے عبارت آرائی کے خیال سے نہیں نہ لوگوں کی چٹکیاں لینے کی غرض سے بلکہ متانت اور نہایت سنجیدگی سے۔

۴۔ جہاں تک ممکن ہو وہی خبریں چھاپی جائیں جو انگریزی ڈیلی چھاپتے ہیں اگر اس سے زیادہ کوئی لوکل یا باہر کی خبر چھاپنی ہو تو اس کے راوی کا ثقہ ہونا سب سے ضروری ہے۔

۵۔ اخبار کا مقصد اپنی قوم کو نفع پہنچانا ہونا چاہئے نہ کہ دوسری قوم کو نقصان پہنچانا۔

۶۔ ایڈیٹوریل نوٹ حال کے واقعات اور خبروں پر اپنی رائے زنی کے لئے ہیں۔

۷۔ ایک مضمون کسی اور کا بھی ہونا چاہئے۔

۸۔ اخبار خبروں کا مجموعہ ہوتا ہے لہٰذا زیادہ تر خبروں کا حصہ ہونا چاہئے مضامین میں ایک ایڈیٹوریل ہو کسی ایسے مضمون پر جو اس زمانہ میں زیر بحث ہو۔ اور یہ مضمون اخبار بھرنے کی غرض سے نہ لکھا گیا ہو۔ بلکہ ایسا ہو کہ جس کا لکھا جانا نہایت ضروری

تھا۔ مضمون پولیٹکل ہو، سوشل ہو، خواہ تعلیمی، خواہ تجارتی۔

۹۔ ایڈیٹوریل نوٹ حال کے واقعات اور خبروں پر رائے زنی کے لئے ہیں۔ خطوط وہی چھاپے جائیں جو واقعی طور پر کسی ضرورت سے لکھے گئے ہوں۔ نہ کہ نامہ نگاروں کی جودتِ طبع کے اظہار کے لئے۔

۱۰۔ ایڈیٹر کو خود تمام مسئلوں پر بحث کرنا اور دوسرے اخباروں اور کتابوں سے واقفیت حاصل کرنا لازم ہے آپ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ روزانہ اخبار کا ایڈیٹر کس قدر سخت محنت کرتا ہے۔ خود مجھے کچھ مصر سے متعلق لکھنا ہے۔ روزانہ اخبار سے بہت سے واقعات معلوم ہوتے ہیں مگر تین کتابیں شروع سے آخر تک پڑھی ہیں تب جاکر ایک دو کالم کا مضمون لکھ سکوں گا۔ اگر قلم برداشتہ لکھنا چاہوں تو بہت آسان ہے مگر پڑھنے والے کو مشکل ہے۔" (۵)

مولانا محمد علی کے سامنے میدانِ صحافت میں جگہ جگہ دقتیں پیش آئیں۔ اور عوام کا مزاج جس طرح کے اخبارات پڑھنے کا عادی ہو چکا تھا محمد علی نے کامریڈ اور ہمدرد کو اس نہج سے الگ نکالا تھا۔ اس لئے کہ وہ اخبارات کے ذریعہ تربیت کر رہے تھے۔ چونکہ ان کے اخبارات تجارتی اصولوں (کمرشل) پر نہیں چل رہے تھے اس لئے ان میں نقصان ہوتا۔ ان کے اخبارات بند بھی ہوئے اور ان کی اشاعت بھی گھٹتی بڑھتی رہی۔ اس کا تفصیلی ذکر آئندہ کیا جائے گا لیکن عوام میں جس طرح کے اخبارات پسند کئے جارہے تھے ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں

> "لوگوں کو وہ اخبارات پسند ہیں جن کا چندہ تو دیا جاتا ہے مگر جن کا اصول صحافت یہ ہے۔ ایک پیسہ لوں گا ایک گالی دوں گا یا جن کی آمدنی کا ذریعہ ان کے گندے اشتہارات ہیں۔ جن کے پڑھنے ہی سے نہیں بلکہ چھاپنے سے بھی بہتوں کا بھلا ہوتا ہے۔۔۔۔۔
> یہ نیوز پیپر نہیں ویوز Views Paper ہیں۔" (۶)

ملک میں ہونے والے فسادات اور صحافیوں کی ذمہ داریوں کے بارے میں محمد علی لکھتے ہیں۔

"فرقہ وارانہ کشیدگی اور آئے دن کے ہندوستان کے مابین فسادات کی سب سے بڑی ذمہ داری ان عاقبت نااندیش صحیفہ نگاروں پر عائد ہوتی ہے جو سادہ لوح عوام کو اپنی گمراہ کن تحریروں سے اکسایا کرتے ہیں۔ اور ان میں فرقہ وارانہ تعصب پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر ملک کے تمام اخبار نویس اپنی ذمہ داریوں کو کماحقہ محسوس کرلیں اور اس قسم کی خبروں اور مضامین کے شائع کرنے سے اعتراض کریں۔ تو ملک میں جو فضا اس وقت ہے اس کے بدلنے پر کچھ دیر نہ ہو اس سے یہ مراد نہیں کہ ہندو اخبار ہندوؤں کی خبریں اور مسلمان اخبار مسلمانوں کے جائز مطالبات کی تائید نہ کریں۔ یا ان کا تحفظ نہ کریں۔ بلکہ عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی جو مذموم کوشش کی جاتی ہے اس سے اجتناب ضروری ہے۔"¹

¹ ہمدرد یکم جولائی ۱۹۲۶ء کشکول صفحہ ۳ کالم ۱

اس طرح محمد علی کے صحافتی نظریات ان کی تحریروں میں کہیں واضح اور کہیں اشاروں کنایوں میں ملتے ہیں۔ کامریڈ کی اشاعت کا مقصد انگریزی داں طبقے اعلیٰ حکام کو ہندوستانیوں کے خیالات سے واقف کرانا تھا۔ اور اردو میں اخبار نکالنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ حضرات جو اردو کے اخبارات پڑھنا پسند کرتے ہیں انھیں انگریز کی ناپاک سازشوں کا اندازہ ہوتا رہے۔ اور جن اسلامی ممالک میں انگریز سازش کرکے اپنا تسلط کرنا چاہتے ہیں ان کی صحیح خبریں عوام تک پہنچ سکیں محمد علی نے ہمدرد و کامریڈ کے علاوہ اپنی تقاریر میں بھی ان موضوعات کو زیر بحث بنایا ہے جن موضوعات کو وہ ہمدرد کامریڈ میں زیر بحث لاتے تھے۔ ہمدرد کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے کے موقع پر انھوں نے الوداع آخر کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا اس میں اخبار کی اشاعت کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"انگریزی ہفتہ وار تو حکومت کی خدمت میں عرض حال کرنے کے
لئے ہو اور ہندستان کی دوسری ملتوں کو بھی ملتِ اسلامیہ کے افکار سے
اس کے ذریعہ سے باخبر رکھا جائے باقی مسلمانانِ ہند کی خدمت میں جو
اس ملتِ مرحومہ کا سوادِ اعظم ہیں۔ ایک روزنامہ اردو میں بھی شائع کیا
جائے۔"(۷)

ہمدرد کی ٹائپ پر اشاعت

مولانا محمد علی ہمدرد کو اردو ٹائپ پر شائع کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کا ارادہ تھا کہ روزانہ ہمدرد کو آٹھ صفحات پر شائع کیا جائے۔ لیکن بیروت سے پورا ٹائپ نہیں آسکا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ہمدرد و کامریڈ پریس دھلی میں قائم ہوا۔ محفوظ علی بدایونی کے بقول حکیم اجمل خاں نے محمد علی سے کہا:

"آج کل خبروں کو بہم رسانی کی سخت ضرورت ہے۔ اگر پورا اخبار نہ
نکل سکے تو صفحے دو صفحے کا ہی نکال دیجئے۔"(۸)

لیکن محمد علی نے تحریر کیا ہے کہ انھیں وقار الملک کا خط ملا تھا۔ کہ ہمدرد کو جاری کیا جائے جنگِ بلقان شروع ہو چکی تھی۔ ٹائپ کی کمی کی وجہ سے ہمدرد کو ابتدا میں ایک ورق پر شائع کرنا شروع کیا گیا۔ چنانچہ ہمدرد کے سلسلہ خاص کا اجرا، ۲۳ر فروری ۱۹۱۳ء کو ایک ورق پر ہوا اس ایک ورق پر شائع ہونے والے ہمدرد پر جلد نمبر کی جگہ 'سلسلہ خاص' لکھا ہوتا۔ اس لئے کہ یہ وہ مکمل ہمدرد ۸ صفحات کا نہیں تھا۔ جسے محمد علی شائع کرنا چاہتے تھے رئیس احمد جعفری نے لکھا ہے:

"ہمدرد کا سلسلہ خاص ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے جاری ہوا۔ یہ پرچہ
روزانہ ایک ورق پر چھپتا رہا"(۹)

محمد علی نے ہمدرد کے سلسلہ خاص کے اجرا کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ ہمدرد نکالنے کا

تقاضا دوست احباب کر رہے تھے۔ اور نہ نکالنے کی صورت میں ناراض بھی تھے دوستوں کو راضی بھی کیا جا سکتا تھا لیکن جب

"قبلہ و کعبہ وقار الملک بہادر مدظلہ کا والا نامہ جو ابھی موصول ہوا ہے ایک ایسی زبردست تحریک ہے جس نے صبر و شکیبائی کے آخری بند توڑ ڈالے۔ اور ہمدرد کو بنیان اور شلوار ہی پہنے خلوت کدہ سے ویسے ہی برہنہ پا دوڑنا پڑا۔"(۱۰)

محمد علی لکھتے ہیں۔

"لوگوں کے اصرار پیہم سے جو کچھ بھی ٹائپ موجود تھا اس سے کام لیا گیا اور ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے ایک ایک ورقہ نقیب ہمدرد بن کر آنے والے ہمدرد کی منادی کرنے لگا۔"(۱۱)

مولانا حالی نے ہمدرد کے اجرا کے لئے رباعی کہی

عزت کی تمنا نہ خطابوں کی طلب — اک قوم کی خدمت کی خواہش ہے یارب

ہمدرد کو اسم بامسمی کیجئیو — اس نام کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہے یارب

"سلسلۂ خاص" کے شمارے کی لوح جسے غلطی سے "نقیب ہمدرد" کہا گیا۔ تفصیلات "نقیب ہمدرد" کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

ہمدرد کی لوح

ہمدرد کی لوح کی پیشانی پر۔۔۔"اعتصمو بحبل اللہ جمیعا" لکھا ہوتا۔ یہ آیت ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے ہمدرد کے آخری شمارہ تک لکھی ہوئی ملتی ہے آیت اس طرح ہے۔۔۔"واتصمو بحبل اللہ جمیعا" لیکن 'و' حذف ہے۔ عبدالملک جامعی مرحوم نے تحریر کیا ہے کہ بعد میں 'و' بھی لکھا جانے لگا تھا۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ اس آیت کے نیچے لوح پر جامع مسجد دہلی کی تصویر ہے۔ اس میں دونوں گول گنبد اس کے برابر ایک لانبا مینار اس سے آدھے سے زیادہ ڈھکا ہوا چھوٹا گول گنبد بعدہ' جنوبی دروازہ کے برج مینار شاہی دروازہ اور بارہ دری نمایاں ہیں اس کے آگے میدان دکھا کر دو کھجور کے پیڑ دکھائے گئے ہیں اس کے نیچے اصل لوح پر روزانہ ہمدرد لکھا ہے ہمدرد کی لوح کسی بہت ماہر خطاط نے لکھی تھی دو چشمی ھا کے ساتھ میم کو ملا کر 'و' تک کشید کیا ہے۔ یہ خطاطی کا ایک لیبا اعلیٰ نمونہ تھا کہ جب سید جالب (۱۲) نے ہمدم میں اس ھا اور کشید کو استعمال کیا تو مولانا نے بڑے پر خلوص انداز میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو تحریر کرتے ہیں

"ہمدم سے میں ہرگز خوش نہیں نہ اس سے زیادہ کی اس سے توقع تھی اس جنگ کے خاتمے پر ایک جنگ اور چھڑے گی اور وہ بھائی جالب سے میری ہوگی۔ بنائے مخاصمت Cacus Belli وہ دو چشمی ھ ہوگی جو ان کے ہمدم کے نیچے لگی ہے خدا کی مار ہو 'ہمدرد' کو اگر اسی نے ہمدم کے قالب میں جنم لیا ہے اور خدا سمجھے میر اکبر حسین۔۔۔ معروف بہ لسان العصر جنھوں نے ہمدرد کی سرخی کو واعتصمو بحبل اللہ جمیعا کے لئے یوں بدلا ہے۔" (۱۳)

لوح کے نیچے تحریر رہتا "جنگ بلقان کی تازہ ترین خبریں اور ان پر تنقید" اس کے بعد داہنے ہاتھ پر ایڈیٹر اور بائیں ہاتھ پر محمد علی لکھا ہوتا (بعد میں جب محمد علی ایڈیٹر نہیں رہے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا نام شائع نہیں ہوا) اس کے بعد لوح کے نیچے دوسری لائن میں سلسلہ خاص یا جلد نمبر اور شمارہ نمبر ہوتا۔
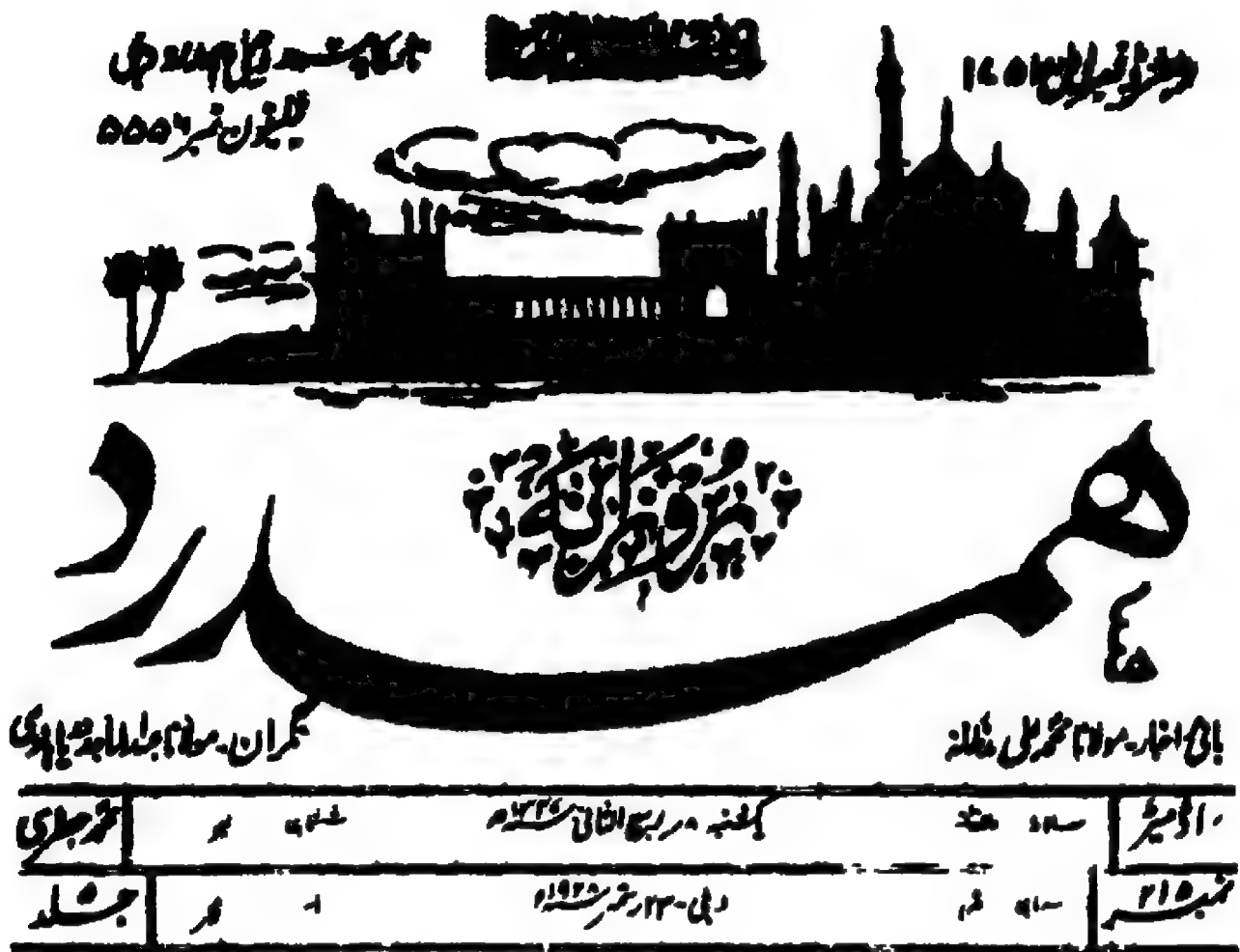
دستخط محمد علی

رجسٹرڈ نمبر ۱۷۵۳ تار کا پتہ مدڈیلی ہمدرد دہلی ٹیلیفون نمبر ۵۵۵۶

روزانہ ھمدرد

بانیٔ اخبار مولانا محمد علی مدظلہ نگران۔ مولانا عبدالماجد دریابادی

اڈیٹر سالانہ یکشنبہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ ششماہی محمدؐ جعفری

نمبر ۲۱۵ سہ ماہی دہلی ۲۳ ستمبر ۱۹۲۸ء ماہانہ شمار جلد ۵

نقیب ہمدرد

عبدالماجد دریابادی مولانا محمد علی کے ساتھ ہمدرد میں شریک کار رہے ہیں۔ عبدالماجد صاحب کے مولانا محمد علی جوہر کے خاندانی مراسم بھی تھے۔ اور ہمدرد کے آخری دور میں ہمدرد کے انتظامی امور مولانا عبدالماجد کے سپرد کئے گئے تھے۔ انھوں نے تحریر کیا ہے

"کچھ عرصے بعد نقیب ہمدرد کے نام سے مختصر سا روز نامہ نکلنے بھی لگا۔"(۱۴)

چونکہ عبدالماجد دریابادی نے 'نقیب ہمدرد' کے شائع ہونے کی نشاندہی کی تھی اس لئے بعض دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی یہی غلطی دہرائی کہ مولانا نے نقیب ہمدرد نام کا اخبار جاری کیا تھا۔ چونکہ عبدالماجد صاحب ہمدرد میں کام کرتے تھے۔ اس لئے نقیب ہمدرد کی روایت کو دیگر تذکرہ نگاروں نے درست سمجھا۔ دراصل اس غلط فہمی کو محمد علی جوہر کی عبارتوں نے اور بھی تصدیق کی منزل کی جانب موڑ دیا جیساکہ مولانا محمد علی نے بھی تحریر کیا ہے

"۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے ایک ایک ورقہ نقیب ہمدرد بن کر آنے والے ہمدرد کی منادی کرنے لگا۔"(۱۵)

ایک بار پھر نقیب ہمدرد کی تکرار کرتے ہوئے مولانا محمد علی لکھتے ہیں

"جو لوگ ہمدرد کے جلوس کا تماشہ دیکھنے لب بام آگئے انھوں نے نقیب ہمدرد کی آواز بھی سنی ہوگی۔"(۱۶)

محمد علی کے مخلصین اور تذکرہ نگاروں نے مولانا کی عبارت پر غور نہیں کیا۔ انھوں نے لکھا ہے "ایک ایک ورقہ نقیب ہمدرد بن کر آنے والے ہمدرد کی منادی کرنے لگا"

چونکہ محمد علی ہمدرد کو آٹھ صفحات پر شائع کرنا چاہتے تھے بیروت سے مکمل ٹائپ نہیں آسکا تھا اس لئے ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے یک ورق پر جو ہمدرد شائع ہوا اسے ہمدرد کا نقیب سمجھا جائے اس لئے کہ یہ ہمدرد نہیں بلکہ اس کی کمی یا ضرورت کو پورا کرنے کیلئے تھا یہ اس کا صاحب وا ہے۔ اس لئے مولانا محمد علی نے اسے اکثر نقیب ہمدرد کہا ہے ملاحظہ ہو

"ترکی قرضہ حسنہ دیئے جانے کے متعلق جب تک نقیب ہمدرد جاری نہیں ہوا تھا ہم اپنے خیالات کامریڈ کے ذریعہ سے مسلمانوں کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔"(۱۷)

محمد علی نے لکھا ہے

"جب بجائے نقیب ہمدرد کے خود ہمدرد ہمارے ناظرین کی خدمت میں حاضر ہوگا۔"(۱۸)

مولانا محمد علی نے نقیب ہمدرد نام کا کوئی اخبار نہیں نکالا جو بلاک ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کی لوح پر روزنامہ ہمدرد کا شائع ہوا ہے وہی لوح کا بلاک ہمدرد کے بند ہونے تک شائع ہوتا رہا ہے۔

فرق یہ ہے کہ ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے شائع ہونے والے ہمدرد پر جلد نمبر کی جگہ سلسلہ خاص لکھا ہوتا یہ ایک ورق پر شائع ہوا ہے اس طرح روزنامہ ہمدرد کے سلسلہ خاص کے ۱۱ر مئی یک شنبہ ۱۹۱۳ء تک ۶۸ شمارے ایک ورق پر شائع ہوئے ۱۳ مئی شنبہ ۱۹۱۳ء سے سلسلہ خاص دو اوراق پر شائع ہوا چنانچہ ہمدرد اپنے اداریہ میں کچھ اپنی نسبت' کے عنوان سے لکھتا ہے۔

"پچھلے ہفتے ٹائپ کے چند بکس اور آگئے اب امید ہوتی ہے کہ آٹھ صفحہ کے لئے ٹائپ کافی ہو جائے گا آج سے امتحاناً ۴ صفحے کا ہمدرد شائع ہوتا ہے۔ ہمارا مقصد ہے کہ یکم جون سے مکمل ہمدرد نکالنا شروع کریں۔"(۱۹)

جلد نمبر کی جگہ ۴ صفحات کے ہمدرد پر بھی سلسلہ خاص لکھا ہوتا یکم جون ۱۹۱۳ء سے ہمدرد ۸

صفحات پر شائع ہوا۔اور اس پر جلد نمبرا اور شمارہ الکھا گیا اس لئے کہ اس سے قبل جو بھی
ہمدرد کے شمارے شائع ہوئے وہ ہمدرد کے 'نقیب' تھے۔یعنی آئندہ آنے والے ہمدرد کی
اطلاع دینے والے یکم جون سے وہ مکمل ہمدرد شائع ہوا جو مولانا آٹھ صفحات پر شائع کرنا
چاہتے تھے۔اس طرح نقیب ہمدرد کی روایت بے بنیاد ہے۔

مولانا محمد علی عبدالماجد دریابادی کو آغاز مئی ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں

> "ہمدرد چار صفحہ کا نکلتا ہے اور انشاءاللہ یکم جون سے آٹھ صفحے کا نکلنا
> شروع ہوگا۔۔۔میں چاہتا ہوں کہ اصل ہمدرد کی ابتدائی پرچوں سے
> آپ کے مضامین نکلنا شروع ہو جائیں۔"(۲۰)

محمد علی آٹھ صفحات پر شائع ہونے والے ہمدرد کو اصل ہمدرد کہتے ہیں اس لئے کہ وہ ہمدرد
آٹھ صفحات پر نکالنا چاہتے تھے اور اس سے قبل شائع ہونے والے ہمدرد کو وہ ہمدرد کا نقیب ہی
کہتے رہے۔یعنی آئندہ آنے والا ہمدرد کی اطلاع دینے والا۔

ہمدرد کا اسٹاف

مولانا محمد علی نے مولانا عبدالحق کو حیدر آباد سے بلوانا چاہا تھا۔ لیکن اکبر حیدری نے انھیں نہیں چھوڑا شرر لکھنوی کا نام تجویز کیا گیا تھا اس سلسلے میں ہاشمی صاحب کا دعوی ہے کہ یہ نام مولانا عبدالحق نے تجویز کیا تھا۔ محفوظ علی بدایونی کا کہنا ہے کہ انھیں میں لینے لکھنؤ گیا تھا۔ بہر حال شرر لکھنوی دھلی آگئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے تحریر کیا ہے

"پریس کے الجھاوے ختم ہونے والے نہ تھے۔ نقیب ہمدرد تو جوں توں نکلتا رہا اصل روزنامہ آٹھ صفحوں والا ملتوی ہوتا چلا گیا شرر صاحب بھی اکتا کر واپس چلے گئے۔"(۲۱)

ہمدرد کا پہلا شمارہ (جسے عبدالماجد صاحب نقیب ہمدرد کہتے ہیں) ۲۳/ فروری ۱۹۱۳ء کو جاری ہوا اور مولانا شرر ہمدرد کے اجرا سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر ستمبر ۱۹۱۲ء میں دھلی پہنچے تھے اور میر محفوظ علی بدایونی تحریر کرتے ہیں

"شرر مرحوم (تین مہینے سے مشاہرہ یاب) تھے۔ اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر وطن (لکھنؤ) واپس چلے گئے۔"(۲۲)

عبداللہ عمادی کو دعوت دی گئی تھی وہ بھی چند دن تاپ کا انتظار کر کے چلے گئے قاضی عبدالغفار صاحب ابتدا سے ہمدرد سے منسلک رہے۔ اور ان کی صحافت کی تربیت مولانا محمد علی کی زیر نگرانی ہوئی۔

قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں

"ہمدرد کی بڑی حد تک ذمہ داریاں مجھ پر اور کامریڈ کی راجہ غلام حسین پر عائد ہو گئیں۔ میں نے کلکتہ سے جا کر وہاں سے 'جمہور' جاری

کیا، اس طرح میں ان سے (محمد علی سے) دور ہو گیا۔ میری صحافت
کلکتے میں بھی کامیاب رہی اور جو کچھ محمد علی سے سیکھا تھا وہی کام
آیا۔"(۲۳)

عبدالماجد دریابادی نے تحریر کیا ہے

"محمد علی کو ایڈیٹوریل صیغے کے لئے قاضی عبدالغفار بی۔اے
مراد آبادی اور سید جالب دھلوی مل گئے۔"(۲۴)

اس طرح انچارج قاضی عبدالغفار اور سید جالب دھلوی سب ایڈیٹر تھے۔ میرے زمانے کی دلی میں ملا واحدی نے تحریر کیا ہے

"۱۹۱۳ء کے آخر یا ۱۹۱۴ء کے شروع سے میر جالب دھلوی کا
تعاون ہمدرد کو حاصل ہو گیا۔ اور ۱۹۱۵ء تک اس کے بند ہونے تک
یہ ہمدرد سے وابستہ رہے۔(۲۵)

سید جالب ۱۹۱۳ء آخر تک سید جالب دھلوی کو ہمدرد میں آگئے تھے۔ سید سلیمان ندوی نے تحریر کیا ہے

"سید جالب کا وجود اگر لکھنؤ میں نہ ہوتا تو۔۔۔اخباری حیثیت سے
لکھنؤ کا کوئی ورن نہ ہوتا۔"(۲۶)

جالب صاحب کو صحافت کا تجربہ تھا وکیل امرتسر پیسہ لاہور اور شریف میں ادارت کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ جالب دھلوی کے علاوہ عارف ہسوی اور قاری عباس حسین گورکھپوری جالب صاحب کے زمانہ میں کام کرتے تھے۔ قاضی عبدالعزیز منصور پوری محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری کے نام بھی ملتے ہیں۔

دیوانہ گورکھپوری نے پہلے اور دوسرے دونوں ہمدرد کے ادوار میں کام کیا دوسرے دور میں چیف ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ فاروق دیوانہ گورکھپوری 'تجاہل آمیانہ' کالم میں مستقل طور پر لکھتے تھے۔

عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ ملفوظات حاجی بغلول، فاروق صاحب لکھا کرتے تھے بزمِ تجاہل آمیانہ میں حاجی بلغ العلی کا نام فاروق صاحب پر چسپاں کیا گیا تھا۔ چنانچہ حاجی صاحب کا شعر ہے۔

بلغ العلی تھا نام میرا اس کو دیکھئے
اتنا مروڑا یاروں نے بغلول کردیا۔

ہمدرد کا دوسرا دور ۹ر نومبر ۱۹۲۴ء سے شروع ہوتا ہے فاروق صاحب ستمبر میں دھلی پہنچ گئے تھے لیکن بہت کم عرصے رہ کر واپس آگئے ان کے علاوہ عبدالعزیز منصور پوری ضیاالدین برنی ہاشمی فرید آبادی احتشام الدین دھلوی عباس حسین دھلوی سید محمد جعفری تھے۔ سید محمد جعفری ہمدرد میں ابتدا سے تھے۔ اور اخر تک رہے موصوف مولانا محمد علی کے سیکریٹری بھی رہے ہیں۔ اور جب ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی نے نئے انتظامات کے تحت ہمدرد سے سبکدوشی حاصل کی اس وقت مولانا محمد علی کا نام بانی اخبار کی حیثیت سے اور سید محمد جعفری کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے شائع ہونے لگا۔ (اس کے بعد مولانا ہمدرد کے لئے لکھتے رہے یہاں تک کہ ہمدرد کو بند کرنے کے موقع پر ۱۲ر اپریل ۱۹۲۹ء میں ان کا ایک بہت اہم مضمون ہمدرد سے متعلق شائع ہوا ہے جعفری صاحب کے علاوہ حسن ریاض خاں عبدالہادی خاں، سعید احمد، مولانا عبدالماجد دریابادی (جو دورِ اول سے تھے اور ۱۹۲۸ء میں ان کا نام نگراں ہمدرد کی حیثیت سے شائع ہوا) سمیع آرٹسٹ اس زمانہ کی بہترین آرٹسٹ اور کارٹونسٹ تھے یہ حضرات بھی ہمدرد سے منسلک رہے سید محفوظ علی بدایونی کا مشورہ اور دونوں اخبارات کے لئے منیجری کے فرائض سید محفوظ علی کے سپرد تھے۔ اس کے علاوہ تجاہل عامیانہ (دیوانہ گورکھپوری کے علاوہ) بھی لکھتے تھے۔ لیکن ۱۹۲۴ء میں ہمدرد کے دورِ ثانی میں یہ نہیں آسکے۔ سید حامد حسین خاں بیدل شاہجہاں پوری بھی ہمدرد سے وابستہ رہے ہیں۔

عبدالرحمٰن صدیقی یہ کامریڈ کے مینجر بھی رہے اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ہمراہ طبی مشن کے ساتھ بھی گئے تھے ان کی حیثیت مشن کے سیکریٹری کی

تھی۔ لیکن کامریڈ کے دورِ ثانی میں یہ نہیں تھے۔

مولانا زاہد علی مولانا شوکت علی کے صاحبزادہ اور مولانا محمد علی کے داماد تھے ہمدرد کے دورِ ثانی میں ہمدرد اور کامریڈ کے لئے لکھتے بھی رہے اور مینیجر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ بعد میں بمبئی سے خلافت اخبار نکالتے تھے۔ اور خلافت ہاؤس لولین روڈ بمبئی میں خلافت اخبار کے دفتر میں رہتے تھے۔ تقسیم وطن کے بعد بمبئی میں رہے۔ ۹ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔

عثمان علی ۔ مولانا شوکت علی کے داماد تھے۔ اور ہمدرد کے حسابات اور انتظام دیکھتے تھے۔

منور علی خاں مولانا محمد علی کے چچازاد بھائی تھے۔ مستقل طور پر ہمدرد کے دورِ ابتدائی سے آخر تک رہے۔ ہمدرد کے مترجم بھی تھے اور کبھی کبھی مضامین بھی لکھتے تھے اور خبریں بھی بناتے تھے۔

ظفر الملک کاکوری کے رہنے والے تھے۔ نام محمد اسحاق تھا' الناظر' رسالہ کے ایڈیٹر اور الناظر بک ایجنسی کے مالک کی حیثیت سے مشہور ہوئے ۱۹۲۸ء میں جب مولانا محمد علی بغرض علاج یوروپ گئے ہیں اور ہمدرد مولانا عبدالماجد صاحب کی نگرانی میں نکلنا شروع ہوا' اس وقت یہ ظفر الملک علوی انتظامی امور کے نگراں بھی تھے۔

ہمدرد کے شمارے

دورِ ابتدائی

۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے یک ورق پر ۱۱ر مئی ۱۹۱۳ء تک سلسلہ خاص ۶۷ شمارے شائع ہوئے۔ (جو غلط فہمی کی وجہ سے نقیب ہمدرد کہلایا) شائع ہوئے۔

۱۲ مئی ۱۹۱۳ء سے دو اوراق پر سلسلہ خاص شائع ہونا شروع ہوا نمبر شمار ۶۸ کی جگہ پروف کی غلطی کی وجہ سے ۴۸ چھپا ۳۱ مئی ۱۹۱۳ء تک کل ۸۵ شمارے نکلے۔ سلسلہ خاص کے یہ شمارے ہمدرد کا دورِ ابتدائی کہلاتے ہیں۔

دورِ اوّل یکم جون ۱۹۱۳ء سے آٹھ صفحات پر ہمدرد شائع ہوا اور اس پر جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱ لکھا گیا ۱۰ر اگست ۱۹۱۵ء کو ہمدرد بند ہو گیا۔ اس دور کو دورِ اوّل کہا جاتا ہے۔

دورِ ثانی ۹۰ر نومبر ۱۹۲۴ء سے ہمدرد کا دوبارہ اجرا ہوا اور اس پر جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱ لکھا گیا۔ ۲۰ر مئی ۱۹۲۸ء کے بعد بحیثیت ایڈیٹر پر محمد علی کا نام شائع نہیں ہوا۔ ۲۱ر مئی ۱۹۲۸ء سے سید محمد جعفری کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے مولانا عبدالماجد صاحب کا نام نگراں کی حیثیت سے اور مولانا محمد علی کا نام بانی اخبار کی حیثیت سے شائع ہوتا رہا۔ یہ دور ہمدرد کا دورِ ثانی کہلاتا ہے ۱۲ر اپریل ۱۹۲۹ء کو ہمدرد ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

ہمدرد چونکہ ٹائپ پر شائع ہوتا تھا اور یہ عوام میں مقبول نہیں تھا اس لئے لیتھو کی اشاعت کے لئے مشین خریدی گئیں محمد علی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں

> "بیروت کا نسخ کا ٹائپ مسلمانانِ ہند میں مقبول نہ ہو سکا تو سال بھر نقصان اٹھا کر میں نے لیتھو کی دو مشینیں خریدیں اور دور جدید سے

رجعت قہقہری کر کے دور حجر کی طرف عود کیا۔ لیتھو کا خط مقبول ہوا
اور اشاعت بڑھنے لگی"(۲۷)

۱۶ر مئی ۱۹۱۵ء کو مولانا محمد علی اور شوکت علی نظر بند کر دیئے گئے۔ اور ہمدرد پر سنسر بٹھادیا گیا تھا۔

قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے محمد علی ــــــ بحیثیت صحافی

"میں کامریڈ کے مضامین پڑھا کرتا تھا اور ان مضامین کے مطلب سے زیادہ انگریزی زبان پر ان کے قلم کی قدرت کو دیکھ کر جھوما کرتا تھا۔"(۲۸)

آگے لکھتے ہیں

"ہمدرد کے شعبہ ادارت میں جب میں ایک ادنیٰ شاگرد بن کر محمد علی کے سامنے بیٹھا تب کہیں ان چنگاریوں کی گرمی میں نے محسوس کی جو کامریڈ کے جواں سال اور بے باک ایڈیٹر کی شخصیت سے نکل کر ان کے نوجوان شاگردوں کو اذیت کوش ہونے کی دعوت دیتی تھیں۔ ایک ادنیٰ شاگرد کی حیثیت سے میں نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔"(۲۹)

ہمدرد کے اسٹاف کے کام کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ شام کو مجلس ادارت کے لوگوں کی ایک مجلس محمد علی کے کمرے میں جمع ہوتی۔ وہ موضوع بتاتے اور موضوع سے متعلق کتب بھی دیتے تھے۔ لکھنے والے کتب پڑھتے اس کے بعد لکھتے تھے۔ بعد میں مولانا مضمون دیکھتے اور اگر ان کے معیار پر پورا نہ اترتا تو دوبارہ لکھنے کے لئے کہتے۔ قاضی عبدالغفار جب ایک مضمون لکھ کر لے گئے مضمون تو مولانا نے چند سطور پڑھ کر مسودہ پھینک دیا۔ قاضی عبدالغفار نے دوبارہ لکھا اداریہ انھیں پسند آیا اور پھر قاضی عبدالغفار کو مولانا نے سینے سے لگا لیا۔ قاضی صاحب کا یہ پہلا اداریہ تھا اس اداریہ کا عنوان مصر تھا اور ۱۰ر جون سے ۱۲ر جون

تک قسطوں میں شائع ہوا تھا۔

خواجہ حسن نظامی نے تحریر کیا ہے۔

"اخبار نویسی میں ان کی نظر بہت بلند تھی۔ ورنہ اردو کے ایک روزانہ اخبار کے لئے انھوں نے جو شاہانہ اہتمام رکھا تھا وہ اردو اخباروں کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا، اُنھوں نے اخبار کا دفتر وائسرائے کے دفتر سے مشابہ بنا دیا تھا۔"(۳۰)

اس میں کوئی شخص نہیں۔ دورِ ابتدائی 'دورِ اول اور دورِ ثانی میں بھی بعض حضرات صرف تنخواہ لیتے مثلاً عبدالحلیم شرر تک دورِ ابتدائی میں تین ماہ تک تنخواہ لیتے رہے اور بعد میں چلے گئے۔ دورِ ثانی میں فاروق صاحب چیف ایڈیٹر تھے۔ لیکن دو ڈھائی ماہ سے انھوں نے زیادہ کام نہیں کیا تھا ابتدائی دور میں بھی وہ اکثر گورکھپور جاتے تھے اور دور ثانی میں محمد علی سے ایڈوانس لے کر گئے، تو واپس نہیں آئے مولانا محمد علی نے لکھا ہے

"فاروق صاحب گورکھپوری ایک ہزار روپے لیکر چل دئے اخبار کو بھی نقصان پہنچایا۔ اور ایک دیوالیہ کا اور بھی دیوالہ نکال دیا۔"(۳۱)

مولانا محمد علی دن بھر دوسرے سیاسی کاموں میں مصروف رہتے اور کبھی کبھی دھلی سے باہر چلے جاتے۔ بلگام کانفرنس میں وہ چلے گئے۔ اور وہاں سے ایکسپریس ٹیلی گرام کے ذریعہ ساڑھے سات کالم کا ایڈیٹوریل بھیجا اس طرح مصارف کا بار بہت زیادہ اخبارات پر پڑ جاتا تھا۔

میرے پیش نظر اس وقت ۱۹۱۳ء کا فائل ہے یہ دورِ ابتدائی کہلاتا ہے۔ اس میں ایک مستقل کالم برقیات 'صفحہ اول پر ہوتا تھا' جو یوروپ سے ٹیلی گرام کے ذریعہ خبریں آتیں برقیات کے تحت شائع ہوتیں۔ اور برقیات کے نیچے عیسائی ذرائع لکھا ہوتا تھا' اصول صحافت میں مولانا نے بتایا تھا

(۱) اخبارات ذاتیات سے مبّرا ہو۔

ان کی صحافت اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

محمد علی کی دیانت دارانہ صحافت اور خبروں کا معیار

مولانا محمد علی ترکوں کے شیدائی تھے۔ انھوں نے زندگی بھر ترکوں کے لئے جنگ
کی یہاں تک کہ ترکوں کی ہار کی خبر سنکر ایک بار خودکشی تک پر آمادہ ہوگئے تھے۔ لیکن ان کی
دیانت دارانہ صحافت کا یہ عالم تھا کہ جنگ کی خبریں خواہ ترکوں کی ہار کی ہوں یا دشمن کی فتح کی
دیانت دارانہ طور پر دیا کرتے تھے۔ جبکہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جس لابی کا
اخبار ہے وہ اس طبقے کی خبریں بڑھا چڑھا کر دیتا ہے۔ برقیات کے عنوان سے ۹ / مارچ ۱۹۱۳ء
یکشنبہ صفحہ نمبر ا کالم نمبر ا میں ہمدرد لکھتا ہے

"یونانیوں نے لڑائی کا نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ انھوں نے اپنا محاصرہ بٹالیا
اور بزانی پر تیس ہزار لوگوں سے شدید گولہ باری کر کے غنیم کو
خاموش کر دیا۔ پیادہ فوج نے بہت بہادری اور سرعت سے بزانی کو
لے لیا۔ اور ترکوں کو بری طرح پسپا کر دیا۔ ترکوں کو دباتے چلے گئے
اور بہت سی توپیں اور قیدی ان کے ہاتھ آئے۔"

جنگ کی بساط کے عنوان سے ۹ مارچ ۱۹۱۳ء کا اڈیٹوریل شائع ہوا ہے اس میں ٹائمس کی ایک
خبر پر تنقید بھی ہے کہ وہ نامہ نگار جو جنگ میں ہے اور خبریں بھیج رہا ہے فوج کی تعداد غلط لکھ
رہا ہے، ترکوں کی محبت میں سرشار ہونے کے باوجود ترکوں کے پیچھے ہٹنے کی خبریں ہمدرد
نے کبھی توڑ مروڑ کر نہیں لکھیں۔ محولا بالا خبر کے علاوہ مندرجہ ذیل خبر ملاحظہ ہو

"ترکی اتحادیوں کو وہ تمام ملک دیگا جو ایک خط مابین میڈیا اور ایوس
کے غرب میں واقع ہے۔ ترکی کریٹ کو چھوڑ دیگا۔" (۴۲)

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی ملک کی فوجیں جنگ میں پیچھے ہٹتی ہوں تو ان سے متعلق

اخبارات اکثر پروپگنڈا کرتے ہیں کہ ہماری فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں لیکن محمد علی کا نظریہ تھا کہ صحیح سیاق وسباق کی روشنی میں عوام تک خبریں پہنچائی جائیں "اور نہ دشمنوں پر بیجا حملہ ہو اور نہ دوستوں کے ترانے گائے جائیں۔" ہم دیکھتے ہیں کہ ہمدرد کی خبریں اس اصول پر پوری اترتی ہیں۔ مولانا کا نظریہ تھا ہر خبر کو ذمہ داری کے ساتھ تصدیق کے بعد لکھنا چاہیے۔ مولانا کو جو غیر ملکی خبریں ملتیں وہ احتیاط کے طور پر ان پر یورپ یا عیسائی ذرائع لکھتے تھے اور جو خبریں انھیں اسلامی ممالک سے ملتیں تھیں ان پر اخبارات کا نام یا اسلامی ذراع لکھا ہوتا تھا۔

ملاحظہ ہو

"آستانہ ۹ ر مارچ ماہِ رواں کی ۶ ر مارچ کو ترکوں نے کارا چلے کے مقام پر جو بلیر کے قریب واقع ہے دشمن کے نظامِ فوج پر حملہ کر کے اسے سخت نقصان پہنچایا۔" (۲) (الحرام ۱۵ ر مارچ ۱۹۱۳ء)

سن ۱۹۲۶ء کے شماروں میں صفحہ اوّل پر شمارہ ۱۰۷ میں گاندھی جی کی خودنوشت سوانح کی ۲۱ ویں قسط شائع ہوئی ہے، عنوان ہے 'ربل کے بل رام' (یہ سور داس کا ایک مصرع ہے جس کا مطلب ہے کہ رام ہی بے کسوں کا سہارا ہے ایڈیٹوریل ایک عالمگیر امن وسکون کے عنوان سے شائع ہوا ہے، ممالک غیر کے عنوان سے دوسرے ممالک کی خبریں شائع ہوئیں ہیں۔ مثلاً جاور کا وفد ارض مقدس میں سلطان ابن سعود سے تبادلہ خیالات' ڈنمارک میں ہڑتال کب ہوگی :

جناح کی کانگریس میں شرکت .

مسٹر جناح کی کانگریس میں شمولیت کے سلسلہ میں خبر شائع ہوئی ہے اپنی صدارت کے زمانے میں مولانا محمد علی چاہتے تھے کہ جناح بھی کانگریس میں شامل ہو جائیں۔

شمول کانگریس کی توقع

"۲۲ر نومبر کو بمبئی میں جو کانفرنس لیڈروں کی ہونے والی ہے اس کے بعد مسٹر جناح نے فرمایا کہ میں کانگریس میں شامل ہونے یا نہ ہونے کے متعلق رائے قائم کر سکوں گا مجھ سے زیادہ کوئی ایک متفقہ اور متحدہ انڈین نیشنل کانگریس کا متمنی اور آرزو مند نہیں ہو سکتا۔"(۳۴)

بغیر سرخی کی خبریں

ہمدرد سلسلہ خاص میں صفحہ نمبر ا' پر برقیات کے عنوان سے مختصر خبریں شائع ہوتیں یہ خبریں بذریعہ ٹیلی گرام یا خط کے ذریعہ حاصل کی جاتیں۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۱۳ء کا ہمدرد صفحہ نمبر ا کالم نمبر ا' برقیات کے تحت لکھتا ہے

"ایک ترکی سرکاری مراسلت میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ترکی پیادہ فوج کو ایک شدید معرکہ کے بعد چنالجہ میں فتح حاصل ہوئی ہے اس مراسلت میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ ترکی کی افواج خط مدافعت کے ہر مقام پر غنیم سے برسیر پیکار ہیں۔"

"صوفیا کا ایک تار مظہر ہے کہ چنالجہ میں ترکوں کی ۵ ڈویژن فوج مع توپخانہ اور رسالہ کے جو مصافی (یہاں دیمک کی وجہ سے لفظ کٹا ہوا ہے اور پڑھنے میں مصافی آتا ہے) جہازوں کی اعانت میں آگے بڑھنا چاہتی تھیں نقصان کبیر کے ساتھ پسپا کر دی گئیں۔ ان میں سے دو بٹالین پیچھے ہٹتے ہٹتے ساحل تک پہنچیں۔ اور ان میں کا ایک حصہ رات کے وقت جہازوں میں سوار ہو کر نکل گیا۔"

۱۹۱۳ء ہمدرد کے سلسلہ خاص میں محو بالا خبروں میں سرخی نہیں دی گئی ہے جیسے کہ مذکورہ بالا خبروں سے ظاہر ہے برقیات عنوان قائم کرکے 'ملک کے حوالے سے خبریں مختصر طور پر تحریر کی گئی ہیں اور یہی طریقہ ذیل کی خبروں میں بھی روا رکھا گیا ہے :

"لندن ۵ر مئی۔ یہ شہرت کہ اٹلی اور آسٹریا البانیہ کو تقسیم کرینگے سیاسی حلقوں میں محض لغو کہی جاتی ہے۔ اٹلی اور آسٹریا دونوں کو یہ

پسند ہوگا کہ البانیہ خود مختار ہو جائے۔"

"دارالعلوم میں آج مسٹر اسکویتھ وزیر اعظم برطانیہ نے مانسیٹی نیگرو کی اطاعت کرنے کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ شاہ نکولس مبارک باد کے مستحق ہیں نہ صرف اپنی ملک کے لئے بین القوامی امن کی خاطر بھی یعنی انھوں نے نہ صرف اپنے ملک کو بلکہ یوروپ کے امن میں بھی رخنہ انداز ہونے سے پرہیز کیا۔"

مدینہ یونیورسٹی کا قیام اور علی برادران (۱)

مدینہ میں ایک یونیورسٹی کے سلسلہ میں مولانا محمد علی اور بالخصوص مولانا شوکت علی کوشاں تھے۔ اس سلسلے میں مختلف اوقات میں مختصر خبریں شائع ہوئی ہیں چنانچہ اپریل ۱۹۱۳ء میں شاہ نے بھی یونیورسٹی کے قیام کے لئے طے کر لیا۔ اس مدینہ یونیورسٹی کا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم علامہ اقبال' مولانا شبلی اور پروفیسر حمید الدین نے مرتب کیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہمدرد نے اپنی مختلف اشاعتوں میں خبریں شائع کی ہیں مولانا کے اخبار کامریڈ کو ۱۱ر اپریل ۴ بجکر ۵۰ منٹ پر استانبول سے ایک تار دیا گیا تھا

قسطنطنیہ کا تار

(یہ تار کامریڈ دھلی ۲۰ر اپریل ۴ بجکر ۲۰ منٹ پر موصول ہوا۔)

ایک ارادۂ سلطانی شائع کیا گیا ہے۔ کہ مدینہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اب عربی صوبوں میں عربی زبان ہی سرکاری طور پر ذریعہ تعلیم قرار دی گئی ہے۔ (۳۴)" شیخ شاہ ویش ۱۴ر مئی ۱۹۱۳ء ہمدرد سلسلہ خاص نمبر ۷۰ برقیات کے تحت لکھتا ہے

استانبول۔ مرسلہ ۱۲ مئی وقت ۴ بجے شام موصولہ ۱۳ر مئی وقت صبح ڈاکٹر اقبال (پروفیسر) حمید الدین اور مولانا شبلی کی شرکت سے مدینہ یونیورسٹی کا نظام ترکیبی اور نصاب تعلیم فوراً تیار کیجئے بعد تیاری بذریعہ تار اطلاع دیجئے شیخ شاہ ویش' ڈاکٹر انصاری' ظفر علی خاں'

مہاتما گاندھی

مہاتما گاندھی کا بیان

"مہاتما گاندھی نے ایسو سی ایٹڈ (Associated) پریس کو بیان دیا ہے جس پر انھوں نے اس خبر سے انکار کیا ہے کہ انھونے چرخہ کاتنے کی شرط کو واپس لینے پر رضامندی ظاہر کی ہے یا سوراج کے یہ معنی اختیار کرنا چاہتے ہیں کہ سوراج صرف امپائر (سلطنت برطانیہ) کے اندر ہونا چاہئیے۔ بلکہ بر خلاف اس کے انھوں نے مسٹر چنتا منی اور دوسرے لوگوں سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان لوگوں کو کانگریس میں شریک ہوکر کوشش کرنا چاہئیے کہ ان کی رائے منظور ہو جائے۔"(۳۶)

خلیفۃ المسیح اور مہاتما گاندھی کی ملاقات

ہم کو بمبئی سے اطلاع ملی ہے کہ جناب مرزا بشیر الدین محمود صاحب جو جماعت احمدیہ کے پیشوا ہیں اور خلیفۃ المسیح کے لقب سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ ولایت سے واپس ہونے کے بعد چند گھنٹوں کے واسطے مہاتما گاندھی ملنے کے لئے تشریف لائے۔ اس وقت اگرچہ بہت سے اصحاب موجود تھے لیکن مہاتما گاندھی ان سے الگ کمرے میں ملنے کے لئے اٹھ آئے۔ اس صحبت میں مرزا صاحب موصوف مفتی محمد صادق صاحب اور مولوی ذوالفقار علی صاحب جماعت احمدیہ میں سے اور مولانا شوکت علی و مولانا محمد علی و مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ اشخاص میں سے موجود تھے۔ خاص گفتگو کانگریس کے عقیدے کے متعلق تھی۔ چونکہ جماعت احمدیہ کو ترک موالات کے موجودہ اصول اور طریق پر اعتراض ہے اس لئے مرزا صاحب اپنی جماعت کو شرکت کانگریس کی ترغیب نہیں دیتے لیکن مہاتما

گاندھی کی گفتگو سے جب یہ ثابت ہوا کہ کانگریس کا عقیدہ صرف حصول سوراج ہے اور مختلف جماعتوں کو اختیار ہے کہ طریقہ حصول سوراج پر اختلاف کر سکتی ہیں۔
نیز اس بات کی بھی کوشش کر سکتی ہیں کہ کل کانگریس کو ایسی رائے پر چلنے کی ترغیب دیں تو مرزا صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کانگریس کے کانسٹی ٹیوشن کو دیکھنے کے بعد وہ غور کریں گے۔ کہ کس حد تک ان کے نقطہ نظر سے وہ قابل عمل ہے۔ اگر کوئی قابل اعتراض نہ ہو تو وہ اپنی جماعت کو بھی شرکت کی اجازت دیں گے۔"(۳۶)
مولانا محمد علی نے بیانات شائع کئے اور انھوں نے مختلف جماعتوں سے اپیل کی کہ وہ سوراج کی مانگ کے طریقہ کار اپنے نظریہ کے سلسلے میں کانگریس کو مشورہ دیں چنانچہ ہمدرد میں محمد علی نے ایک اپیل شائع کی

مولانا محمد علی

مولانا محمد علی صاحب

مجھے اپنی غلامی کے احساس کا غلبہ دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے اور تاوقتیکہ کہ ان تمام جماعتوں کو جو سوراج حاصل کرنا چاہتی ہیں نہ بلائیں۔ ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم ان غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہوں۔

میں نے مہاتما گاندھی سوراج پارٹی کے لیڈران اور اپنے چند احباب کے مشورہ سے تمام سیاسی جماعتی اور فرقوں کے نمائندوں کو دعوت دی ہے کہ وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اپنے مشورہ ور ہنمائی سے مدد فرمائیں گے۔ مجھے پوری امید ہے کہ ہم ایک سمجھوتہ پر پہنچ جائیں گے۔ اور جو اتحاد اس طرح سے قائم ہوگا وہ صرف عمل کا نہ ہوگا۔ بلکہ عمل راسخ اور ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کی مسلسل جدوجہد کا اتحاد ہوگا خدا اپنی ہدایتوں سے ہماری مدد کرے کہ ہم متفق ومتحد ہو سکیں اور آزاد ہو سکیں۔"

اس کے بعد ۲۶ ار نومبر ۱۹۲۴ء میں پھر ہمدرد نے مرزا صاحب پر ایک طویل کالم لکھا ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ چونکہ وہ کانگریس کے پروگرام سوراج پر غور کر رہے ہیں اس لئے امید ہے کہ وہ اپنی قوم کو اس پروگرام میں شرکت کی اجازت دیں گے۔

۱۸ ار دسمبر ۱۹۲۴ء کے ہمدرد میں جنگ بہادر سنگھ کی ہندی کی نظم اردو رسم الخط میں شائع ہوئی ہے

کو جانے تھا ولایت سے یہاں فرنگی آویگا
کو جانے تھا حکمت کرکے ہندوستان دبا دیگا
کو جانے تھا راج سیکھن کا بھی اس کے بس آویگا
کہے گمانی ہر انچھا کا کوئی پار نہ آوے گا۔

حکیم اجمل خاں کی وفات اور خطاب واپس کرنا

ہمدرد یکم جنوری ۱۹۲۸ء جلد نمبر ۵' نمبر ا' حکیم اجمل خاں کی وفات کی خبر شائع ہوئی ہے۔ڈاکٹر سعید احمد خاں سعید کا منظوم خراج عقیدت کے علاوہ مسیح الملک کی سوانح حیات بھی ہمدرد نے شائع کی ہے جہاں اس میں حکیم صاحب کے طبیہ کالج' زمانہ طبیہ کالج خلافت اور کانگریس میں ان کی شرکت' انگریزی حکومت سے تعلقات کا ذکر ہے وہاں پر ترک موالات کے سلسلے میں یہ بھی مندرج ہے کہ انھیں حاذق الملک کا خطاب اور ۱۹۱۵ء میں انھیں قیصر ہند کا تمغہ ملا تھا۔لیکن فوری بعد یہ بھی تحریر ہے کہ حکیم صاحب نے ترک موالات کے سلسلے میں اپنے خطابات واپس کر دیے۔ہندوستان میں مختلف حضرات کو اسی زمانہ میں خطابات بھی خان بہادر اور رائے بہادر' کے حکومت نے عطا کئے تھے ہمدرد نے ایسے تمام حضرات کے نام دیے اور سرخی لگائی۔

'خطابات سالِ نو حکومت کی غلامی کے تمغے اور انعامات'

۳۰ر جنوری ۱۹۲۸ء کو ڈاکٹر سید احمد بریلوی کی نظم ہڑتال کرو ہڑتال شائع ہوئی ہے۔(۳۷)

۸ر جنوری ۱۹۲۸ء کو مولانا محمد علی کا مضمون آہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں پر شائع ہوا ہے یکم جنوری ۱۹۲۸ء کو مہاتما گاندھی کا تعزیتی پیغام شائع ہوا ہے۔

۲۱ر مارچ ۱۹۱۳ء کو شاہ یونان کو اس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ شہزادہ نکولس اپنے بیٹے کے ہمراہ محل سے سہ پہر کو ہوا خوری کے لئے نکلے ان کی عادت تھی کہ وہ ٹہلنے تنہا جاتے تھے اور سیکورٹی ساتھ نہیں رکھتے تھے کرنل فرنگودس شاہی ایڈیکانگ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ایک یونانی الیکو شناس نے ان پر حملہ کر دیا' دو فائر کئے کرنل فرنگودس نے اسے دبوچ لیا

اس کے ہمراہ دو ساتھی اور بھی تھے انھوں نے بھی فائر کیئے ہسپتال جاتے ہوئے انھوں نے دم توڑ دیا۔

یونان کبھی ترکی کے ماتحت تھا لیکن آزادی حاصل کرنے کے بعد سے ہمیشہ اس نے ترکوں سے دشمنی کی شاں بے انتہا مغرور تھے ٹہلتے ہوئے وہ حملے کے وقت اپنے منھ سے یہ الفاظ ادا کر رہے تھے۔

"کل میں ضابطے کی ملاقات کے لئے جرمنی دریڈناٹ جہاز گیبن میں جاؤں گا۔ اور مجھے بڑی خوشی اور تسلی ہوتی ہے کہ ایک جرمن فوجی سلونیکا میں یونانی بادشاہ کی اس طرح عزت کرے۔" (۳۸)

(اس لئے کہ جنگ میں جرمن کے مقابلہ یونانیوں کی کامیابی ان کی ترقی کی سب سے اونچی سیڑھی تھی) شاہ یونان ترکوں پر مظالم بھی کرتے۔ محمد علی ترکوں کی محبت میں سر شار تھے۔ لیکن ان کی دیانت دارانہ صحافت کا یہ عالم تھا کہ محمد علی نے شاہ یونان کے بارے میں پانچ کالمی صفحہ اول پر خبر شائع کی جو معاصرین اخبار کی نسبت سے سب سے زیادہ مفصل تھی۔ اور شاہ کے بارے میں خبر میں ایک جملہ ایسا بھی نہیں تھا جو ان کی تحقیر کرتا۔

اخبار کے ایڈیٹوریل میں چونکہ حالت حاضرہ پر تبصرہ ہوتا ہے۔ اور ایڈیٹر اپنے نظریات بھی رکھتا ہے اس لئے اس میں اس کے نظریہ کی چھاپ ہوتی ہے۔ ۲۱ر مارچ ۱۹۱۳ء صفحہ ۲' پر ہمدرد سلسلہ 'خاص نمبر ۲۵' پر اپنے اداریہ میں بعنوان شاہ یونان آنجہانی ' کے عنوان سے لکھا ہے۔

"یونان ترکی کی حکومت ۔۔۔ اور مسلمانوں پر جو جو مظالم توڑ رہا ہے ۔۔۔ اسے یاد کر کے انتقام کا جزبہ جو انسان کی میراث ہے تقاضہ کرتا ہے کہ شاہ یونان کی موت پر جس قدر مسرور ہوں تھوڑا ہے۔ مگر ہمارا مذہب جس نے ہمیں مکارم اخلاق کی معراج پر پہنچنے کے لئے سب سے پہلا سبق دیا ہے۔ ہمیں ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ موت چاہے مخالف کی ہو ہمیں خوشی کرنی چاہیئے۔"

ہمدرد کے اداریئے

مولانا محمد علی کا نظریہ تھا کہ ایڈیٹوریل یا مضمون لکھنے کے لئے وسیع معلومات کا ہونا ضروری ہے۔اور اس کے لئے ایڈیٹر کو موضوع سے متعلق پڑھنا چاہئے مولانا کا کہنا تھا ''اخبار کالم بھرنے کے لئے نہیں بلکہ معلومات کو بڑھانے کے لئے ہوتا ہے''اصول صحافت میں ان کے ان خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ہمدرد کے اداریوں سے تحریر کرنے والے کی وسیع معلومات،علمی اور سیاسی نظر اور مطالع کی وسعت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ہمدرد کے اور مضامین پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اداریہ لکھنے سے پہلے مدیر نے موضوع سے متعلق کتب پڑھی ہیں۔یوروپ کے کچھ ملک الگ ہوگئے تھے اس میں سے تین اتحادی تھے اور تین مخالف ان کی تفصیل بتانے اور تعارف کرانے کی غرض سے مولانا محمد علی نے اتحاد اُتلاف ثلاثہ کے عنوان سے ۸ اراپریل ۱۹۱۳ء کو اداریہ لکھا ہے۔

پہلے اس موضوع پر لکھنے کی غرض و غائت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو داں عوام اکثر سیاست سے دور کی روشناسی رکھتے ہیں اس لئے روس اور آسٹریا کے تعلقات کی تھوڑی سی تشریح کردی تھی۔ہمدرد آگے لکھتا ہے

> ''اتحاد اُتلافِ ثلاثہ میں یوروپ کے چھ اول عظمیٰ شامل ہیں۔اتحادِ ثلاثہ کے ارکان جرمنی آسٹریا اور اٹلی ہیں۔اور اُتلاف ثلاثہ میں انگلستان روس اور فرانس شریک ہیں۔گو اتحادِ ثلاثہ میں جرمنی شریک غالب مانا جاتا ہے مگر جرمنی اور آسٹریا کی تاریخ اتنی دور تک جاتی جتنی کہ اٹلی کی تاریخ جاتی ہے۔اگرچہ موجودہ حکومت اٹلی کو قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔۔۔اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اٹلی کوئی ملک

نہیں۔ بلکہ یہ ایک جغرافیائی اصطلاح ہے تاریخ عالم میں جو حصہ رومتہ
الکبرا کی تاریخ کا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ روما کا اوّلین طرز حکومت
شاہانہ تھا۔ مگر تار کوئن مغرور کے مظالم کی وجہ سے رعایا نے اسے
معزول کر دیا اور جلا وطن کر دیا۔ اور اس کے بعد جمہوری سلطنت قائم ہوئی۔"

اس عبارت کے بعد روما کے دورِ حکومت کو تقسیم کرتے ہوئے سنین کی نشاندہی
کی گئی ہے۔ ہمدرد لکھتا ہے

"یہ روما کی حکومت کا پہلا دور تھا دوسرا دور سنہ ۵۰۹ قبل مسیح سے لے
کر ۲ قبل ولادت مسیح تک رہا جو روما کی جمہوریت کا زمانا ہے اس کے
بعد روما کا تیسرا دور شروع ہوا جس کا آغاز جولیس سیزر مشہور قونصل و
جنرل کے بھانجے اور وارث اگسٹس سے ہوتا ہے اس تیسرے دور میں
شہنشاہ کانسٹنٹائن نے خود مذہب عیسوی قبول کیا۔ اور اس کو سلطنت
روما کا مذہب قرار دیا۔ اور قسطنطیہ میں ایک نیا پائے تخت قائم کیا مختلف
اوقات میں چند وہ غیر متمدن قومیں جن کو روما والے وحشی کہتے
تھے۔ آباد کی گئی تھیں چوتھی صدی عیسوی کی آخر سے رفتہ رفتہ ان
وحوش کی قوت بڑھتی گئی۔ اور وہ روما کے مختلف حصوں پر قابض
ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ خود شہر رومتہ الکبریٰ انھیں کے ہاتھوں
تخت و تاراج ہوا انھیں وحوش میں سے ایک سردار رومتہ الکبریٰ
سلطنت کا شہنشاہ ہوا۔۔۔ ہمیں اس مقام پر روما کے مشرقی حکومت
سے بحث نہیں۔ جس پر اب ترک حکمراں ہیں۔۔۔ سنہ ۴۷۶ میں
رومتہ الکبریٰ کے وحشی شہنشاہ نے مغربی حصہ ملک کو مشرقی روما کے
شہنشاہوں کے زیرِ حکومت کر دیا۔" (جہاں پر ترک تھے)

لیکن ایک طویل عرصے تک روما کی سلطنت کبھی ان وحشیوں کے زیرِ حکومت ہوتی اور کبھی

اٹلی کے صوبے لومبر دی کو خاص اقتدار حاصل ہوتا، ان وحوش کی اکثریت عیسائی ہو چکی تھی ان کی طاقت بڑھتی رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ پوپ اور اس قوم کے سردار شارلمین کے درمیان سمجھوتا ہو گیا۔ اور ۸۰۰ء میں شارلیمن نے روما کی شہنشاہی کا ایک نیا دور قائم کیا اور یہی قومیں یوروپ میں کثرت کے ساتھ حکمراں رہیں۔"

مولانا محمد علی نے اتحادِ اُتلافِ ثلاثہ کے تحت تین طویل قسطوں میں یہ مضمون (ہمدرد ۸ر اپریل ۹ر اپریل اور ۱۱ر اپریل ۱۹۱۳ء) میں لکھا اس مضمون اور اس طرح کے دیگر ہمدرد کے مضامین کو پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد علی نے ہمدرد میں جو بھی اداریہ لکھے ہیں ان موضوعات پر یا تو ان کی پہلے سے ان موضوعات کی معلومات تھیں یا با قاعدہ کتب پڑھ کر مضامین لکھے گئے ہیں اور موضوع سے متعلق کافی معلومات فراہم کر کے قلم اٹھایا ہے۔ اس طرح ان کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ ایڈیٹر کو موضوع سے متعلق پڑھ کر لکھنا چاہیئے۔ (۳۹)

مذکورہ مضمون میں انھوں نے شارلیمن کی بیٹی کی وراثت کی تعلیم کے بارے میں لکھا ہے:

"شارلیمن کی بیٹی نویس کے بعد جب سلطنت اس وحشی قوم کے دستور کے مطابق ۸۴۳ء میں تقسیم ہوئی تو سب سے چھوٹی بیٹی چارلس کو وہ حصہ ملک ملا جو بعد میں جا کر فرانس کہلایا۔ اس کے بڑے بیٹے نویس کو وہ حصہ ملا جس میں جرمنی اور آسٹریا شامل ہیں۔ بڑے بیٹے لوتہار کو ایسا حصہ ملک ملا جو سب سے کمزور ثابت ہوا۔ اس میں اٹلی کا شمالی حصہ بھی شامل تھا۔ مگر چونکہ فرانس اور جرمنی کا بھی ایک حصہ ان حصوں میں اجتماع نہ ہو سکا۔"

مولانا ہمدرد کی خبروں اور خبروں کا تبصرہ سے دو کام لے رہے تھے ایک تو جنگ کی صحیح صورتِ حال سے اردو داں طبقے کو باخبر رکھتے تھے دوسرے عیسائی ذرائع سے موصول شدہ خبروں کا تجزیہ منطقی اور استدلالی طور پر ہمدرد میں کرتے تھے ان کے اس طریقہ کار سے

انگریز کی دروغ گوئی اور اس کا کردار سامنے آرہا تھا مثال کے طور پر ۹، مارچ ۱۹۱۳ء نمبر ۱۵ سلسلہ خاص صفحہ نمبر ۲ کالم نمبر ۴' ہمدرد رپورٹنگ کرتا ہے ۔

"ڈاکٹر دیجیف کا بیان ہے کہ بلغاریوں کے پاس اس وقت ساڑھے پانچ لاکھ فوج میدان جنگ میں ہے سرویا کے پاس تین لاکھ فوج ہے۔ جس میں ۴۵ ہزار ایڈریانوپل کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ جب جنگ چھڑی تھی تو ٹائمس کے نامہ نگار نے بیان کیا تھا کہ لڑائی کے وقت بلغاری فوج چار لاکھ تک پہنچ سکتی ہے اور سرویا کی فوج تین لاکھ تک اگر یہ مان لیا جائے کہ ان ملکوں میں ایک بھی سپاہی نہیں چھوڑا گیا ہے تب بھی ریاضی کے نئے اصول ایجاد کرنے پڑیں گے جس سے ثابت ہو سکے کہ تین لاکھ فوج کتنے مرنے کے بعد بھی تین لاکھ رہی۔ توپ خانے خاموش ہیں اور سپاہیوں کے لئے سقوطری کے جانباز ترکوں تک راستہ صاف ہے۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ترکوں کی فوج جو اس تعداد کے مقابلہ مٹھی بھر ہے کیوں اب تک نیست ونابود نہیں کر دی گئی سوال یہ ہے کہ میں سخت جان ہوں یا تیرے ہاتھوں میں دم نہیں۔۔۔"

انجمنِ خدّام کعبہ

ہمدرد کی کوششوں سے مسلمان متحد بھی ہو رہا تھا اور اس میں سیاسی بیداری بھی پیدا ہو رہی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں انجمن خدام کعبہ کے قیام کا مقصد حرم شریف کا تحفظ تھا۔ اس کے قیام کے سلسلہ میں قبلہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے 'لکھنؤ کے دولت کدے پر ایک جلسہ منعقد ہوا اس پر علما نے بحث مباحثہ کے بعد انجمن کے قیام کی روداد پاس کی اور اس کا دستور العمل مرتب کیا اس دستور میں یہ طے کیا گیا تھا

> "اس انجمن کی اصل غرض حرم محترم کی حرمت کا برقرار رکھنا اور دنیا کے سب سے پہلے مرکز توحید حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے تعمیر کے لئے ہوئے خانۂ خدا کی ہر قسم کی خدمات بجالانا اور اس کو غیر مسلم ہاتھوں سے محفوظ رکھنا ہے۔۔۔" (۴۰)

ہمدرد نے انجمن خدام کعبہ کے اس نصب العین کو بنیاد بنا کر نہ کے عرب دنیا کی خبریں شائع کیں بلکہ حرم کی اہمیت اس کے تحفظ اور حرم شریف کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کے فرائض انھیں یاد دلا کر انھیں متحد بھی کیا۔ ان مضامین کی اشاعت خدامِ کعبہ انجمن کے قیام اور قبلہ عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا محمد علی کی کوششوں سے علما خانقاہوں اور عربی مدارس سے باہر نکل پڑے در ملی اور ملکی مسائل میں قلمے سخنے حصہ لینے لگے۔ ہمدرد علما کے ان محرکات کی خبریں شائع کرتا تبصرہ کرتا اور مسلمانوں کو ان کے حقوق یاد دلاتا جس سے عام مسلمان میں جمود کی جگہ بیداری پیدا ہوئی۔ اور اس بیداری اور اتحاد کا رخ ہندوستان کی مکمل آزادی کی مانگ کی جانب مڑ گیا۔

اخبارات کا مقصد : مولانا کا کہنا تھا کہ بغیر کسی عقیدے کے صحافت بیکار ہے۔ صحافی کا اپنا

مکہ : ۱۸۹۰ (بشکریہ اسلامک وزٹرس بیورو)
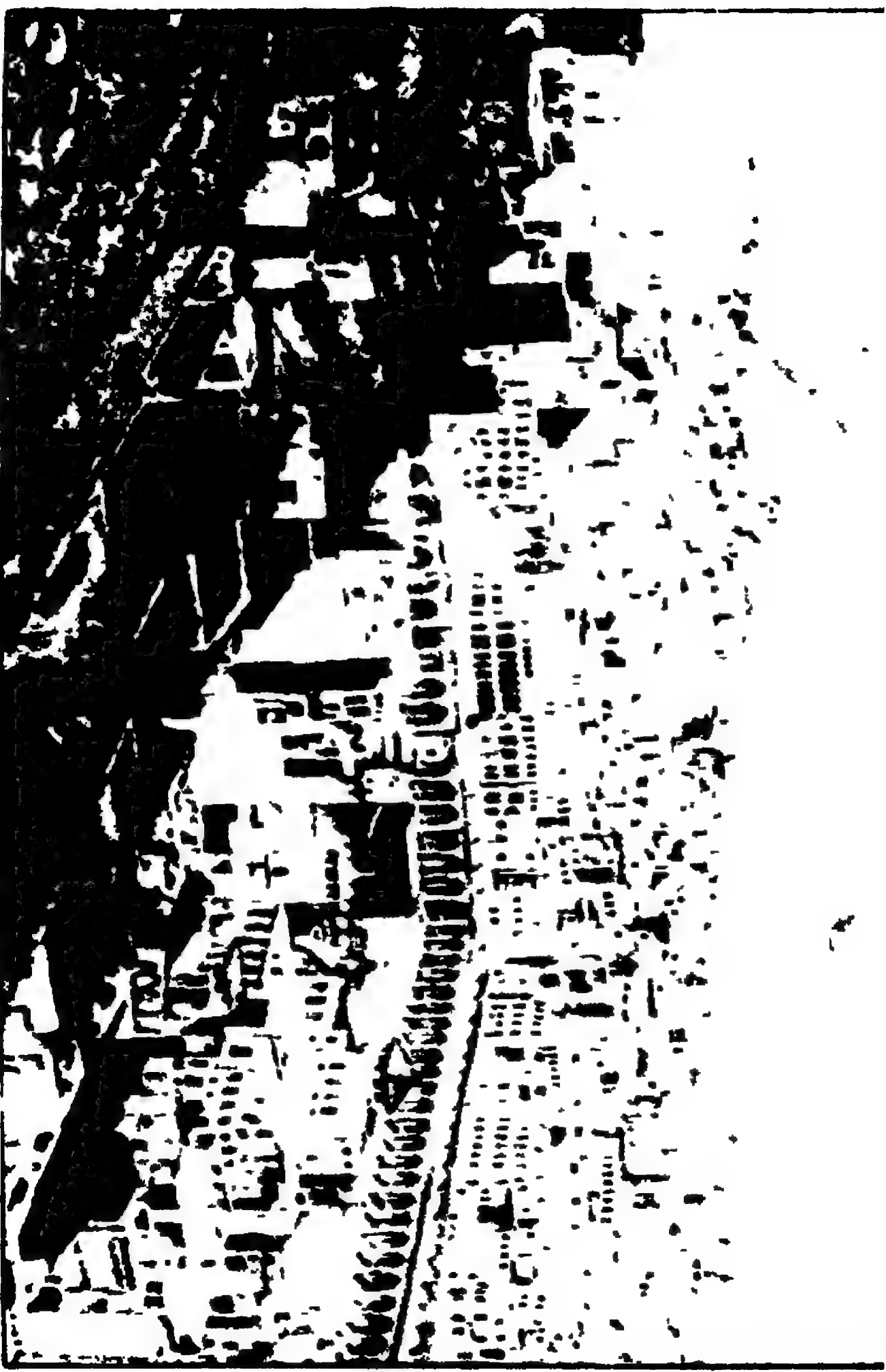
نظریہ اور اور نصب العین ہونا چاہیئے۔اور مولانا نے اپنے اس نظریہ کی وجہ سے ہمدرد اور کامریڈ کو خسارہ میں چلانا پسند کیا لیکن تجارتی اصولوں پر اسے چلانا نہیں پسند کیا۔انھوں نے عبدالماجد دریابادی کو ۲۴ر اپریل ۱۹۲۴ء کو اپنے ایک خط میں تحریر بھی کیا تھا .

"میں مضمون لکھ کر ہی اگر روٹی کماتا یعنی اس کی تجارت کرتا تو انگریزی اخبارات کم نہیں ہیں مگر مجھے ایڈیٹری کرنا نہیں ہے تبلیغ مد نظر تھی۔"(۴۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد علی نے اپنے اخبارات کو تجارتی اصولوں پر نہیں چلایا۔ان کے دوستوں کا تو ان پر اعتراض ہی یہ تھا۔

۱۹۲۸ء میں مولانا رنگون کے دورے پر کلکتہ روانہ ہو چکے تھے۔ان کے ہمراہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (جامعہ) جو بعد میں صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز ہوئے مولانا کے سیکریٹری کی حیثیت سے ان کے ہمراہ تھے۔مولانا محمد علی کی روانگی کے بعد مہاراجہ الور کے راج کی جوبلی منائی جارہی ہے ان کی خواہش ہوئی کہ ہمدرد اس موقع پر خصوصی جبلی نمبر شائع کرے اس زمانے میں نگراں مولانا عبدالماجد دریابادی اور ایڈیٹر کی حیثیت سے رئیس احمد جعفری صاحب کا نام ہمدرد میں شائع ہوتا تھا مولانا نے بغرض علاج مولانا محمد علی کو یوروپ بھی روانہ کیا تھا اور اس کے مصارف بھی برداشت کئے تھے۔نمبر شائع کرنے کے سلسلے میں جعفری صاحب نے عبدالماجد صاحب سے مشورہ کیا۔

عبدالماجد صاحب نے مولانا محمد علی کو جبلی نمبر شائع کرنے کے لئے رنگون تار دلولیا مولانا کا رنگون سے تار آیا کہ جبلی نمبر شائع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہمدرد کے خریداروں کے پاس بھیجا جاسکتا ہے۔لیکن ہمدرد نے کبھی کوئی خصوصی نمبر شائع نہیں کیا۔اس لئے ہمدرد کا خصوصی نمبر شائع کرنا مجھے پسند نہیں۔'(۴۲) یہ وہ زمانہ ہے کہ مولانا پریشان ہیں اور ہمدرد قرضدار ہے۔اگر نمبر شائع ہوتا تو سارا قرضہ ہمدرد کا ادا ہو جاتا۔لیکن مولانا نے اسے اصول صحافت کے خلاف سمجھا۔

ر رد کادوبارہ اجرا

۱۰ر اگست ۱۹۱۵ء کو ہمدرد بند ہونے کے بعد ۹ر نومبر ۱۹۲۴ء سے دوبارہ شائع
نا شروع ہوا اس طرح اس کی سالگرہ ۸ر نومبر کو ہوتی تھی۔ ۲۱ر ستمبر ۱۹۲۸ء سے
جعفری صاحب ایڈیٹر اور مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب ہمدرد کے نگراں مقرر ہوئے
مولانا محمد علی کا نام بانی اخبار کی حیثیت سے آتا تھا۔ ۸ر نومبر ۱۹۲۸ء کو ہمدرد کی سالگرہ
ے موقع پر ہمدرد میں اڈیٹوریل مضمون "رشتہ حیات" میں ایک گرہ کا اضافہ کے عنوان سے
ئع ہوا اور اس مضمون میں ہمدرد کی مشکلات اور اس کے نشیب فراز بیان کئے گئے ہیں۔ اور
ثابت کیا گیا ہے کہ مولانا نے ہمدرد کو اپنے زندگی کیطرح سمجھ کر اس کی خدمت کی۔ لیکن
ستہ آہستہ ہمدرد عوام میں غیر مقبول ہونے لگا اس کی غیر مقبولیت کی وجہ بیان کرتے
ئے ۸ر نومبر ۲۸ء کو اس کے اداریہ میں تحریر ہے۔

"افسوس کہ حکومتِ وقت کا معتوب ہونے کے علاوہ یہ پرچہ نہ
مسلمانوں میں مقبولِ عام حاصل کر سکا نہ ہندوؤں میں ہندو اس لئے خفا
ہیں کہ یہ نہایت صاف اور واضح الفاظ میں ان کی غلطیوں سے انھیں
آگاہ کر دیتا ہے اور مسلمان اس لئے ناراض ہیں کہ وہ ہمیشہ مصلحت
وقت پر حق و صداقت کو ترجیح دیتا ہے۔ اور کبھی اس کو گوارا نہیں کرتا
کہ مسلمان کا دامن فریب و دغا اور ظلم و عدوات سے ملوث نظر
آئے"۔

مولانا محمد علی اور ہمدرد کی صاف گوئی کا یہ حال تھا کہ خان بہادروں پر براہِ راست
رب مارتے چنانچہ ۴ر جنوری ۱۹۲۸ء کے ہمدرد ص نمبر ۴ کالم نمبر ۲ خطابات سالِ نو
ومت کی غلامی کے تمغے کے عنوان سے ہمدرد نے ان حضرات کے ناموں کی فہرست شائع
ہے جنھیں حکومت نے خان بہادری کے خطابات دئے تھے۔ اس خبر کے عنوان سے

قارئین ہمدرد کے جو تمندانہ لہجے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ہندو مسلم اتحاد اور آزادیٔ ہند

میں نے گذشتہ سطور میں بیان کیا ہے کہ ہمدرد نے مسلمانوں کو متحد کرنے اور مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود ملک کی آزادی اور سالمیت کے لئے ہمدرد ہمیشہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم کرنے اور قائم رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس لئے کہ ملک کی آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد ضروری تھا۔ ہمدرد لکھتا ہے

"ہمارا عقیدہ رہا ہے ہندوستان اس وقت تک ہرگز آزاد نہیں ہو سکتا کہ جب تک ہندو مسلم اتحاد نہ ہو ہم نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اپنے اخبار میں کوئی مضمون ایسا نہ لکھیں کہ خلیج کو وسیع کردے۔" (۴۳)

سید امیر علی کے انتقال کی خبر ہمدرد نے اس طرح تفصیل سے شائع کی۔

رائٹ آنریبل سید امیر علی کا انتقال ہو گیا۔

مختصر حالاتِ زندگی رائٹ آنریبل سید امیر علی موہان اودھ کے ایک مشہور قصبے کے رہنے والے تھے ان کے والد کا نام سید سعادت تھا ۱۶ ار اپریل ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ہگلی کالج میں تعلیم پائی ۱۸۷۳ء سے ۱۸۷۵ء تک پریسیڈینسی کالج میں محمڈن لا کے استاد رہے ۱۸۷۹ء شاہانِ اودھ کے متعلق تحقیقاتی کمیٹی بنی تھی اس کے رکن بنائے گئے ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۱ء تک کلکتہ میں مجسٹریٹ اور چیف مجسٹریٹ بھی رہے۔ ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۲ء تک بنگال کے مجلس مقننہ کے اور ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۵ء تک امپریل کونسل کے رکن رہے۔ ۱۸۹۰ء سے چودہ برس تک کلکتہ ہائی کورٹ کے جج کے عہدے پر فائز رہے اس کے بعد پریوی کونسل کے رکن بنائے گئے محمڈن لا پر آپ نے متعدد کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ اسپرٹ آف اسلام اور ہسٹری آف سراسینز آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

کیمبرج یونورسٹی سے ایل ایل ڈی کی آنریری ڈگری کلکتہ یونیورسٹی سے اور ڈی لٹ کی آنریری ڈگری مسلم یونیورسٹی ملی تھی۔(۴۴) ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو حکیم اجمل خاں کی وفات ہوئی۔ وفات رام پور میں ہوئی تھی۔ حکیم صاحب کی بتدریج ترقی اور زندگی کے مختصر حالات تاریخی سلسلے سے دیے ہیں ہمدرد نے شائع کیے سعید بریلوی کی ایک نظم ان کی وفات پر ہمدرد میں شائع ہوئی ہے اور یہی ہمدرد کا طریقہ کار دیگر حضرات کے لئے رہا ہے۔ جبکہ معاصر اخبارات میں خبروں کے ہمراہ تفصیلی حالاتِ زندگی شائع نہیں ہوتے ہیں۔

کانگریس اور مسلمان

۱۹۱۹ء میں امرتسر میں مولانا پہلی بار کانگریس کے ممبر بنے تھے ان کے علاوہ دیگر اقوام کے افراد سکھ اور دیگر مسلمانوں نے بھی کانگریس میں شرکت کی تھی۔ ۴ جنوری ۱۹۲۷ء کے شمارے میں ہمدرد نے مسلمان اور کانگریس کے عنوان سے لکھتا ہے۔

> "۱۹۱۹ء تک انڈین نیشنل کانگریس زیادہ تر ایک سیاسی مبلغ جماعت کی حیثیت رکھتی تھی۔ جو ہندوستانیوں کو ان کے سیاسی حقوق یاد دلا کر حکومت کے آگے مطالبات پیش کرتی تھی۔ میں کانگریس کے اگلے پیشواؤں کی قیمت گھٹانا نہیں چاہتا۔ اور جو تبلیغی کام انھوں نے کیا اس کے بغیر مہاتما گاندھی کی ۱۹۲۰ء کی بے نظیر کامیابی بظاہر ناممکن ہوتی۔"

اس طرح ہمدرد اپنے دور ابتدائی ۲۳ فروری ۱۹۲۳ء سے اپنی آخری سانس تک یعنی ۱۹۲۹ء تک اصلاح کا کام کرتا رہا۔ اور صحیح سیاق و سباق کی روشنی میں خبریں اور اطلاعات عوام تک پہنچاتا رہا اپنے اس مشن کو پورا کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہو، تبلیغ یا شدھی سنگھٹن ہو اس زمانے میں پیش آنے والے ہر مسئلہ پر ذاتیات سے بلند ہو کر ہمدرد نے مضامین لکھے ہمدرد نے انگریزی اعلیٰ حکام کے ناموں کے ساتھ لمبے چوڑے القاب آداب استعمال

نہیں کئے۔ وائسرائے اور دیگر حکام کی زیادتیوں پر تبصرہ کیا ہے مثلاً ۲۲ر نومبر ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں مشرقی اور مغربی نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے لارڈ اروِن کی اغلاط بتائی ہیں ہمدرد کے مضامین میں اقبال و غالب کے اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ مولانا نے اپنی آپ بیتی کے عنوان سے اپنی زندگی کے پچاس سال کا احاطہ کیا ہے اور اپنی شاعری سیاست اخبارات اہل ہنود سے تعلقات گاندھی جی کانگریس مسلم لیگ پر ان کے خیالات ملتے ہیں ان کی حیات میں ان کی غزلیات ان کے اشعار اور ان کے پس منظر کا ذکر موجود ہے۔

محمد علی نے ہمدرد و کامریڈ کی مشکلات کا تذکرہ کرتے ہوئے غلام حسین پر کہی ہوئی نظم تحریر کی ہے۔ اس طرح مذہب اور سیاست کے عنوان سے ۲ر دسمبر ۱۹۲۶ء کے ہمدرد میں خواجہ حسن نظامی کے ایک الزام کا ادبی انداز میں جواب دیا ہے۔ مولانا محمد علی کے ہمدرد میں ایسے شعرا اور ادیبوں کا کلام شائع ہوا جن کی نگارشات رسائل اور کتابی شکل میں تو شائع ہوتی تھیں لیکن اخبار کے کالموں میں نہیں۔ پریم چند کا افسانہ 'زرِ فدیہ' ۱۲ر نومبر ۱۹۲۶ء کے ہمدرد میں شائع ہوا اس کے علاوہ پریم چند کے دیگر افسانے بھی شائع ہوئے ہیں۔ پریم چند کے علاوہ علامہ راشد الخیری کا افسانہ 'افراط تفریط' ۱۱ر نومبر ۱۹۲۴ء کو ہمدرد میں شائع ہوا۔ غالب 'اقبال' حالی اور اس زمانہ کے چوٹی کے شعرا کا کلام ہمدرد میں شائع ہوتا تھا اس طرح کی تخلیقات سے ہمدرد کا ایک ادبی معیار قائم ہوا۔ طنز مزاح میں بسوق اور محفوظ علی نے جو جوہر دکھائے وہ آج بھی اردو صحافت میں مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے بلا شک و شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمدرد میں خبریں پوری تحقیق کے بعد شائع ہوئیں۔ صرف پیسے کی وجہ سے ہمدرد نے اشتہار شائع نہیں کئے بلکہ اس میں بھی معیار اقدار کو مدنظر رکھا۔ نڈر صحافی کی حیثیت سے انگریزوں کے خلاف لکھا۔ ہمدرد نے صحافت کے علاوہ ادبی معیار کو جس طرح قائم رکھا اس کی مثالیں معاصر اخبارات میں کم ملتی ہیں بعض معاصر اخبارات میں عبارت آرائیوں کے بعض نمونے ضرور ہیں لیکن ہمدرد نے جس تحقیق کے بعد خبروں کو شائع کیا اس کی مثالیں کامیاب ہیں اس کے علاوہ اہم ادبی مواد عام فہم زبان میں ملتا ہے ذیل میں ہمدرد کے چند مضامین کا اشاریہ درج کیا جاتا ہے۔

اشاریہ روزنامہ ہمدرد: سلسلہ خاص ۱۹۱۳ء

تاریخ	شمارہ	عنوان ایڈیٹوریل	
۹/ مارچ	۱۵	جنگ کی بساط (۲)	
۱۰/ مارچ	۱۶	ایڈریانوپل کا طلسم	
۱۱/ مارچ	الف	ایڈریانوپل انشاءاللہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نہ جائے گا	"سہ شنبہ کو یوم راحت ہوا کرتا تھا لیکن ضروری ٹیلی گرام موصول ہوجانے کی وجہ سے شمارہ شائع کیا گیا اور نمبر کی جگہ الف تحریر کیا گیا ہے"
۱۲/ مارچ	۱۷	قسطنطنیہ کی کنجی انور بے کہاں ہیں	
۱۳/ مارچ	۱۸	انگلستان اور جنگ بلقان (۱)	
۱۴/ مارچ	۱۹	انگلستان اور جنگ بلقان (۲)	
۱۵/ مارچ	۲۰	مشت بعد از جنگ	
۱۶/ مارچ	۲۱	آتش بازی کا بچھو	
۱۷/ مارچ	۲۲	شکایتِ خزانہ عثمانی	"ہندستان سے ترکی کو قرضہ دئے جانے کے بارے میں۔"
۱۹/ مارچ	۲۳	سرمایہ یونیورسٹی اور ترکی قرضہ (۱)	"یونیورسٹی کی تیس لاکھ کی رقم ترکی کو قرض کے طور پر دیے جانے کے سلسلے میں مضمون ہے"

تاریخ	شمارہ	عنوان ایڈیٹوریل	۱۹۱۳
۲۰/مارچ	۲۴	سرمایہ یونیورسٹی اور ترکی قرضہ (۲)	
۲۱/مارچ	۲۵	شاہ یونان آنجہانی	
۲۳/مارچ	۲۶	دل خوش کن	خلاصہ کاروائی خدمت انجمن ہلال احمر عثمانی
۲۴/مارچ	۲۷	عثمانی قرضہ اور بائیکاٹ	
۲۶/مارچ	۲۸	عثمانی قرضہ اور بائیکاٹ	
۲۷/مارچ	۲۹	ڈاکٹر انصاری کا خط (۱)	درہ دانیال 'چناق قلعہ' سے لکھا گیا
۲۸/مارچ	۳۰	ڈاکٹر انصاری کا خط (۲)	
۲۹/مارچ	۳۱	ڈاکٹر انصاری کا خط (۳)	
۳۰/مارچ	۳۲	شکست و فتح	"اس شمارے کا نمبر ۳۲ ہونا چاہیئے تھا لیکن کتابت کی غلطی کی وجہ سے ۳۶ تحریر ہے۔"
۳۱/مارچ	۳۳	یہی وقت مدد ہے	
۲/اپریل	۳۴	بساط جنگ (۱)	
۳/اپریل	۳۵	بساط جنگ (۲)	
۴/اپریل	۳۶	سقوطری	"سقوطری، یانینا اور ایڈریانوپل کے علاقوں سے متعلق مضمون ہے جس میں بتایا گیا ہے مذکورہ دو علاقوں کے علاوہ ایڈریانوپل کو ترک کسی بھی طرح چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"
۶/اپریل	۳۸	ڈاکٹر انصاری کا خط	

تاریخ	شمارہ	عنوان ایڈیٹوریل	۱۹۱۳ء
۸راپریل	۳۹	اتحاد ائتلاف و ثلاثہ (۱)	"انگلستان روس اور فرانس کے مشترکہ معاہدہ کے بارے میں۔"
۹راپریل	۴۰	اتحاد ائتلاف و ثلاثہ (۲)	
۱۱راپریل	۴۲	اتحاد ائتلاف و ثلاثہ (۳)	
۱۲راپریل	۴۳	چندہ ہلال احمر اور ترکی قرضہ	
۱۳راپریل	۴۴	اتحاد ائتلاف ثلاثہ (۴)	
۱۵راپریل	۴۵	عمر بے کا خط (۱)	"ڈاکٹر اظہر فیضی کا خط جو میڈیکل مشن کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو کر گئے تھے۔"
۱۶راپریل	۴۶	عمر بے کا خط (۲)	"ڈاکٹر اظہر فیضی کا خط۔"
۱۷راپریل	۴۷	ڈاکٹر انصاری کا خط	"ڈاکٹر انصاری نے اپنے ایک رشتہ دار غالب کے نام خط تحریر کیا تھا اس میں انھوں نے تحریر کیا ہے کہ ہمارا میڈیکل مشن دو حصوں میں مختلف جگہ کام کر رہا ہے ایک جگہ چنالجہ کے قریب 'محرلی' ہے اور دوسری دردانیال کے قریب چناق قلعہ ہے۔"
۱۸راپریل	۴۸	اتحاد و ائتلاف ثلاثہ (۵)	
۱۹راپریل	۴۹	اتحاد و ائتلاف ثلاثہ (۶)	
۲۰راپریل	۵۰	اتحاد و ائتلاف ثلاثہ (۷)	
۲۲راپریل	۵۱	حکایاتِ خزانۂ عثمانی	

تاریخ	شمارہ	عنوان اداریہ	۱۹۱۳ء
۲۳/اپریل	۵۲	مدینۃ العلم	"مدینہ منورہ میں ایک یونیورسٹی بنائے جانے کا منصوبہ بتایا گیا ہے اور یہ اعلان بھی کیا گیا ہے کہ ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ سلطنت عثمانی کی جانب سے مقرر کیا گیا تھا۔"
۲۴/اپریل	۵۳	اتحادی اور ان کا اتحاد	
۲۵/اپریل	۵۴	معرکۂ چتالجہ	
۲۶/اپریل	۵۵	سقوطری (۱)	
۲۷/اپریل	۵۶	سقوطری (۲)	
۲۹/اپریل	۵۷	سقوطری (۳)	
۳۰/اپریل	۵۸	مصیبت زدہ ترکوں کی نوآبادیاں	
یکم مئی	۵۹	غازی شکر بے پاشا	
۲/مئی	۶۰	امداد مصیبت زدگان مقدونیہ (۱)	"پناہ گزین ترکوں کے لئے امدادی رقم جو ہندوستان سے بھیجی گئی اس ی تفصیل بتائی گئی ہے"۔
۳/مئی	۶۱	امداد مصیبت زدگان مقدونیہ (۲)	
۴/مئی	۶۲	امداد مصیبت زدگان مقدونیہ (۳)	
۵/مئی	۶۳	ایڈریانوپل کی امداد	
۷/مئی	۶۴	امداد مصیبت زدگان مقدونیہ	
۸/مئی	۶۵	تسخیر ایڈریانوپل (۲)	

تاریخ	شمارہ	عنوان ایڈیٹوریل	۱۹۱۳ء
۸/ مئی	۶۵	خطوط چتالجہ کی سیر (۴)	
۹/ مئی	۶۶	تسخیر ایڈریانوپل (۳)	
۱۰/ مئی	۶۷	سقوطری کی قسمت کا فیصلہ	"مانٹینگرو کی پسپائی اور اٹلی اور آسٹریا کی فتح کے آثار کا ذکر ہے اور سقوطری کی قسمت کو تاریک بتایا گیا ہے۔"
۱۱/ مئی	۶۸	تصحیح کی غلطی سے نمبر ۶۷ چھپا ہے۔	
۱۱/ مئی	۶۸	ڈاکٹر انصاری کا خط	
۱۱/ مئی	۶۸	انجامِ کار (۱)	"ترکی کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ترکی میں رہنے والے عیسائیوں کے ساتھ ترکوں نے ہمیشہ اچھا سلوک کیا لیکن عیسائی ڈنگ مارتے رہے۔"
۱۳/ مئی	۶۹	کچھ اپنی نسبت	"مضمون میں بتایا گیا ہے کہ ٹائپ آجانے کی وجہ سے ہمدرد چار صفحات کا شائع کیا جاتا ہے۔"
۱۳/ مئی	۶۹	انجامِ کار (۲)	"ترکی کی قرضہ کے سلسلہ میں قانون شائع ہوئے ہیں۔"
۱۳/ مئی	۶۹	ڈاکٹر انصاری کا خط	"اس میں بتایا گیا ہے کہ میں وزیرِ مالیات اور ان کے سیکریٹری سے ملا اور ان سے گفتگو کی۔"
۱۴/ مئی	۷۰	اناطولیہ میں نو آبادی	

تاریخ	شمارہ	عنوان ایڈیٹوریل
۱۴ر مئی	۷۰	جنگِ بلقان کے اخراجات کا کون کفیل ہوا۔
۱۵ر مئی	۷۱	اناطولیہ میں نو آبادی (۲)
۱۶ر مئی	۷۲	گورنمنٹ اور مسلمانوں کی تعلیم
۱۷ر مئی	۷۳	گورنمنٹ اور مسلمانوں کی تعلیم

اشاریہ ہمدرد

۲؍ جون ۱۹۱۳ء — ٹائمس اور مسلمانانِ ہند

۳؍ جون ۱۹۱۳ء — ٹائمس اور مسلمانانِ ہند

۴؍ جون ۱۹۱۳ء — مسلمان لڑکیوں کی تعلیم اور گورنمنٹ

۵؍ جون ۱۹۱۳ء — صلح یا جنگ

۶؍ جون ۱۹۱۳ء — خطابات اور قوم

۷؍ جون ۱۹۱۳ء — خطابات اور قوم

۸؍ جون ۱۹۱۳ء — ہمارے فرائض

۱۰؍ جون ۱۹۱۳ء — مصر

۱۲؍ جون ۱۹۱۳ء — مصر

۱۳؍ جون ۱۹۱۳ء — مصر

۱۴؍ جون ۱۹۱۳ء — انجمن طبیہ دھلی

۱۵؍ جون ۱۹۱۳ء — انجمن طبیہ دھلی

۱۶؍ جون ۱۹۱۳ء — انجمن طبیہ دھلی

۱۹؍ جون ۱۹۱۳ء — کامریڈ ٹرکش ریلیف فنڈ

۲۱؍ جون ۱۹۱۳ء — اناطولیہ میں نو آبادی

۲۵؍ جون ۱۹۱۳ء — دھلی میں ہڑتال

۲۹؍ جون ۱۹۱۳ء — دھلی کے قدیمی مقابر

ہمدرد نے بعض اہم خبروں اور بالخصوص انگریز کے مظالم اور ہندستانیوں کو جام شہادت پلانے سے متعلق خبروں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انقامات پر ان پر گولیاں چلائی گئی ہیں ان کے نقشے بھی دیئے ہیں۔ چنانچہ ۲۶ را پریل ۱۹۲۷ء کا ہمدرد لکھتا ہے ۔

باریسال کے اکتیس مردہ یا قریب المرگ انسان

کلکٹی کے چھوٹے سے افلاس زدہ گاؤں میں جو گنگا کے کنارے کے دہانے کی دلدل میں واقع ہے ایک ایسا ظلم ہوا ہے جو بیدردی میں امر تسر کی خونریزی سے بڑھ گیا ہے حالانکہ اس کا بھی کوئی موقع نہ تھا کہ یہ دہائی مچائی جاسکے کہ گوروں کی جان خطرہ میں تھی۔ پھر بھی برطانوی اعمالِ حکومت نے غیر مسلح مزدوروں کی ایک بڑی تعداد پر فیر کئے اور انھیں قتل کیا۔ سب سے آخری حساب کے مطابق مردہ اور قریب المرگ آدمیوں کی تعداد اکتیس تک پہونچ گئی ہے سرکاری تخمینہ میں اس تعداد کو گھٹا کر صرف اکیس رکھا گیا ہے۔"

روزنامہ ہمدرد کو یہ خبر سر عبدالرحیم صاحب نے ارسال کی تھی ان کا تعارف کراتے ہوئے ہمدرد لکھتا ہے "مندرجہ بالا خبر سر عبدالرحیم جو پہلے وزیر تھے۔ اور ایک دولتمند شخص ہیں۔ برطانیہ کے بڑے حامی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے ایک تار کے ذریعے ہم پر اس ظلم کا انکشاف کیا ہے۔۔۔ لکھتے ہیں کہ یہ خبر میجر پول کے ذریعہ ملی ہے۔ آگے تحریر کرتے ہیں

"بغرض اطلاع عرض ہے کہ باریسال کے مجسٹریٹ کے حکم کے ذریعے ایسٹرن رائفلز کے سپاہیوں نے ۲؍ مارچ کو تقریباً ۳۰ دو گز کے فاصلے سے ایک چھوٹے سے موضع کلکٹی میں تقریباً تین سو جاہل کسانوں کے مجمع پر جو فیر کئے تھے۔ جن سے ۱۹۔ آدمی مر گئے۔ اور بہت سے سخت مجروح ہوئے۔ جن میں سے ۱۲ آدمیوں کے بچنے کی ابھی اور امید نہیں ہے۔ اس سے عالمگیر غصہ اور جوش پیدا ہو گیا ہے۔

مجمع میں سے کسی نے مجسٹریٹ کی جماعت کے خلاف یا کسی دوسرے شخص کے خلاف کوئی تشدد نہ استعمال کیا تھا۔ اور نہ ایسی کوشش ہی کی تھی۔ نہ کسی قسم کا مالی نقصان کیا

تھا۔"چوبیس گھنٹے تک زخمیوں کو کوئی طبی امداد نہ مل سکی۔" حکومتِ بنگال اس پر رضا مند نہیں ہے کہ اس طرح جو بے پرولیانہ اور ہلاکت انگیز فیر کئے گئے تھے ان کے متعلق بر سر عام کھلی ہوئی تحقیقات کرے۔ برطانوی قوم اور برطانوی پارلیمنٹ کی جانب سے فوری کارروائی عمل میں آنے کی ضرورت ہے۔

(نوٹ سر عبدالرحیم ایک عرصے تک مدراس ہائی کورٹ کے جج رہے ہیں۔ شاہی پبلک کمیشن پر جس کا اجلاس ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک ہوا انھیں حکومتِ ہند نے مقرر کیا تھا۔ اور دو ماہ پہلے وہ بنگال کے حکومت کے وزیرِ خاص تھے۔

نقشہ

ہمدرد میں گاندھی کی خود نوشت سوانح "میرے تجرباتِ زندگی" شائع ہوئی ہے۔ اس میں چند کا اشاریہ مندرجہ ذیل ہے

۷ر جنوری ۱۹۲۶ء	پہلا باب	پیدائش اور خاندان
۱۲ر جنوری ۱۹۲۶ء	دوسرا باب	بچپن کا زمانہ
۹ر جون ۱۹۲۶ء	تیسرا باب	پہلا مقدمہ
۱۵ر جون ۱۹۲۶ء	چوتھا باب	میرا اوّلین تلخ تجربہ

باب ششم میرا انٹیال پہونچنا

۹ر مارچ ۱۹۲۶ء لندن کی زندگی

۶ر فروری ۱۹۲۶ء مذہب کی جھلک

۴ر جنوری ۱۹۲۸ء خبریں (صرف سرخیوں کو تحریر کیا جاتا ہے۔)

"ترکی کا جدید سیاسی دور غازی مصطفےٰ کمال پاشا کا اعلان"۔ "جنگ میں ترکی کا نقصان" "غازی مصطفےٰ پاشا اور اسلام" "اعتمادِ باہمی کا نیا دور" (مولانا محمد علی کی تقریر کا اقتباس جو انھوں نے مدراس میں ہندو مسلم اتحاد پر کی تھی)
سیاست میں مسلمانوں کی بے توجہی "ترکی کے ساتھ غیر منصفانہ شرائط"۔ "ایک واحد سیاسی انجمن کی ضرورت۔"

۸ر جنوری ۱۹۲۸ء خبریں

"خواتین ہند کی بیداری" "بمبئی کے مزدوروں کی ہڑتال" "انگلستان سے امریکہ ۴۸ گھنٹے میں" (اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ لندن میں ہاؤڈن کے کارخانے میں ایک جہاز تیار کیا گیا ہے جو دنیا کا سب سے بڑا جہاز ہوگا) "مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر" اس خبر میں وائس چانسلر سر مزل خاں کے استعفیٰ کی تردید کی گئی ہے۔ ہندوستان ٹائمز نے یہ خبر غلط شائع کی تھی)۔

۹ر جنوری ۱۹۲۸ء "ملکی اتحاد کی ضرورت" (اس مضمون میں بابو بھگوان داس کی تقریر درج ہے بھگوان داس سابق چیئر مین میونسپل بورڈ تھے انھوں نے تقریر میں کہا) "ہم لوگوں کی سیاسی غلامی اس وقت تک دور نہیں ہوگی جب تک ہم اپنی روحانی غلطیوں کو اپنے دلوں سے دور نہ کردیں۔"
"جامعہ ملیہ اسلامیہ" "چند اور خصوصیات مضمون"۔

۲۳ر جنوری ۱۹۲۸ء "مسلمانانِ دہلی آج شام کو فتحپوری میں ضرور آؤ" (محمد علی کا

مضمون) "دہلی میں ایک نئے مسلم لیگ کی بنیاد"۔ ممالکِ غیر عنوان کے تحت مندرجہ ذیل خبریں شائع ہوئیں

"خورستان میں شدید بغاوت"۔ "برطانوی افواج اور مصر"۔ "اعلیٰ حضرت شاہ افغانستاں اٹلی میں" "چینی قزاقوں کا ایک جہاز پر حملہ"۔ "مولانا ظفر علی خاں کے صاحبزادے کی گرفتاری" (ظفر علی خاں کے صاحبزادہ اختر علی خاں کو دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لیا گیا تھا۔ نور الحق صاحب مالک مسلم آؤٹ لک اور شیخ محمد عالم صاحب نے پچاس پچاس ہزار کی زمانتیں دیں اور اختر صاحب کو گھر لے آئے)۔

ماخذ روزنامہ ہمدرد

(۱) روزنامہ ہمدرد ۔ دہلی ۳۰/ ۲۳ جنوری ۱۹۲۵ء مضامین محمد علی مرتبہ محمد سرور ۱۹۳۸ء ص ۴۵

(۲) مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز محمد سرور ، ص ۱۲

نوٹ مولانا محمد علی نے چھنڈواڑہ جیل میں ایک کتاب اسلام دی کنڈم آف گاڈ لکھنا شروع کی تھی جو مکمل نہ ہو سکی۔ بعد میں افضل اقبال نے اس کو مائی لائف اے فریگمنٹ کے نام سے (انگریزی) میں شائع کیا۔ محمد سرور نے بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے نام سے اس کا ترجمہ کیا تھا۔

(۳) روزنامہ ہمدرد ۱۷/ جون ۱۹۲۷ء

(۴) ہمدرد ۱۲۰/ اپریل ۱۹۲۹ء ؛ الوداع آخر یہ مقالہ اپریل ۱۹۲۹ء میں ہمدرد کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے کے موقع پر لکھا گیا۔

(۵) سیرت محمد علی رئیس احمد جعفری ص ۲۳۵

ماخذ صحافتی نظریات، ہمدرد کی ٹائپ پر اشاعت

(۶) سرمعت محمد علی از رئیس احمد جعفری ، ص ۸۸

(۷) ہمدرد ۱۲/ اپریل ۱۹۲۹ء (الوداع آخر مقالہ) (۸) ایضاً

(۸) نظریات و مقالات مؤلف محی الدین بدایونی ، ص ۱۱۴۔ ۱۱۵ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۷۰ء سیرت محمد علی رئیس احمد جعفری ص ۲۳۲۔

(۹) سیرت محمد علی رئیس احمد جعفری ۳۳۲

(۱۰) ہمدرد ۱۲۰/ اپریل ۱۹۲۹ء الوداع آخر مضمون مولانا محمد علی۔

(۱۱) ایضاً

نوٹ ۲۳/ فروری ۱۹۱۳ء سے شائع ہونے والے ہمدرد کو بعض تذکرہ نگاروں نے نقیب ہمدرد ، لکھا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ نقیب ہمدرد نام کا کوئی اخبار مولانا محمد علی نے نہیں نکالا۔ تفصیلات نقیب ہمدرد میں ملاحظہ فرمایئے۔

ماخذ ہمدرد کی لوح

(۱۲) علم و آگہی نیشنل کالج کراچی، مرتبہ ابو سلمان، صفحہ ۱۴۰ مقالہ نقیب ہمدرد، مولانا نے نقیب ہمدرد نام کا کوئی اخبار نہیں نکالا۔

نوٹ ہمدرد کے پہلے مدیر معاون

ایم۔ اے۔ شاہد نے اپنے مقالہ 'ادارہ ہمدرد دہلی' میں لکھا ہے "منشی محمد الدین ہمدرد کی لوح اور اس کے مستقل کالموں کے عنوان کے قلم نفاست رقم کے شاہکار ہیں۔ یہی وہ ماہر فن ہیں جنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ کی لوح اور اس کے مستقل صفحات کی سرخیاں لکھی تھیں۔ علم و آگہی مرتبہ ابو سلمان شاہجہاں پوری، ص ۱۸۶

(۱۳) خطوط محمد علی مرتبہ محمد سرور، ص ۱۵۰۔ ۱۳۶۔ سنہ ۱۹۴۰ء۔ مولانا نے محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند ورق حصہ اول صفحہ ۹

اس زمانہ میں بحث چلی تھی کہ ہمدم نے ہمدرد کی لوح اچک لی۔ لیکن مولانا محمد علی کی ناراضگی پر خلوص انداز میں ہے۔

ماخذ نقیبِ ہمدرد

(۱۴) محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق عبدالماجد دریابادی، صفحہ ۴۔ ۵ جلد اوّل۔ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ، سنہ ۱۹۵۴ء

(۱۵) روزانہ ہمدرد ۱۲ را پریل ۱۹۲۹ء 'الوداع آخر

(۱۶) روزانہ ہمدرد دہلی' ۱۲ را پریل ۱۹۲۹ء 'الوداع آخر

(۱۷) ۱۳ ر مارچ ۱۹۱۳ء ہمدرد۔ سلسلۂ خاص۔

(۱۸) ہمدرد ۱۷ ر مارچ ۱۹۱۳ء سلسلۂ خاص 'نمبر ۲۲' ص ۲ کالم ۱'

۔ خطوط محمد علی محمد سرور، صفحہ ۱۱۷۔ اصل سے مولانا کی مراد ہے کہ آٹھ صفحات کا وہ ہمدرد جسے مولانا، شائع کرنا چاہتے تھے۔

(۱۹) روزانہ ہمدرد سلسلۂ خاص' ۱۲ ر مئی ۱۹۱۳ء 'نمبر ۲۹ ایڈیٹوریل 'کچھ اپنی نسبت'۔

(۲۰) خطوط محمد علی محمد سرور، ص ۱۱۷' مکتبہ جامعہ' دہلی' ۱۹۴۰ء

ماخذ ہمدرد کا اشاف

(۲۱) محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق عبدالماجد دریابادی، حصہ اول ص ۸۔

"پہلا تقرر۔۔۔ شرر کا ہوا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۱۲ء میں شرر دہلی روانہ ہو گئے۔" ایضاً ص ۸

(۲۲) محفوظ علی بدایونی مقالہ علی برادران، ص ۱۱۱

(۲۳) محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق حصہ اول ص ۸۰۔

(۲۴) ملا واحدی میرے زمانہ کی دلی کراچی ۱۹۵۶ء ص ۳۱۳، بحوالہ علم و آگہی نیشنل کالج کراچی، ص ۶۴،

(۲۵) سید سلیمان ندوی یادرفتگاں، کراچی مکتبہ الشرق ۱۹۵۵، ص ۱۶۳

نوٹ زاہد شوکت علی کی بیگم پاکستان چلی گئی تھیں، لیکن مولانا زاہد شوکت علی نے اپنے ملک کو نہیں چھوڑا۔ اور وہ بمبئی میں خلافت ہاؤس میں ہی رہے۔

ماخذ ہمدرد کے شمارے

(۲۶) ہمدرد ۱۲/ اپریل ۱۹۲۹ء

(۲۷) علی برادران، قاضی عبدالغفار مقالہ مولانا محمد علی ص ۱۴۴ مرتب رئیس احمد جعفری لاہور۔

(۲۸) مولانا محمد علی ایک مطالعہ مرتبہ عبداللطیف اعظمی، ص ۹۸، ستمبر ۱۹۸۰ء، ۳۴۹ ذاکر نگر، دہلی۔

(۲۹) مولانا محمد علی ایک مطالعہ مرتبہ عبداللطیف اعظمی، مقالہ مولانا محمد علی بحیثیت ایڈیٹر، صفحہ ۱۰۵

(۳۰) خط بنام عبدالباری فرنگی محل، مکتوبات رئیس الاحرار، ابو سلمان شاہجہاں پوری موڈرن پبلشرز کراچی، ص ۱۳۳۰

مولانا محمد علی کی دیانت دارانہ صحافت اور خبروں کا معیار

(۳۱) ہمدرد سلسلۂ خاص ۲۶/ مارچ ۱۹۱۳ء

(۳۲) ایضاً ۱۵/ مارچ ۱۹۱۳ء

(۳۳) یہ شمارہ صولت پبلک لائبریری، رام پور میں موجود ہے۔ ہمدرد کے شمارہ نمبر ۱۰۷، ۱۲/ مئی ۱۹۲۴ء جلد ۳ (۳) تحریر ہے لیکن یہ کتابت کی غلطی ہے۔ اس لئے کہ دوسرے صفحے پر ۱۲/ مئی ۱۹۲۶ء تحریر ہے۔ اور اس شمارہ میں ہر صفحہ کے اوپر ۱۲/ مئی ۱۹۲۶ء چھپا ہوا ہے۔ اس لئے شمارہ ۱۲/

مئی ۱۹۲۶ء ہونا چاہئے۔

(۳۴) روزانہ ہمدرد، دہلی، ۱۹ر نومبر ۱۹۲۶ء، نمبر ۹، جلد نمبر ۱

نوٹ ۱۹۲۴ء میں دوبارہ اجرا کے وقت ہمدرد لکھنؤ پر چھپنا شروع ہوا۔

(۳۵) ۲۲ر اپریل ۱۹۱۳ء، سلسلۂ خاص۔

(۳۶) ہمدرد ۲۴ر نومبر ۱۹۲۴ء، ص ۴، کالم ۴

نوٹ خلیفۃ المسیح سے مراد احمدیہ جماعت کے پیشوا ہیں۔

(۳۷) ہمدرد دہلی ۲۴ر نومبر ۱۹۲۴ء، ص ۴، کالم نمبر ۱

(۳۸) ایضاً ۲۵ر نومبر ۱۹۲۴ء، ص ۶، کالم ۲۔

بھارت ماتا کے فرزندوں سب ایک ہو تم کچھ غیر نہیں

یہ پھوٹ تمہاری دشمن ہے اس پھوٹ کا استحصال کرو

جو تم کو لڑائے آپس میں وہ قوم وطن کا دشمن ہے

تم مات کو اس کی ٹھکرا دو یوں دشمن کو پامال کرو

لو اب وہ میشن آپہنچا بس جمعہ کے دن آجائے گا

اور اب دکانیں بند کریں ہڑتال کرو ہڑتال کرو

(۳۹) ایضاً سلسلۂ خاص ۲۱ر مارچ ۱۹۱۳ء

(۴۰) اصول صحافت نمبر ۹ میں یہ مفہوم موجود ہے۔

The Comrade.

A Weekly Journal. Edited by Mohamed Ali.

Stand upright, speak thy thought, declare
The truth thou hast, that all may share.
Be bold, proclaim it everywhere
They only live who dare!

—*Morris.*

Vol. 1.
No 1.

Calcutta: Saturday, January 14, 1911.

Annual Subscription
Indian Rs. 12.
Foreign £1.

کامریڈ

مولانا محمد علی کا شمار ان مجاہدین آزادی میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی سیاسی زندگی کے علاوہ علم وادب کے ذریعہ بھی ملک وقوم کی خدمت کی۔ مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز شعرو شاعری سے ہوا۔ انھوں نے دس سال کی عمر میں بہت سے لغو وفضول مگر بامعنی شعر کہے تھے۔ عبدالماجد دریابادی کو اپنے ایک خط میں تحریر کیا ہے :

"میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت لغو وفضول شعر مگر بامعنی کہے تھے۔"(۱)

مولانا محمد علی نے بڑودہ کی ملازمت کے دوران ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۰ء ٹائمز آف انڈیا میں مضامین کا سلسلہ "موجودہ بے چینی پر اظہار خیال" کے عنوان سے ۱۹۰۷ء میں شروع کیا تھا۔ ان مضامین کے بارے میں محمد علی نے محفوظ علی بدایونی کو تحریر کیا تھا :

"اس عرصہ میں ٹائمز آف انڈیا میں میرے چند مضامین شائع ہوئے جس میں مسلمانوں کے حقوق کی پیروی کی گئی تھی۔ اور مسٹر گوکھلے کی دوستی نما دشمنی کا پردہ فاش کیا گیا تھا۔ مسٹر دت سخت ناراض ہوئے جواب طلب کیا۔ میں نے جواب ایسا دندان شکن دیا کہ کچھ بن نہ پڑی کونسل میں جواب پیش ہوا اور کچھ نتیجہ نہ نکلا۔"(۲)

مولانا کے اس جواب کے بعد کونسل نے یہ طے کیا کہ ایک سرکلر شائع ہونا چاہئے جس کے ذریعہ یہ اطلاع دی جائے کہ خفیہ کے سرکاری عہدہ داروں کو ایسے مضامین لکھنا مناسب نہیں۔ مولانا کے اس مضمون سے بڑودہ اسٹیٹ کے حکام کے جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ادھر مولانا اس زمانے میں بڑودہ اسٹیٹ میں افیم کے محکمہ میں ملازم تھے اور افیم کی

کاشت میں کمی واقع ہوئی تھی۔ اس کی وجہ سے بھی حکام انھیں ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ اس کے علاوہ محمد علی ملازمت سے بیزار بھی تھے۔ بڑودہ کی ملازمت سے بیزاری کی وجہ محفوظ علی بدایونی نے بیان کی ہے۔ مولانا محمد علی اور محفوظ علی بدایونی کا ساتھ ۱۸۸۸ء سے ہوا تھا جب محمد علی اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ بریلی کے اسکول میں بغرض تعلیم گئے تھے۔ اس لئے محمد علی کے لئے محفوظ علی کا دعویٰ ہے کہ اُن کی کتاب زندگی ابتدائی دس گیارہ سال چھوڑ کر باقی میرے پیش نظر ہے۔ محفوظ علی نے بڑودہ اسٹیٹ کی ملازمت سے بیزاری کی وجہ بیان کی ہے۔

"مجھے اس کی تفصیل عرض کرنے دیجئے! انگریزی گورنمنٹ کے ایک سابق اعلیٰ عہدہ دار اور ملک کے مشہور مصنف ادیب اور سیاسی مورخ برادرانِ وطن بڑودہ کے رُکنِ حکومت کے مقرر ہو کر یوروپ دیس سے آئے ایک موقع پر دورانِ گفتگو میں سلطنت مغلیہ کا تذکرہ چھڑا رکنِ حکومت نے اس کو تاہ نظری بلکہ بے بصری سے جو یوروپی مورخوں کی بنائی ہوئی عینک کا خاصہ ہے۔۔۔ اورنگ زیب رحمتہ اللہ کے ظلم و تعصب کے افسانے گنگنانے شروع کئے۔ محمد علی کو جو علامہ شبلی مرحوم کے مضامین عالمگیر پڑھ چکے تھے یارائے ضبط کہاں فوراً اُلجھ پڑے اور وہ دنداں شکن بحث کی کہ اسے قبولنا پڑا کہ اس کی دسترس اصل فارسی تاریخوں تک نہیں۔"(۳)

بڑودہ اسٹیٹ میں یہ سرکلر جاری ہونے کے بعد کہ سرکاری ملازمین کو اس طرح کے مضامین تحریر نہیں کرنا چاہیں' مولانا ٹائمز میں مضامین لکھتے رہے۔ مولانا اپنے ایک خط میں ان مضامین کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

"اس عرصہ میں ٹائمز میں تین مضامین ہندو مسلمانوں پر لکھ ڈالے اور میرا خیال ہے کہ وہ میرے اچھے مضامین تھے۔ ایک مضمون علی گڑھ

پر لکھا جس کا ایڈیٹر نے بھی حوالہ دیا اور اس دن نوٹ لکھا جس میں
تحریر تھا کہ ہماری رائے دینے کی ضرورت نہیں۔"(۴)

مولانا محمد علی کامریڈ کی اشاعت سے قبل مضامین لکھتے رہے لیکن انھیں صحافت کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس پیشے کو انھوں نے ملک وملت کی خدمت کے لئے اختیار کیا تھا۔

"صحافت سے میری غرض صحافت نہیں ہے بلکہ ملک وملت کی خدمت ہے۔"(۵)

مولانا نے صحافت کو ذریعہ معاش کے لئے اختیار نہیں کیا انھوں نے اس پیشہ کو ایک مشن کے طور پر منتخب کیا تھا

"میں اگر مضمون لکھ کر ہی روٹی کماتا یعنی اس کی تجارت کرتا تو انگریزی اخبارات کم نہیں ہیں۔ مگر مجھے ایڈیٹری کرنا نہیں ہے۔ تبلیغ مدنظر تھی۔"(۶)

مولانا محمد علی کو ۱۹۱۱ء سے قبل صحافت کا کوئی تجربہ نہ تھا لیکن انھوں نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانانِ ہند کے پاس کوئی اخبار بھی ایسا نہیں کہ جس سے ان کی اصلاح ہو سکے یا ان کے خیالات وافکار کی ترجمانی ہو سکے تو مولانا نے کامریڈ نکالنا شروع کیا۔ مولانا تحریر کرتے ہیں۔

"مجھے یہ محسوس ہو گیا تھا کہ اپنی قوم کے خواص اور بالخصوص ان کے جو اردو زبان سمجھنے سے قاصر ہیں ان کے علاوہ حکومت کے لئے ہندوستان کی دوسری اقوام کے لئے اور ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک کے لئے انگریزی اخبار کی ضرورت ہے۔"(۷)

ہمارے ملک میں انگریز پرستی اور غلامانہ ذہنیت کا یہ انداز تھا کہ ہر وہ چیز جو یوروپ سے متعلق تھی وہ بہتر اور افضل تھی۔ یہاں تک کہ انگریزی اخبارات کا پڑھنا فیشن میں داخل تھا اور اپنی زبانوں کے اخبارات پڑھنا بار خاطر تھا کامریڈ کا مقصد یہ تھا کہ انگریز افسران تک ہندوستانیوں کے خیالات کی ترجمانی آسانی سے ہو سکے۔ مولانا نے اس کے بارے میں اظہار خیال کرتے

ہوئے تحریر کیا ہے :

"ہماری غلامی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ اپنی زبان کے اخبار پڑھنا بھی ناگوار تھا۔یہی وجہ تھی کے کامریڈ نے انگلستان کے مختلف اخباروں کا چربہ اتارا تھا اور حاکم و محکوم دونوں کے مذاق کے مطابق ایک معجون مرکب تیار کر کے دونوں کے سامنے پیش کی تھی۔"(۸)

کامریڈ کے اغراض و مقاصد کا اندازہ ہم اس نظم سے لگا سکتے ہیں جو اس کی لوح کی نیچے شائع ہوتی تھی۔اور اس کا ترجمہ اس طرح ہے ·

"راست اندام کھڑے ہو اپنے خیالات کا اظہار کرو اپنی بات کہہ ڈالو اس صداقت کا اعلان عام کرو جو تمہارے پاس ہے تاکہ سب اس سے مستفیض ہو سکیں جرأت سے کام لو اور ہر قدم پر امر بالمعروف کا اعلان کرتے رہو۔'صرف وہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو باہمت اور صدق گفتار ہوتے ہیں'۔"

اس میں کوئی شک نہیں مولانا راست اندام بھی تھے اور صدقِ گفتار بھی تھے۔انھوں نے اس صداقت کا اعلان عام کیا جو ان کے پاس تھی۔یعنی ہندوستان کی مکمل آزادی کی مانگ کا صور انھوں نے جس طرح پھونکا اس کی مثالیں کم ملتی ہیں ہمدرد کامریڈ کے ذریعہ 'ترکوں کی حمایت کے ذریعہ ترک موالات کے ذریعہ 'جس طرح بھی ہو وہ برٹش سامراج کی شکستِ فاش اور ہر قیمت پر ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔اس کے لئے ان پر الزامات بھی آئد کئے گئے یہ فتنہ کھڑا کیا گیا کہ مولانا محمد علی افغانستان سے ہندوستان پر حملہ کرانا چاہتے ہیں۔لیکن مولانا اپنے مقصد سے نہیں ہٹے۔اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ اپنے اخبارات کے ذریعہ ہندستانیوں کے لاشعور کو بیدار کرتے رہے۔

کامریڈ کا پہلا شمارہ ۱۴؍ جنوری ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے شائع ہوا۔اس کی لوح پر The Comrade تحریر ہوتا۔اسکی جلد ہر چھ ماہ بعد تبدیل ہوتی صفحات کے نمبر کا سلسلہ

ایک شمارہ سے دوسرے شمارے اور دوسرے شمارے سے تیسرے شمارہ کے ساتھ سلسلہ وار چلا ہے۔ پہلا شمارہ ۲۰ صفحات پر شائع ہوا تھا دوسرا شمارہ پہلے صفحے پر نمبر ۲۱ کی جگہ نمبر ۲۱ لکھا ہوا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں تیسرے شمارہ میں نمبر ۴۱ پہلے صفحہ پر لکھا گیا۔ نمبروں کا سلسلہ جلد کے ساتھ تبدیل ہوا ہے جبکہ ہمدرد میں صفحات کے نمبر کی ترتیب کا یہ طریقہ نہیں تھا ہر شمارے کے پہلے صفحہ پر ا ہی لکھا جاتا تھا۔

کامریڈ کے پہلے شمارے میں 'We' کے تحت اخبار کی پالیسی بتائی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ہم کسی کے جانب دار نہیں ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان کے مختلف طبقوں میں باہمی ربط پیدا ہو کامریڈ کے مندرجہ ذیل مستقل کالم تھے۔

Notes Leadıng Artıcles, Poetry, Coressı c .dance, Literature Selectıons, Gup, Advertısements

نوٹس :اس کے تحت مختلف نوٹس ہوتے جو خبروں پر تبصرہ ہوتا۔

لیڈنگ آرٹیکل .اس کے تحت مختلف موضوعات پر مضامین ہوتے جو اخبار کا ایڈیٹوریل ہوتا تھا۔

کارسپانڈنس :اس میں مختلف حضرات کے خطوط شائع ہوتے تھے جن میں اخبار کی تعریف و توصیف کے علاوہ سوالات بھی کئے جاتے تھے اور بعض Readers کے خط بھی شائع ہوتے۔

لٹریچر :اس کالم پر ایک تصویر بنی رہتی مختلف لباسوں میں لوگ چاروں طرف کرسیوں پر بیٹھے ہوتے یہ کامریڈ کا مشہور و مقبول کالم تھا۔

سلیکشن :اس کے تحت مختلف ممالک کی خبریں ہوتیں کبھی کبھی اس صفحہ پر مضامین بھی شائع ہوتے۔

ایڈورٹائزمنٹ :اس کے تحت ایڈورٹائزمنٹ ہوا کرتے تھے۔

اار مارچ ۱۹۱۱ء ۹ جلد نمبر ا کے شمارہ سے مستقل کالموں کے عنوان تبدیل ہوئے ہیں مثلاً

نوٹس کی جگہ The Week اور ایک کالم HE TEA TE TE کے عنوان سے بھی شروع کیا گیا۔ ۷ ستمبر ۱۹۱۲ء جلد نمبر ۴ شمارہ نمبر ۱۰ شائع ہوا اس کے بعد شمارہ نمبر ۱۱ ہونا چاہئے تھا لیکن شماروں کی تعداد میں پروف کے اغلاط ہمدرد میں بھی ہے اور کامریڈ میں بھی اس کے بعد کے شمارہ پر بھی نمبر ۱۰ شائع ہوا ہے۔ کلکتہ سے کامریڈ کا آخری شمارہ ۱۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا اور دہلی سے ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو پہلا شمارہ شائع ہوا۔

مولانا محمد علی کو انگریزی زبان و ادب پر اتنا عبور تھا کہ وہ عوام و خواص دونوں کی زباں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ کامریڈ کو انھوں نے ادبی میناکاری سے سجایا تھا۔ اخبار کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ہندوستان سے وزیر مالیات سر فلیٹ وڈ ولسن ولایت جانے لگے تو محمد علی ان سے ملنے گئے۔ وزیر مالیات نے مولانا محمد علی کو اپنا رخت سفر کھلوا کر دکھایا اور کہا دیکھو، میں تحفہ میں کامریڈ کا فائل لئے جا رہا ہوں۔ جو لندن پنچ کے ایڈیٹر کو تحفہ میں دونگا۔ مولانا نے کہا کہ لندن پنچ کو تبادلہ میں کامریڈ جاتا ہے۔ وزیر مالیات نے جواب دیا وہ اور بات ہے جب میں اپنے دوست ایڈیٹر لندن پنچ کے لئے یہ تحفہ ہندوستان سے لے جاؤنگا تو وہ بہت خوش ہوں گے۔

کامریڈ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اکثر انگریز خاندانوں میں کامریڈ کی دو کاپیاں جاتی تھیں اس لئے کہ اتنا انتظار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ شوہر کے پڑھنے کے بعد بیوی پڑھے۔ چنانچہ لارڈ ہارڈنگ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ ان کے نام جو اعزازی پرچہ جاتا تھا اسے وہ پڑھتے تھے اور بیگم ہارڈنگ چونکہ اتنا انتظار نہیں کر سکتی تھیں کہ اخبار خالی ہو تو وہ پڑھیں اس لئے انھوں نے اپنے نام ایک الگ پرچہ جاری کرایا۔ مولانا کی قلم کی قوت اور اثر کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے کہ ۱۹۱۲ء میں جب ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں طبی وفد روانہ ہوا تو روپیہ کی ضرورت تھی اس لئے ہلال احمر انجمن نے پندرہ ہزار کی رقم عثمانی کونسل بمبئی کو روانہ کر دی تھی۔ مولانا نے کامریڈ میں اس سلسلہ میں مضامین لکھے اور اپیل کی۔ محمد علی نے اتنے پر اثر انداز میں اپیل کی تھی کہ ہزاروں کی رقمیں منی آڈر سے

آناشروع ہو گئیں۔

چوائس آف دی ٹرکس پریس کی ضمانت ضبط

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑی لندن کے ایک اخبار لندن ٹائمز نے چوائس آف دی ٹرکس کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں ترکوں کو دھمکی دی گئی تھی۔ ترک جنگ میں جرمنی کا ساتھ دینا چاہتے تھے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی نے جب اس مضمون کو پڑھا تو وہ بیتاب ہو اٹھے اور مولانا محمد علی نے اس مضمون کا جواب اسی عنوان سے دیا انھوں نے اپنا جوابی مضمون چالیس گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد مکمل کیا تھا اور اس درمیان میں چند پیالے کافی کے علاوہ اور کچھ نہ کھایا تھا۔ ۲۶ر ستمبر ۱۹۱۴ء کو محمد علی کا یہ جوابی مضمون کامریڈ میں شائع ہوا۔ اور تین نومبر ۱۹۱۴ء کو اس جرم میں کامریڈ پریس کی ضمانت ضبط کر لی گئی تھی اور کامریڈ بند ہو گیا۔ مولانا محمد علی نے اس مضمون کی تفصیلات ہمدرد میں لکھی ہیں

"۱۹۱۴ء میں لندن ٹائمز نے چوائس آف دی ٹرکس ترکوں کی پسند کے عنوان سے ایک مقالہ افتتاحیہ شائع کیا تھا۔ جس میں ترکوں کو اچھی خاصی دھمکی دی گئی تھی۔ میں نے جب اس مضمون کو پڑھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں ترک اس قدر تلخ لہجے میں لکھے ہوئے مضمون کو پڑھکر برطانیہ کے خلاف جنگ پر آمادہ نہ ہو جائیں اور چونکہ میں اس جنگِ عمومی میں ترکوں کی شرکت کو ترکوں اور عام طور پر مسلمانوں اور بالخصوص مسلمانانِ ہندوستان کے لئے مضر سمجھتا تھا اس لئے میں مجبور ہو گیا کہ ایک بار پھر کوشش کروں کہ ترکوں کو اس جنگ کی شرکت سے باز رکھوں۔۔۔ ٹائمز کے مضمون کے عنوان سے ہی ایک اور مقالہ افتتاحیہ لکھنا شروع کیا جس میں ترکوں سے پھر التجا کی کہ وہ اس جنگ کی آگ میں نہ کود پڑیں۔۔۔ اس مضمون کے

باعث ۲۶ر ستمبر ۱۹۱۳ء کا کامریڈ اس تاریخ کے کئی دن بعد ہی نکلا
مگر میں نے اس کی بھی پرواہ نہ کی۔۔۔۔ جس کی پاداش میں ۳ر نومبر کو
پریس کی ضمانت ضبط ہوئی۔اور کامریڈ پریس کو دس برس بند رہنا
پڑا۔"(۱۰)

مولانا کے اس مضمون کی اشاعت کے بعد انگلستان کے ہفتہ وار اخبار نیو اسٹیٹسمین نے مولانا کے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے بظاہر مولانا محمد علی کی تعریف کی تھی۔اور بقولِ محمد علی

"حکومت کو اس طرح اتنا اکسایا کہ کامریڈ کا بند کیا جانا کچھ زیادہ محسوس
نہ ہو اور شوقِ گناہ سزا کے بعد اور بڑھ گیا۔"(۱۱)

مولانا چونکہ خود اہل قلم تھے اس لئے قلم کی قوت اور اس کی اہمیت کا انھیں بخوبی اندازہ تھا۔غالباً یہی وجہ تھی کہ آزادی کی جنگ انھوں نے اخبارات کے ذریعہ شروع کی۔رہائی کے بعد مولانا جب دہلی آئے تو ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ایک جلسہ جو دہلی کے خطاطوں کی جانب سے ہوا تھا اور اس میں مولانا کو بحیثیت مہمانِ خصوصی بلایا گیا تھا اس جلسے میں مولانا نے اپنی تقریر میں کہا:

"جو لوگ تلوار کے مالک ہیں وہ بھی اہلِ قلم کی طاقت اور اقتدار کا
پورے طور پر اثر مانے ہوئے ہیں۔ آپ کے قلم کا لوہا تلوار کے لوہے
کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔اور آپ کا زخم تلوار کے زخم سے زیادہ
تکلیف دہ۔ پس اپنا قدم آگے بڑھائیے۔"(۱۲)

مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو

محمد علی کے قلم نے بھی تلوار کا کام کیا اور اس جرم میں ان کے پریس کی ضمانت ضبط ہو گئی تھی۔

اس زمانہ میں پریس ایکٹ کے تحت چھاپے خانے کے کیپرس سے نقد ضمانت لی

جاتی تھی لیکن ۱۹۱۱ء میں محمد علی نے جب کلکتہ سے کامریڈ نکالا تو ان سے ضمانت طلب نہیں کی گئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو بے ضرر سمجھا جاتا تھا۔ بقول محمد علی

"اس زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست زیادہ تر انگریزی حکومت کے حق میں تھی۔ بلکہ ہندوستان کی زیادہ آگے بڑھی ہوئی ملتوں کے مقابلہ میں بسا اوقات خوشامد اور کاسہ لیسی کا شائبہ پایا جاتا تھا۔" (۱۳)

لیکن جب مولانا دہلی منتقل ہوئے تو اس وقت تک حکومت کی نظر میں کچھ مشتبہ ہو چکے تھے چنانچہ محمد علی کو دہلی میں بہت سے افسران سے ملنا پڑا اور اس کے بعد انھیں ضمانت سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اور وجہ یہ بتائی گئی کہ تم نے گزشتہ دو سالوں میں بہت شرافت سے وقت گزارا ہے۔ لیکن محمد علی زیادہ عرصے تک شرافت سے وقت نہیں گزار سکے۔ اس زمانے میں مولانا محمد علی کو "مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو" کے عنوان سے ایک پمفلٹ بھی ملا تھا۔ لیکن حکومت نے اسے ضبط کر لیا۔ اس کے بارے میں محمد علی نے تحریر کیا ہے

"میرا ۱۹۱۳ء میں حکام سے کھلم کھلا تصادم ہو گیا جب انھوں نے ایک پمفلٹ جو مجھے کئی دوسرے ہندوستانی مسلمانوں کی طرح ترکی سے موصول ہوا تھا۔ ضبط کر لیا۔ جس میں کہ بلقان کے اتحادیوں کے خلاف مقدونیہ میں مظالم کا اس میں ذکر تھا۔ برطانیہ سے مسیحیت کے نام پر مدد کی اپیل کی گئی تھی۔" (۱۴)

مولانا محمد علی نے اس پمفلٹ کے خلاف اور ۱۹۱۰ء میں بنے ہوئے پریس ایکٹ کے خلاف ہندوستانی اخبار نویسوں کی جانب سے کلکتہ ہائی کورٹ میں درخواست دی تھی۔ لیکن اس مقدمہ کے ردِ عمل کے طور پر دہلی میں مولانا کے چھاپے خانے کے پریس سے زیادہ سے زیادہ ضمانت مانگی گئی تھی۔ اور اس کے ایک سال بعد یہ ضمانت ضبط کر لی گئی۔ جس کی وجہ سے کامریڈ نکلنا بند ہو گیا۔

مولانا کو پابندی اوقات سے کام کرنے کی آدت نہ تھی لیکن ابتدا سے ان کی زندگی کا یہ انداز نہ تھا۔ جب وہ قومی لیڈر بنے تو ان کے پاس آنے والوں کا کوئی وقت نہ تھا۔ اور دفتر کامریڈ میں اکثر و بیشتر ان کے ملاقاتی آتے رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صبح کے ناشتے کے بعد جب معمول کے مطابق وہ دفتر میں بیٹھ کر کوئی مضمون لکھنا شروع کرتے تو معلوم ہوتا کہ فلاں صاحب آئے ہیں اور فلاں صاحب کو جانے سے پہلے دوسرے کوئی فلاں صاحب کی اطلاع ملتی بقول محفوظ علی بدایونی

"اب مجلس گرم ہوئی دوپہر ہو گئی۔ کبھی کھانے میں شریک ہوئے کبھی ویسے ہی چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا شروع ہوا۔ کوئی سلسہ شروع ہوا تو وہ سہ پہر کی چائے پر ختم ہوا۔" (۱۵)

محفوظ علی جب اس منظر کو دیکھتے تو انھیں اس لئے ناگوار لگتا کہ کامریڈ کی کاپی وقت پر نکلنے میں دیر ہوتی۔ اس لئے کہ جب تک محمد علی آرٹکل لکھ کر نہیں دیتے وہ کمپوز نہیں ہوتا اور دیر ہونے کی صورت میں کمپوزیٹروں اور دیگر عملہ کو اور ٹائم دینا پڑتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ مصارف بھی بڑھتے اور وقت پر کاپی شائع نہ ہونے کی وجہ سے اخبار کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچتا۔

محفوظ علی کا منہ کبھی کبھی غصہ سے تمتما جاتا محفوظ علی اسی کیفیت میں ایک دن بیٹھے تھے۔ مولانا آئے اور معلوم کیا۔

"بھائی صاحب یہ مزاج کا پارہ کیوں چڑھا ہے کسی نے زبان چلائی ہو زبان نکال لوں آنکھ دکھائی ہو آنکھ پھوڑ دوں۔۔۔۔ ہمارے ضبط کا پیالہ چھلک گیا اور جو کچھ منہ میں آیا بکنا شروع کیا۔ محمد علی تم باتونی ہو۔ بیکار ہو۔ کمپوزیٹر پریس میں مفت کی تنخواہ پا رہے ہیں۔ تمہارا نقصان ہو رہا ہے۔ کامریڈ وقت پر نہ نکلنے سے بدنامی ہو رہی ہے آخر اور ٹائم دیگر پرچہ چھاپنا پڑے گا اسی سلسلہ میں زبان سے نکل گیا کام وام تو کرتے نہیں آرام کرسی پر پڑے انگڑائیاں لیتے رہتے ہو۔ انگڑائی کا لفظ سنتے

ہی کہنے لگے بھائی ہمارا انتظام رام پوری کہتا ہے دیکھو کتنا بانکا شعر ہے۔

انگڑائی بھی نہ لینے پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

ہائے ظالم نے کیا تصویر کھینچ دی ہے۔ ہم بھاڑ میں جائے تمہارا انتظام کہتے ہوئے جلے بھنے اٹھ آئے اور اپنے کمرے میں جاکر سوگئے۔"(۱۶)

محمد علی کی اس طرح کی مصروفیت کے باوجود جسے محفوظ علی لاپرواہی کہتے ہیں محمد علی نے کامریڈ کی قومی ذمہ داری سمجھ کر ہمیشہ محسوس کیا محمد علی نے اپنی مصروفیت کے بارے میں لکھا ہے

"جو شخص دو تین دن بھی میرے پاس رہا ہوگا وہ بھی کہہ سکے گا کہ میں دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں سے کتنا وقت اہل وعیال کے درمیان صرف کرتا ہوں۔ کئی کئی دن گزر جاتے ہیں بچوں کی شکل دیکھنے میں نہیں آتی۔ جب میں کام سے فارغ ہو کر سونے جاتا ہوں تو بیوی کو سوتا ہوا پاتا ہوں جب وہ صبح کو سو کر اٹھتی ہیں تو مجھے سوتا ہوا چھوڑ کر جاتی ہیں اس پر لطف یہ کہ بعض وقت مہینے گزر جاتے ہیں کہ ہمدرد کی بھی کوئی خدمت نہیں کر سکتا اس لئے کہ ملک وملت کے کاموں میں اتنا مصروف ہو جاتا ہوں کہ ہمدرد کے قارئین کرام کی خدمت سے معذور رہتا ہوں کانگریس کا کام ایک طرف خلافت کا دوسری طرف۔"(۱۷)

جب بی اماں حالتِ نزع میں تھیں اس وقت مولانا کامریڈ کے پروف پڑھ رہے تھے بہن کے بلانے پر گھر میں گئے اور رات کے دو بجے تک بی اماں کے پلنگ کی پٹی کے پاس بیٹھے رہے۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ مولانا رات میں ہی دفتر کے کمرہ میں آکر پھر کامریڈ کے کام میں مصروف

ہو گیے۔ مولانا کو اطلاع دی گئی کہ بی اماں کو غسل دیا جاچکا ہے۔ کفن پہنا دیا گیا۔ لوگوں نے جنازہ بھی اٹھالیا۔ مولانا کامریڈ کے دفتر کے کمرہ سے اٹھے اور جنازے میں شرکت کی۔ میری معلومات کے مطابق کسی ایڈیٹر کی قربانی مولانا کے معاصرین میں اس درجہ کی نہیں ملتی۔

مولانا کی زندگی کا ایک المیہ تھا اور وہ یہ کہ 'رہنمائے قوم' بننے کے بعد وہ پابندی اوقات نہیں کر سکتے تھے۔ اور کوئی بھی عوامی زندگی گزارنے والا پابندی اوقات مشکل ہی سے کر سکتا ہے۔ دفتر کے اوقات میں مختلف حضرات مختلف مسائل لے کر آتے رہتے تھے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخبار کے کام کے لئے دیر ہو جاتی۔ چنانچہ ۲۶/ دسمبر ۱۹۲۴ء کے اخبار کے لئے لیڈنگ آرٹکل انھیں تار سے بھیجنا پڑا تھا۔ مولانا کے ایک شاگرد رانا جنگ بہادر سنگھ کامریڈ کے ایڈیٹوریل نوٹ لکھا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے

> "میرے ایڈیٹوریل نوٹ چھپنے کے لائق ہیں یا نہیں میں انھیں لکھ کر دیتا تھا کبھی تو نوٹ ردی کی ٹوکری میں ملتے تھے لیکن بھیجنے سے پہلے وہ مجھے بڑی شفقت سے طلب فرماتے اور مفید ہدایت دیتے کیا اور کیوں کر لکھا جائے اور جب کبھی بھی میں اپنا ایڈیٹوریل نوٹ کامریڈ میں چھپا ہوا دیکھتا تو خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔" (۱۸)

رانا جنگ بہادر سنگھ کے بیان سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کامریڈ کے معیار کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔

مولانا نے کامریڈ میں ایسے معرکتہ لا آرا مضامین لکھے جس سے انگریزی قوم پر دہشت طاری ہو گئی۔ اور وہ جنگ کامریڈ کے ذریعہ ۱۹۱۱ء میں شروع کی گئی تھی اس کا ثمر ہمیں ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کی شکل میں ملا۔

کامریڈ کا اسٹاف .راجہ غلام حسین کامریڈ کے سب ایڈیٹر تھے۔ راجہ غلام حسین کامریڈ کے ابتدائی دور سے اس سے متعلق رہے موصوف ضلع جہلم کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ علی گڑھ میں بھی تعلیم حاصل کی ۱۹۰۷ء میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد پنجاب چلے

گئے۔اور اسلامیہ ہائی اسکول ہوشیار پور میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ ۱۹۱۱ء میں مولانا محمد علی نے کلکتہ بلا لیا تھا۔ قاضی عبدالغفار نے تحریر کیا ہے۔

"رفتہ رفتہ ہمدرد اور کامریڈ کے کاموں سے ان کا (محمد علی) کا تعلق بہت کم ہو گیا۔۔۔ کامریڈ کی ذمہ داریاں راجہ غلام حسین پر عائد ہو گئیں۔"(۱۹)

ہاشمی فرید آبادی بھی قاضی عبدالغفار کے قول سے متفق ہیں

"شروع سے ہی کامریڈ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔"(۲۰)

عبدالماجد دریابادی نے بھی یہی تحریر کیا ہے کہ راجہ غلام حسین سب ایڈیٹر تھے۔(۲۱)
راجہ غلام حسین انگریزی صحافت میں مولانا محمد علی کے شاگرد بھی تھے۔جب کامریڈ بند ہو گیا روزنامہ انڈین ٹیلی گراف لکھنؤ سے منسلک رہے۔پھر کچھ عرصہ بعد اپنا ایک مستقل ہفتہ وار "نیو ایرا" کے نام سے نکالا اور اس کی بھی خوب دھوم دھام ہوئی۔"(۲۲)
ضیاالدین برنی نے عظمتِ رفتہ اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے

"راجہ مرحوم ہوم لیگی تھے مسز اینی بیسنٹ نے ان کے بچوں کے لئے ایک فنڈ بھی کھولا تھا اور اس سے ان کے بچوں کی مدد بھی کی تھی۔"(۲۳)

سید غلام ربانی "نیو ایرا" میں مینیجر تھے ان کا کہنا ہے

"راجہ غلام حسین کامریڈ کے سب ایڈیٹر تھے ان کی عمر مشکل سے تیس سال ہو گی مگر صحافت میں پیر طریقت تھے۔"(۲۴)

'نیو ایرا' کے لئے روپیہ لکھنؤ کے سر بر آوردہ حضرات نے دیا تھا غلام ربانی صاحب کا بیان ہے کہ بڑی بڑی رقمیں ہندو وکیلوں اور بیرسٹروں نے دی تھیں۔یہ اخبار کامریڈ کے بند ہو جانے کے بعد جاری ہوا۔اس لئے کامریڈ کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔اس کے علاوہ راجہ غلام حسین کو 'چھوٹے کامریڈ صاحب' بھی کہا جاتا تھا۔اور بڑے کامریڈ صاحب مولانا محمد علی تھے۔سید

محفوظ علی بدایونی ہمدرد میں تجاہل عامیانہ لکھا کرتے تھے۔

ان کا قلمی نام ملا علی بودھامئوی تھا بودھامئوی بدایوں کا قدیمی نام تھا اور سید محفوظ علی چونکہ وہاں کے رہنے والے تھے اس لئے بودھامئو لکھا کرتے تھے۔ ملا علی بودھامئوی نے راجہ غلام حسین کو چھوٹے کامریڈ صاحب ہی لکھا ہے۔ راجہ غلام حسین کی شادی کے موقع پر اپنے مضمون بعنوان حاجی صاحب کی تقریریں اور کاروائی جلسہ میں تحریر کیا ہے۔

"کیا نام ہے کہ ہم کہتے ہیں کامریڈ صاحب ایک نہ ایک دن ضرور گرفتار کیے جائیں گے آج صبح کو حاجی صاحب آنکھیں ملتے اُٹھے تو سرہانے ایک کارڈ دھرا تھا یعنی یہ کہ شادی اور اسکی شرکت۔"(۲۵)

اس مضمون میں مولانا محمد علی کو بڑے کامریڈ صاحب کہا گیا ہے۔ راجہ غلام حسین کامریڈ کو عملے میں مولانا کے معتمد ترین لوگوں میں سے تھے۔ مولانا محمد علی اور راجہ غلام حسین کے روابط کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مرحوم پر ایک نظم نظر بندی کے زمانے میں 'ہائے غلام حسین' ۱۹۱۸ء میں کہی اسکی تفصیل ہمدرد میں بیان کی ہے

"لیکن افسوس کہ پچھلے دور میں جن رفقا نے ساتھ دیا تھا وہ اب ہم سفر نہ تھے۔ غلام حسین کا نعم البدل پیدا نہ ہوا اور جو نوحہ ۱۹۱۸ء میں لکھا گیا تھا وہ پہلے سے زیادہ اب زبان پر آتا ہے۔"

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین کوئی دن اور بھی جئے ہوتے نمبر۲

ولایت علی بمبوق . کامریڈ میں گپ کالم لکھا کرتے تھے اور ان کا یہ کالم بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ مولانا محمد علی نے جب کامریڈ کا دوبارہ اجرا کیا تو انھیں راجہ غلام حسین اور ولایت علی بمبوق کی کمی محسوس ہوئی۔ چنانچہ رئیس احمد جعفری تحریر کرتے ہیں

"راجہ غلام حسین اور ولایت علی بمبوق جیسے یگانہ روزگار رفقاء سے وہ اس طرح محروم ہو گئے تھے کہ کامریڈ جیسا نکلنا چاہئے تھا۔ ویسا نہ نکال سکے۔"(۲۶)

ضیاءالدین برنی نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"نیو ایرا کے لکھنے والوں میں بھی وہی بزرگ تھے جو کامریڈ میں لکھا کرتے تھے۔اس میں ایک صاحب ولایت علی تھے۔جو بمبوق کے نام سے گپ کا کالم لکھا کرتے تھے۔"(۲۷)

رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے

"ولایت علی بمبوق کے مضامین دیکھنے کے لئے لوگ کامریڈ کے لئے بیتاب رہتے تھے۔"(۲۸)

اس کے علاوہ مجتبیٰ صاحب اور عبدالرحیم صاحب بھی تھے۔

کامریڈ کے دوسرے دور میں مولانا کو دورِ اول کی طرح رفیق کار نہیں مل سکے۔

شعیب قریشی صاحب جو بعد میں مولانا کے داماد بھی بنے اور عمر میں اپنی زوجہ گلنار بیگم سے بہت بڑے بھی تھے۔ مولانا ان کے بھروسے میں رہے مولانا کی متعدد تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوبارہ کامریڈ کا اجرا ان کے بھروسہ پر ہی کیا گیا تھا۔چنانچہ اپنے پیر مرشد قبلہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو اپنے خط میں تحریر کرتے ہیں

"شعیب صاحب کا انکار کا مجھے پہلے سے شبہ ہوتا تو عملہ مہیا کر لیتا تب کہیں کامریڈ کے دوبارہ اجراء کا خیال کرتا اور اگر مہیانہ کرتا تو جاری کرنے کی جرّت نہ کرتا"(۲۹)

عبدالماجد دریابادی ہمدرد کے آخری دور میں نگراں بھی رہے اور مولانا محمد علی کے رفیق کار بھی تھے۔انھوں نے تحریر کیا ہے ۔

"سب سے زیادہ انتظار شعیب صاحب کا رہا علی گڑھ کے ایک ایم ۔اے ایل۔ایل۔بی تھے۔لندن میں بیرسٹری پڑھے ہوئے تھے۔۔۔نیو ایرا لکھنؤ کو مدت سے سنبھالے ہوئے تھے۔۔۔گاندھی جی کی گرفتاری پر ینگ انڈیا کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔۔۔ان کے لئے

بہت کوششیں ہوئیں۔ ان کا دل نہیں پسیجا۔"(۳۰)

مولانا محمد علی نے کامریڈ کو لہو جگر سے سینچا تھا لیکن قوم کی بے حسی اور قوم میں علم کی کمی کا احساس انھیں بار بار آتا تھا۔ اپنے دل کا حال اپنے پیر مرشد کو خطوط میں تحریر کیا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں بھی اپنے مرشد قبلہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو دل کا حال لکھا ہے

ملکِ عبدالقیوم ۔ مولانا محمد علی نے ملک عبدالقیوم صاحب کو بلانا چاہا لندن سے مسلم آؤٹ لک نکال چکے تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنے مضامین ارسال کرتے تھے ان کا تعاون کامریڈ کے لئے اس سے آگے نہ بڑھا۔

مولانا کامریڈ کے لئے اس وجہ سے بھی اچھے انگریزی کے انشا پرداز کو بلانا چاہتے تھے کہ اپنا وقت 'ہمدرد' کو دے سکیں۔ چنانچہ قبلہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی خدمت میں تحریر کیا ہے ۔

> "اگر کوئی اور کام کرنا پڑتا ہے تو اتنی ہی دیر اخبار کی اشاعت میں لگ جاتی ہے۔ خواہ کام خانگی ضرورت کے مطابق ہو یا کسی قومی ضرورت کے باعث پورے پورے ہفتہ کی غلامی ایک کامریڈ ہی کرالیتا ہے۔"(۳۱)

مُبین الرحمٰن چونکہ صوبہ کی کونسل کے ممبر ہوگئے تھے اس لئے نہیں آسکے عبدالماجد دریابادی نے تحریر کیا ہے

> "مُبین الرحمٰن بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ کے مضامین مولانا نے بمبئی کرانکل میں پڑھے تھے اور انھیں بہت پسند کیا تھا مدتوں ان سے مراسلت رہی اور برابر ان کی آمد کا انتظار رہا بالآخر نہ آئے اور اپنے اور اپنے صوبہ کی کونسل کے ممبر ہوگئے۔"(۳۲)

"دو ماہ تک اشتہار دیا تب جا کر کہیں ایک صاحب ایسے ملے ہیں جو

> اچھی اردو میں میرا مفہوم غالباً ادا کر سکیں انگریزی وہ بھی کافی نہیں
> جانتے اس لئے کامریڈ کی عبارت کو کہیں کہیں نہیں سمجھتے مسلمان
> باوجود ایک جہان سے اعلانِ جنگ کرنے کے نہ صرف عربی میں کافی
> قابلیت نہیں رکھتے جس کا جاننا مذہب کے خیال سے مقدم تھا بلکہ وہ
> انگریزی بھی جس کا پڑھنا انھوں نے مقدم سمجھا نہیں جانتے۔ جو
> جانتے ہیں وہ سرکاری نوکریوں میں ہیں۔" (۴۴)

کامریڈ کے ایڈیٹوریل اسٹاف کے لئے جن حضرات کی درخواستیں آئیں ان میں محمد علی کے معیار پر پورا کوئی نہیں اترا جن ایک صاحب کی طرف مندرجہ بالا عبارت میں اشارہ کیا ہے ان صاحب کا نام مولانا محمد علی یا ان کے کسی معاصر نے نہیں بیان کیا ہے۔

مولانا محمد علی نے کامریڈ کے صفحات پر تاریخ اور تنقید کے اوراق کے ساتھ ظریفانہ کالم اور اس زمانے کی سیاست کا نقشہ پیش کیا وہ لاثانی ہے اس زمانہ کی تحریکات ان کا طریقہ کار انگریز کی جابرانہ 'عیارانہ پالیسی اور بین القوامی سطح پر مسلمانوں کا عروج و زوال اور ہندوستان کی آزادی کا ان سے تعلق ان موضوعات پر کامریڈ کے شمارے سے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ماخذ کامریڈ

(۱) پروفیسر محمد سرور مکتوبِ محمد علی، ص ۱۲۵ (۲) ایضاً ص ۲۵۳۔ ۱۴ر جنوری ۱۹۱۰ء ار نوساری بڑودہ اسٹیٹ کی کونسل

(۳) مؤلف محی الدین بدایونی ظریفات و مقالات، ص ۹۸۔ ۱۹۷ انجمن ترقی اردو کراچی

(۴) محمد سرور مکتوبِ محمد علی، ص ۲۶۰ بنام محفوظ علی بدایونی، ۲۹ر مئی ۱۹۱۰ء بڑودہ

(۵) ہمدرد ۲۳ر جنوری ۱۹۲۸ء (۶) محمد سرور مکتوبِ محمد علی، ص ۱۶۶ بنام عبدالماجد دریابادی، ۳۰ر اپریل ۱۹۲۸ء ۔ عبدالماجد دریابادی محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق ص ۱۷۴

(۷) ہمدرد ۲۳ر فروری ۱۹۲۵ء (۸) ایضاً ۲۳ر مئی ۱۹۲۵ء

۔اس شمارے کے آخری صفحے پر تحریر ہے

Printed by D 2 More at the Culture general Printing Company 400 Bow Bazar and Published by Mohd As 109 Ripin Road Culture

(۱۰) ۲۳ر جنوری ۱۹۲۸ء ہمدرد۔ (۱۱) ایضاً

نوٹ ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۲ء کو کلکتے سے آخری شمارہ کامریڈ کا نمبر ۱۰ جلد ۴ شائع ہوا۔ اور ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو جلد ۴ شمارہ نمبر ۱۱ دہلی سے شائع ہوا۔

(۱۲) تقاریر مولانا محمد علی صدیق بک ڈپو، ص ۱۰۔ (۹ر جنوری ۱۹۲۱ء کو تقریر کی)

(۱۳) مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے ص ۱۳ (ترجمہ۔ My Life a Fragement)

(۱۴) مترجم سرور بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے، صفحہ ۹۶

(۱۵) مرتبہ محی الدین بدایونی طنزیات و مقالات، ص ۱۱۹

(۱۶) مرتبہ محمد محی الدین بدایونی طنزیات و مقالات، سید محفوظ علی بدایونی، ص ۱۱۹

(۱۷) ہمدرد ۹ر فروری ۱۹۲۸ء

(۱۸) ماہنامہ جامعہ محمد علی نمبر اپریل ۱۹۷۹ء، مقالہ مولانا محمد علی ص ۴۷

(۱۹) مرتبہ، رئیس احمد جعفری علی برادران، مقالہ مولانا محمد علی، صفحہ ۳۵

(۲۰) مرتبہ رئیس احمد جعفری علی برادران، محمد علی اکیڈمی کراچی ص ۳۲ مقالہ ہاشمی فرید آبادی چند دن محمد علی کے ساتھ۔

(۲۱) محمد علی واتی ڈائری کے چند ورق، ص ۱ / ۳ ۷۔ ۱۹۵۴

(۲۲) ایضاً

(۲۳) عظمت رفتہ تعلیمی مرکز کراچی ۱۹۶۱ء ص ۶۱

(۲۴) جامعہ مقالہ ہفت وار کامریڈ، ص ۸۹ اپریل ۱۹۷۹ء

(۲۵) مضامین محفوظ علی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۶ء، ص ۱۳۲

(۲۶) ہمدرد ۲۳ر مئی ۱۹۲۵ء، صحافتی زندگی کے نشیب و فراز اور اسکی دشواریوں کا تذکرہ اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ راجہ غلام حسین رفاع عام کلب سے 'ہندوستانی' کے ایڈیٹر سے باتیں کرتے آرہے تھے کہ ایک گھوڑا ٹم ٹم سے اس طرح راسیں تڑا کر بھاگا کہ راجہ غلام سے ٹکراتا ہوا نکل گیا۔ موصوف گر پڑے۔ بے ہوش ہو گئے۔ بلرام پور اسپتال میں انھیں داخل کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ ہسپتال میں بے ہوش رہے اور ۲۵ر اگست ۱۹۱۷ء کو انتقال ہو گیا۔

(۲۷) رئیس احمد جعفری سیرت محمد علی، ص ۲۳۱

(۲۸) ضیاالدین برنی عظمتِ رفتہ، صفحہ ۶۱۔ گنج ہائے گراں مایہ، ص ۱۸۸ حیدر آباد دکن، سلطان بک ڈپو۔

(۲۹) مرتبہ ابو سلمان شاہجہاں پوری مکتوبات رئیس الاحرار، ص ۱۳۲

(۳۰) محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق ۱/ ۱۶۷، مولانا عبدالماجد دریابادی۔

(۳۱) مکتوبات رئیس الاحرار، ص ۱۳۳ ۲۵ مئی ۱۹۲۵ء

(۳۲) محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق ۱/ ۱۶۶

(۳۳) مکتوباتِ رئیس الاحرار ص ۱۳۲

(۳۴) محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق ۱/ ۱۶۶ عبدالماجد دریابادی۔

نوٹ کامریڈ میں مولانا محمد علی نے غالب کے کلام کا اکثر انگریزی میں ترجمہ شائع کیا ہے۔ غالباً یہ انگریزی ادب میں پہلی کوشش تھی۔ اس کے علاوہ اکثر علامہ اقبال کے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔

مولانا محمد علی جوہرؔ

جوہر اور ان کی شاعری

دہلی اور لکھنو کی سلطنتوں کی تباہی کے بعد، دہلی اور لکھنؤ کی شاہراہ پر صرف ایک ریاست رام پور باقی رہ گئی تھی۔ جہاں دونوں جگہ کے فنونِ لطیفہ کے ماہرین آکر آباد ہو گئے تھے۔ گھر گھر مشاعرے ہوتے تھے۔ صحبتوں میں دورانِ گفتگو اشعار پڑھنا عالم ہونے کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔ چنانچہ محمد علی مولانا عبدالماجد دریابادی کو اپنی نظر بندی کے دوران چھندواڑہ سے، اس زمانہ کے رامپور کے بارے میں لکھتے ہیں

> ”رامپور میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔
> امیر، تسلیم، جلال، عروج دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے
> ستارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔“(۱)

مولانا محمد علی کے گھر پر بھی اکثر مشاعرے ہوتے تھے۔ اس طرح انھیں بچپن سے ادبی ماحول ملا۔ شعر گوئی کا ذوق عام تھا۔ محمد علی کی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ انھوں نے دس سال کے سن میں بہت سے اشعار کہے تھے۔ داغ ان کے مکان کی پشت پر رہتے تھے۔ ذوالفقار علی خاں گوہرؔ (مولانا محمد علی کے برادرِ بزرگ) اور محمد علی کے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں کے علاوہ حافظ احمد علی شوقؔ داغؔ کے شاگرد ہوئے تھے۔

مولانا محمد علی اپنی تربیت کے سلسلے میں خود نوشت سوانح میں تحریر کرتے ہیں

> ”ہمارے بڑے چچا کا مردانہ مکان تھا۔ یہاں رامپور کے ہر طبقے کے
> لوگوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔۔۔ چونکہ ہم روہیلوں میں سے نہ تھے جن کی
> دلچسپیاں عام طور پر علمی ادبی کم اور فوجی زیادہ ہیں۔ اس لئے ہمارے
> چچا دوسرے رامپوریوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ان اہلِ علم و ادب

کو اپنے ہاں مدعو کرتے تھے جنھوں نے سیاسی انقلابات کے ہاتھوں دلی اور لکھنؤ کے درباریوں کی تباہی کے بعد رام پور کے دربار میں پناہ ڈھونڈی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی عالمانہ فاضلانہ باتیں میری عمر کے بچوں کی سمجھ سے بالا تھیں۔ لیکن ان سے مجھ میں کم از کم ایک ادبی استعجاب و تجسس ضرور پیدا ہوا۔" (۲)

محمد علی کے اس تجسس کو بڑے بھائیوں کی صحبت سے مزید تحریک ملی۔ ان کے برادر بزرگ ذوالفقار علی خاں گوہر نے داغ کے ہی کچھ اشعار انھیں یاد کرادے تھے۔ اور جب وہ گوہر صاحب کے ہمراہ داغ کے گھر گئے اور حضرت داغ نے محمد علی سے ان کا نام معلوم کرتے ہوئے کہا کہ کوئی شعر بھی یاد ہے؟ تو محمد علی جوہر نے داغ کے ہی چند اشعار سنادیئے۔ اس کے بعد ہمیشہ حضرتِ داغ کا اصرار رہتا تھا کہ اُس بچے کو بھی لایا کرو۔ محمد علی نے ان واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھا ہے:

"داغ نے پہلے دن پوچھا کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں۔۔ بھائی نے کچھ شعر یاد کروائے تھے۔۔۔ میں نے داغ کے ہی چند شعر انھیں سنادیئے۔ سن کر پھڑک گئے۔۔۔۔ میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں۔ اس کی توند پر کودا ہوں۔ اسے ہاتھی بنا کر اس کی پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔" (۳)

چنانچہ مولانا محمد علی کے ابتدائی کلام پر داغ کا اثر نمایاں ہے

غیر کا خط ہے کہ دل ہے کسی دلدادہ کا
کچھ تو ہے تم نے جو مٹھی میں چھپا رکھا ہے

مجھے انکار وصل غیر پر کیوں کر نہ شک گذرے
زباں کچھ اور بوئے پیرہن کچھ اور کہتی ہے
(۱۸۹۷ء)

۱۸۹۰ء میں مولانا محمد علی، علی گڑھ چلے گئے۔ یہاں فکر و نظر کی نئی راہیں کھلیں اور داغ کی شوخ نگاری، رندی اور شاہد بازی، مولانا کی شاعری کے مزاج کا حصہ نہیں بن سکیں۔ اس لئے کہ سر سید کی قومی اور جدید طرز فکر علی گڑھ کو اپنی فضا میں پوری طرح لپیٹے ہوئے تھی۔ شبلی کا درس طلبا میں سونے پر سہاگے کا کام کر رہا تھا۔ مولانا کو علی گڑھ میں شبلی کا قرب حاصل ہوا تھا۔ اور ان کے خیالات میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔

مولانا شبلی دار الاقامہ کے ہال میں روزانہ تفسیر پر لیکچر دیا کرتے تھے۔ مولانا محمد علی چھپ کر باہر کھڑے ہو کر سنتے تھے۔ بعد میں انھیں کلاس میں بیٹھنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ مولانا شوکت علی کی کتب میں شبلی کی 'المامون' بھی تھی۔ محمد علی نے اس میں سے بعض عربی اشعار اور ان کے معنی پڑھ کر یاد کر لئے تھے۔ ایک دن محمد علی نے اپنے بھائی مولانا شوکت علی کو ان عربی اشعار کا ترجمہ کر کے سنایا۔ جنھیں وہ پڑھ رہے تھے۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ان کے معلوم کرنے پر محمد علی نے بتایا کہ ان اشعار کا ترجمہ المامون سے یاد کیا ہے۔ اس کا تذکرہ مولانا شوکت علی نے علامہ شبلی سے کیا۔ محمد علی نے لکھا ہے

"لیکن پروفیسر صاحب کو اس کا یقین نہیں آیا۔ اور ان کی حیرانگی یہ سنکر اور بھی بڑھ گئی کہ میں گیارہ سال کی ناپختہ عمر میں اردو شاعری میں بھی ٹانگ اڑاتا ہوں۔" (۳)

چنانچہ مولانا محمد علی بلائے گئے۔ مولانا شبلی نے پہلے المامون کی اولاد کی فہرست مانگی۔ اس کا حلیہ پوچھا، جب اس میں پاس ہو گئے تو انھیں ایک مصرع دیا گیا۔ مولانا نے اس کا مصرع ثانی کہا گویا مولانا محمد علی امتحان میں پاس ہو گئے تھے۔

علی گڑھ کی فضا نے مولانا محمد علی کی شاعری میں آہستہ آہستہ مقصدیت پیدا کرنا

شروع کر دی۔ رندی اور شاہد بازی کے مضامین آہستہ آہستہ ان کی شاعری سے زائل ہونے لگے۔ علی گڑھ کے فیض نے مولانا کی شاعری میں ایک اور نمایاں تبدیلی پیدا کی کہ داغ جن مضامین کو مثلاً ہجر و صال، شوق و انتظار کو لذت کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ مولانا محمد علی کی شاعری میں یہ مقصدی اور معنویت میں تبدیل ہوتے گئے۔

محمد علی اپنی ابتدائی شاعری کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"علی گڑھ میں شاعری تو کچھ کی مگر وہی فرضی معشوق اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور سبزۂ خط وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بخابت کہہ لیتا ہوں۔ اور یہی ایک ذریعہ تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔ (علاوہ تلاوتِ قرآن پاک کے)" (۵)

تاریخ اسلام کے علاوہ اس وقت کے حالات نے بھی مولانا کی شاعری کو متاثر کیا۔ ہندوستان کی سیاست نشیب و فراز سے گذر رہی تھی۔ مولانا کی شاعری پر اس کا بھرپور اثر نظر آتا ہے۔ علی گڑھ، شبلی کے لیکچر تاریخ اسلام کے حق و صداقت کی جنگ لڑنے والے بعض کرداروں کے علاوہ اقبال کی شاعری اور خیالات نے بھی مولانا کو متاثر کیا۔ وہ جامعہ میں اسرارِ خودی اور رموزِ بےخودی پڑھاتے پڑھاتے رونے لگتے تھے۔ کامریڈ کے کالموں میں علامہ اقبال کے اشعار انگریزی کے قالب میں ڈھال کر ان پر وہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ مولانا کو اقبال کے سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ لیکن خلافت کے مسئلہ میں ان کی عدم ہموائی کی وجہ سے وہ ان سے برہم تھے۔ اور اقبال کی فکر و شعر دونوں کے دروازہ مولانا نے اپنے اوپر بند کر لئے تھے۔ مولانا کے مجموعہ کلام میں اہم موضوعات پر منظومات موجود ہیں۔ جن کے عنوان اس طرح ہیں۔ سر سید احمد خاں، استقبالِ رمضان، الوداع رمضان، ہائے غلام حسین، شانِ کلکتہ فغانِ دہلی، نوحہ شانِ حسین دعائے اسیر زائرِ مدینہ۔ ان موضوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شخصی عقیدت اور مذہبی عقیدے سے متاثر ہو کر منظومات کہی گئی ہیں۔ لیکن شانِ کلکتہ اور فغانِ دہلی وطن کی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ سر سید احمد خاں پر نظم انھوں

نے ۱۹۰۷ء میں کہی تھی اور لولڈ بوائز کے جلسے میں پڑھ کر سنائی تھی۔
دعائے اسیر انکی بیٹی آمنہ سے متعلق ہے۔ وہ جیل میں تھے کہ بیٹی کی سخت علالت کی اطلاع ملی۔ باپ ہونے کی حیثیت سے مولانا بیٹی کو صحت یاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مسلمان انھیں بھی وہی منظور ہے جو خدا کو منظور ہے۔

(۱) میں ہوں مجبور، پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

(۲) تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور، تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

(۳) تو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے قرآن میں کیا
تخرج الحیّ من المیّت مذکور نہیں!

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

مولانا اور اُن کی بیٹی کے درمیان 'زنداں' کی قیود حائل ہیں۔ اسلئے وہ خود کو پدر یوسف تصور کرتے ہیں

باپ کے دل کو تو یوسف کی طرح ہے وہ عزیز
نہ سہی حسن میں گر خلق میں مشہور نہیں

یاں بھی ہے یوسف و یعقوب میں زنداں حائل
میں ہوں محصور اگر آپ وہ محصور نہیں

میری اولاد کو بھی مجھ سے ملادے یارب
تو ہی کہہ دے تیری رحمت کا یہ دستور نہیں

مولانا محمد علی کی افتادِ مزاج، نظریات وخیالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ فطری طور پر شاعر تھے۔ اور قدرت نے انھیں ایک حساس دل دیا تھا۔ جو درد و سوز اور آرزو مندی کی دولت سے مالا مال تھا۔ نثر میں بھی انھوں نے جن موضوعات کو آئینہ دکھلایا تھا اُس میں بھی مسلمانوں کے عہدِ رفتہ کو تلاش کرنے کا جذبہ شامل تھا۔ اور اُن کی شاعری بھی اس جذبہ سے خالی نہیں تھی۔ انھوں نے قومی اور ملی مسائل پر اشعار کہے۔
اور کبھی کبھی وقتی حالات اور حادثات سے متاثر ہو کر نظمیں لکھیں۔

علی گڑھ پہنچنے کے بعد مولانا کے مذاقِ شعری میں کافی تغیر ہوا۔ اور شبلی کی شخصیت اور صحبت نے ان کے مذاقِ شعری پر کافی اثر ڈالا۔

انھوں نے ۱۹۰۷ء میں سر سید کی یوم پیدائش پر جو نظم کہی وہ ایک معروضے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بارے میں محمد علی نے لکھا ہے

"۱۹۰۷ء میں طلبا نے حکومت اور پولیس کی حمایت کے خلاف اسٹرائک کر دی تھی۔ اس اسٹرائک کے زمانے میں سر سید احمد خاں کی برسی بھی آئی۔ اس موقع پر میں نے ایک نظم لکھی تھی۔ جس میں سر سید احمد خاں مرحوم کو خطاب کر کے اور ان کے جانشینوں کی چاپلوسی سے تنگ آکر میں نے کہا تھا

؎ ہماری آرزو تم ہو ہماری مدعا تم ہو" (۶)

اس نظم میں نہ صرف سر سید احمد خاں کی اُن خدمات کا اعتراف ہے جو اُنھوں نے عوام کے لئے کیں۔ بلکہ انھوں نے اپنے جذبۂ عقیدت کے ساتھ اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ کالج کے طلبا میں قومی غیرت، خودداری اور قربانی کا جو جذبہ پیدا ہوا وہ سر سید احمد خاں کی تعلیم کا

نتیجہ ہے۔ یہ نظم مولانا نے ۱۹۰۷ء کے اولڈ بوائز کے جلسے میں پڑھ کر سنائی تھی۔

شانِ کلکتہ: یہ نظم کلکتہ میں ۹ر ۱۰ر ۱۱ر ستمبر ۱۹۱۸ء میں ہونے والے واقعات سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔

ان تاریخوں میں کلکتے میں ایک 'اسلامی جلسہ' ہونے والا تھا۔ گورنر بنگال نے اس جلسے کی منسوخی کا حکم صادر کر دیا۔ اس سلسلے میں مسلمانان جمع ہوئے کہ جلسہ کرنے کی اجازت لے لیں۔ لیکن دس ہزار کے اجتماع پر گولی چلادی گئی۔ اس واقعہ کے بارے میں اخبار دبدبہ سکندری رامپور (۱۶ر ستمبر ۱۹۱۸ء جلد ۵۴ صفحہ ۷ کالم نمبر۱) تحریر کرتا ہے

"امرت بازار پتریکا نے کلکتے کے چشم دید حالات بیان کئے ہیں۔ بلوہ اس وجہ سے ہوا کہ مسلمانوں کو یہ شکایت تھی کہ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ستمبر کو جو ایک بڑا اسلامی جلسہ ہونے والا تھا۔ جس کے لئے دور دور سے علما طلب کئے گئے تھے گورنمنٹ بنگال نے اس کو روک دیا۔ اس جلسہ میں انڈین ڈیلی نیوز کے ایک فقرہ کے خلاف اظہار ناراضگی کرنا مقصود تھا چند معزز مسلمانوں کا ایک وفد ۸ر ستمبر کو صاحب گورنر کی خدمت میں گیا تھا کہ اس جلسہ کی ممانعت کا حکم منسوخ کر دیا جائے جو حکومت کر چکی تھی۔ ذکریا اسٹریٹ میں دس ہزار مسلمان جلوس بنا کر چلے۔ پولیس نے ایک وفد نے انھیں تتر بتر کر دیا۔ ۲ بجے پھر ذکریا اسٹریٹ میں لوگ جمع ہوئے پولیس نے انھیں روکا لیکن ایک بلوائی نے پولیس کے ایک سارجنٹ کا ریوالور چھین کر حملہ کیا۔ مسٹر بارٹلی ڈپٹی کمشنر پولیس کی گردن پر کسی نے چھرے سے وار کیا۔ مارواڑیوں نے دوکانیں بند کرنا شروع کر دیں پولیس نے گولیاں برسائیں۔ لوگ مارے گئے۔ یہ لوگ مچھوا بازار، ذکریا اسٹریٹ، اور چیت پور روڈ پر جمع ہونا شروع ہوئے۔ پولیس نے ان پر گولیاں چلائیں۔ ۱۰ر ستمبر

کو بھر لوگ جمع ہوئے تاکہ اپنے ساتھیوں کو چھڑالیں۔ لیکن پولیس
نے انھیں منتشر کردیا۔"

محمد علی اس زمانہ میں نظر بند تھے۔ اور کلکتہ سے بہت دور لیکن کلکتہ سے انھیں ایک نسبت یہ بھی تھی کہ کامریڈ کا اجرا انھوں نے کلکتہ سے ہی کیا تھا۔ 'شان کلکتہ' کا محرک مذکورہ بالا واقعہ ہے۔ 'حق' کے لئے جان دینا محمد علی کے نزدیک 'ایمان' کی نشانی ہے۔ چنانچہ تحریر کرتے ہیں:

ہر سو ہیں لاشہ ہائے شہیدان سرخ پوش
ہے آج کل بہار پہ ایمان کلکتہ

یہ پوری نظم کلکتے کے شہیدوں کی تعریف و توصیف میں ہے۔

فغانِ دہلی مارچ ۱۹۱۹ء میں رولٹ بل کے خلاف دہلی میں ستیہ گرہ کیا گیا تھا۔ اور بازار بند کرانے کی کوشش کی گئی تھی۔ دو افراد گرفتار ہوئے انھیں آزاد کرانے کے لئے مجمع جمع ہوا۔ اور اسٹیشن کی جانب بڑھا لیکن انھیں پولیس نے گولیوں سے داغ دیا۔

مولانا نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر فغانِ دہلی کہی:

کلمہ حق ہے اگر ورد زبانِ دہلی
مٹ سکے گا نہ کبھی نام و نشانِ دہلی
لب پہ آئے نہ کبھی شکوۂ جور اغیار
ہو زمانے سے الگ طرز فغانِ دہلی

استقبالِ رمضان اور الوداع ماہِ رمضان، کے عنوان سے مولانا کی جو نظمیں ملتی ہیں ان کی تخلیق میں مولانا کا مذہبی جذبہ شامل ہے۔ پہلی نظم میں مولانا نے ماہِ رمضان کی فضیلت بیان کی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ اس نظم میں بہت سے اشعار بعض احادیث اور روایات کی بنیاد پر ہیں۔ یہ نظم مولانا کے مذہبی جذبے اور ان کے عقیدے کی ترجمانی کرتی ہے۔

الٰہی شکر تیرا پھر مہ صیام آیا
ماہِ صیام نہیں پھر عید کا پیام آیا
ہزار ماہ سے بہتر ہے ایک رات اس کی
اسی مہینہ میں اللہ کا کلام آیا
گھڑی وہ کیسی مبارک تھی کل جہاں کے لئے
حرا میں عرش سے جب اقرار کا پیام آیا
جب اپنی پوری جوانی پہ آگئی دنیا
تو زندگی کے لئے آخری نظام آیا
میں اس پہ بھیجوں درود و سلام کس منہ سے
کہ جس کے نام خود اللہ کا سلام آیا
صبور تمہارے لئے صدائے رحیل
ہو جاں بلب بھی تو کہہ دو ابھی غلام آیا
نبی ﷺ سے ملتے ہی اسلام کی سپر تھا وہی
جو بن کے کفر کی شمشیر بے نیام آیا

وداع ماہِ رمضان کو اس نظم کا ضمیمہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ نظم انھوں نے ۱۳۱۴ھ بیجاپور میں کہی تھی۔ اور اس کے مضامین بھی مولانا کے مذہبی نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ رمضان کی مولانا کی نظر میں کیا اہمیت تھی۔ اس کا اندازہ مولانا کے ایک مضمون سے ہوتا ہے۔ جو انھوں نے ۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں شائع کیا۔ تحریر کرتے ہیں

"۔۔۔۔اسلام کی جہاں ہر چیز اُس کو ایک بہترین نظامِ زندگی ثابت کرتی ہے اس پر دلالت کرتے ہیں خداوند کریم کی طرف سے طبیعت کو رجوع کرنا اور اس کے سامنے اس کے عجز کا اظہار کرنا۔ اسی کی غلامی میں اپنے تئیں سپرد کرنا اور اسی سے مدد مانگنا کوئی موحد نہ ہوگا جو

عبادت کے اس طریقے کو پسند نہ کرے۔"(۵)

رمضان جیل کی تنہائیوں میں مولانا کے لئے ایک روحانی لذت کا پیام لے کر آیا۔ اور اس کو مولانا نے ان الفاظ میں رخصت کیا۔

تجھ میں اترا آخری پیغامِ حق
تو ہی تھا شایانِ قرآن الوداع
الفراق اے ہم نشینِ صائمین
مونس شب زندہ داراں الوداع

مجموعی طور پر یہ دونوں نظمیں مولانا کے مذہبی جذبے کی آئینہ دار ہیں اور ان کے جذباتی اصولوں کی بھی نشاندہی کرتی ہیں۔ جس سے مولانا کا مزاج اور مولانا کی شاعری ہم آہنگ تھی۔

مولانا محمد علی چوں کہ تاریخ کے طالبِ علم تھے۔ اور ان کا دعویٰ ہے کہ انھیں جیل کی چہار دیواری میں تاریخ اسلام کو سمجھ کر پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ واقعاتِ کربلا کی پوری تاریخ ان کے سامنے تھی۔ اس لئے انھیں امام حسین علیہ السلام سے عقیدت ہونا ایک فطری بات تھی۔ اس عقیدت کی بنیاد صرف مذہبی نہیں ہے۔ حسین علیہ السلام کی شخصیت باطل کے مقابلے حق کی ایک علامت بھی ہے۔ مولانا خود بھی ملک کی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے۔ امام علیہ السلام کی زندگی کو انھوں نے اپنے لئے ایک مشعل راہ بنایا تھا۔ "نوحہ (شانِ حسین)" مولانا کے اس جذبہ کی نشاندہی کرتی ہے۔ امامِ حسین کی شہادت مولانا کے نزدیک فتح حسین ہے اس لئے اس شہادت پر انھیں فخر ہے

آج ہے امتِ احمد کے لئے فخر کا دن
آج کے روز ہوئی فتح نمایانِ حسین
حشر تک چھوڑ گئے ایک درخشندہ مثال
حق پرستوں کو نہ بھولے گا یہ احسان حسین

کربلا تب سے شہادت کا بنی ہے کلمہ
دین ہے امّی و عالم کا اب ایمان حسین

جو لوگ بغیر خوف وخطر حق کا ساتھ دیتے ہیں وہی اصل میں شیعانِ حسین ہیں۔

حق و باطل کی ہے پیکار ہمیشہ جاری
جو نہ باطل سے دبیں ہیں وہی شیعانِ حسین

مولانا محمد علی نے امامِ حسین کے پیکر میں وہ تمام چیزیں تلاش کیں جو ان کی افتادِ مزاج سے ہم آہنگ تھیں۔ بقول انور صدیقی

"ذاتی سطح پر امام حسین انھیں باطل سے عدم مفاہمت کا پیکر نظر آتے ہیں۔ وہ اسی طرح کی عدمِ مفاہمت کو اپنی شخصیت کا جز سمجھتے ہیں۔ اور انھیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ بھی سر فروشی کو باطل سے مفاہمت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ تخیلی طور پر اپنے آپ کو حضرت امام حسین سے وابستہ اور ہم آہنگ کرتے ہیں۔ اور اپنی پوری زندگی کو کربلا کا استعارہ سمجھتے ہیں۔"(۸)

علامت سازی کے اس عمل میں انھیں ایک طرح کی تائید، تسکین اور تکمیلِ خواہش کا سامان نظر آتا ہے۔ اور وہ کہہ اٹھتے ہیں

مطلب فرات سے ہے نہ آبِ حیات سے
ہوں تشنۂ شہادت و شیدائے کربلا

مولانا کے یہاں چوں کہ مذہب وسیاست میں بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ انھیں مذہب میں زندگی کے ہر شعبہ کا حل نظر آتا ہے۔ اس لئے سیاست کو وہ مذہب سے الگ نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کی مذہبیت اُن کی شاعری پر بھی چھائی ہوئی ہے۔ چوں کہ امام حسین 'حق' کی ایک علامت ہیں۔ اس لئے جب بھی کوئی واقعہ ایسا ہو کہ جہاں 'حق' کے لئے باطل سے ٹکرانا پڑے تو محمد علی ایسے واقعہ کو کربلا کی توسیع سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ واقعہ کربلا محض تاریخی

علاوہ کلام نہیں ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس شعر نے عالم اسلام کو دعوت و عزیمت کی راہ دکھائی مولانا کے اس شعر پر بعض حضرات کا یہ اعتراض ہے کہ "کربلا کا واقعہ ایک بار ہو چکا اس لئے 'ہر کربلا' کے بعد اسلام کے زندہ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ایسے حضرات غالباً مولانا کی شاعری کی روح اور پس منظر کو نہیں سمجھ سکے۔ مولانا محمد علی کے نزدیک واقعہ کربلا چونکہ تاریخ کے ایک مخصوص مرحلہ پر رونما ہونے والا واقعہ ہے۔ اور 'حق' و باطل کی جنگ ہمیشہ سے جاری ہے۔ اس لئے جب کبھی بھی کوئی مرحلہ ایسا پیش آئے جہاں 'حق' کے لئے کسی جابر یا ظالم سے ٹکرانا پڑے تو یہ ٹکراؤ کربلا کے واقعہ کی توسیع ہوگی۔ اور 'حق' کے لئے 'باطل' سے ٹکرانا چوں کہ مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ اس لئے فریضے کو پورا کرنا اسلام کو زندہ کرنے کے مترادف ہے۔

مولانا کی شاعری، شخصیت، صحافت اور اُن کی تقاریر کا مطالعہ کرنے سے آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ اُن کی زندگی کے ہر شعبہ پر ایک جوش چھایا ہوا ہے۔ اور یہ جوش اپنے ساتھ ایک مخصوص قسم کی جذبے کی صداقت لئے ہوئے ہے۔ جس کی بنیاد مذہب پر ہے۔ اس لئے انھوں نے اسلامی تاریخ سے ایسے کرداروں کے عمل کو اپنے لئے چُن لیا تھا جو ہندوستان کی آزادی میں معاون و مددگار ہو سکیں۔ تاریخ کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے اُنھوں نے ماضی کی طرف دیکھا۔ اپنی تاریخ سے کچھ علامتیں لیں۔ اور ان علامتوں کو اُنھوں نے اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔ کربلا اور متعلقاتِ کربلا کو انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے وسیع تر معنی میں استعمال کیا ہے۔ جس کی مثال اُردو شاعری کی تاریخ میں نہیں ملتی محمد علی چوں کہ ہر جہاد کو کربلا کے واقعات کی توسیع سمجھتے ہیں اس لئے ہندوستان میں انگریز کی استبدادی حکومت کے خلاف وہ کہہ اُٹھتے ہیں ۔

اس باغ میں خزاں کا نہ ہوگا گزر کبھی
کیا رنگ دیکھئے ابھی دکھلائے کربلا

ہے مقتلِ حسین کی اب تک وہی بہار
ہیں کس قدر شگفتہ یہ گل ہائے کربلا

کربلا کا واقعہ محمد علی کے نزدیک ایک ایسی مشعلِ راہ ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں صحیح اور حق بات کے لئے باطل سے ٹکرا جانے کا سبق دیتی ہے۔ اور یہ ٹکراؤ اُن کے نزدیک جنگ نہیں بلکہ جہاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد علی نے کربلا کو اپنا مرکز مان کر اس سے نکلنے والی مختلف شعاعوں کو اپنا رہبر مانا ہے۔ وہ ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوششوں کو ایک مستقبل جہاد تصور کرتے ہیں۔ مولانا کے نزدیک جابر اور ناانصاف حکومت کے زیرِ سایہ رہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یزید کی حکومت کے زیرِ سایہ رہے۔

اسلام کے ایسے کرداروں سے جنھوں نے بادِ مخالف کی زد پر صداقت اور دیانت کا چراغ جلایا مولانا کی ذہنی ہم آہنگی کوئی غیر فطری بات نہیں تھی وہ جن حالات میں گھرے ہوئے تھے اور انگریزوں کی استبدادی حکومت جو ملک کا استحصال کر رہی تھی اُس سے جس طرح سے نبرد آزما تھے اُس کا لازمی تقاضہ یہ تھا کہ وہ تاریخِ اسلام کے ایسے کرداروں کی طرف مائل ہوتے جو باطل سے مفاہمت کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ حضرت حسین علیہ السلام کی ذات ایسے کرداروں کا نقطۂ عروج تھی۔ اور اسی لئے بار بار تکرار کے ساتھ وہ ایک علامت بن کر مولانا کی غزلوں میں ظاہر ہوئی۔

چوں کہ مولانا کو یہ خدشات تھے کہ 'حق' و 'باطل' کی اس جنگ میں ممکن ہے کربلا کی طرح باطل کو وقتی فتح حاصل ہو اور انھیں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے اس لئے موت اور شہادت کا انتہائی خوشگوار تصور اُن کے کلام میں بار بار اُبھر کر آیا ہے۔

جی تے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

وہ طبعی موت کی نسبت جہاد میں شہید ہونے کی آرزو کرتے ہیں۔

؎ پیغام ملا تھا جو حسین ابنِ علی کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے
میں کھو کے تیری راہ میں سب دولتِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

مولانا کی غزلیات کا پس منظر قتل اور خون سے عبارت ہے۔ اس لئے ان کے اس جذبۂ سرفروشی سے خونِ شہدا نے خزاں رسیدہ چمن کو لالہ زار بنادیا ہے۔ اور یہ سرخی اُن کی غزلیات میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔

میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ
اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ

اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالا
اس سادگی پہ شوخیِ خونِ شہدا دیکھ

قاتل جوہرؔ کے ہاتھوں سے نہ چھوٹا حشر تک
کس بلا کا خون ظالم کی رگِ گردن میں تھا

شیفتہ کی ایک مشہور غزل ہے
؎ اٹھ صبح ہوئی مرغِ چمن نغمہ سرا دیکھ

مندرجہ بالا اشعار جوہرؔ نے شیفتہ کی زمین میں کہتے ہیں۔ چند شعر اور ملاحظہ ہوں۔

ہر رنگ میں راضی برضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

بہارِ خونِ شہادت دکھا گئے جوہر
خزاں میں اور یہ رنگِ شباب دیکھو تو

ایک حق پرست کی زندگی میں دار و رسن کا تصور لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔

جوہر نہ کیوں یہ رسم کہن زندہ کر چلیں
دار و رسن کے گرچہ نہ ہوں بانیوں میں ہم

اے مسیحا اس مرض سے کون چاہے گا شفا
دار پر موت آئے اس کی بھی کوئی تدبیر ہے

پاداشِ جرمِ عشق سے کب تک مفر بھلا
مانا کہ تم رہا کئے دار و رسن سے دور

یہ بھی کیا پیروی حق ہے کہ خاموش ہیں سب
ہاں اناالحق بھی ہو، منصور بھی ہو دار بھی ہو

محمد علی کی شاعری کا اصل جوہر اُن کی غزلیات میں ہے انھوں نے اپنے جذبے اور احساسات کی شدت کے ساتھ اپنے قومی جذبات کا اظہار اپنی غزلیات میں کیا ہے۔ 'عشق' مولانا کی شاعری کی روح ہے۔ اس میں جان اس جذبۂ عشق کے ہی ذریعہ پیدا ہوئی۔ یہ عشق ہے قومیت کا' ملت کا وطن کا اور ہندوستان کی آزادی کا۔

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور
جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور

مست مے الست کہاں؛ اور ہوس کہاں
طرز وفائے غیر ہے اپنے چلن سے دور

گر بوئے گل نہیں، نہ سہی یادِ گل تو ہے
صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تیری انتہائی کے بعد

مولانا کا عشق صادق تھا۔ اس میدان میں وہ 'نقدِ جاں' بھی دینے کے لئے تیار تھے۔ عشق کی آگ نے اُن کے وجود کو پگھلا اور گھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ 'نو چینج' کی پالیسی پر قائم تھے۔ اس لئے وطن کی آزادی کے لئے اپنی جان کی بازی لگانا وہ عین سعادت سمجھ رہے تھے۔

دے نقدِ جاں تو بادۂ کوثر ابھی ملے
ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ مے ادھار دے

رہ رو تھا عشق کا منزل کو پالیا
اب اور کیا نشان میری لوحِ مزار دے

قتل، خنجر، تیغ، قاتل، بسمل، صیاد، قفس، نزع یہ ہماری کلاسیکل غزل کی علامات ہیں۔ مولانا نے ان علامات کو ہندوستان کی آزادی کے جہاد میں جان دینے کے لئے استعمال کیا ہے ملاحظہ ہو

رہرو تھا عشق کا منزل کو پالیا
اب اور کیا نشان میری لوحِ مزار دے

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

کچھ بھی وہاں نہ خنجرِ قاتل کا بس چلا
روحِ شہید رہتی ہے نعش و کفن سے دور

گویا ہے لاش بھی تو تمہارے شہید کی
پیہم صدا بلند ہے ھل من مزید کی

ستم سے کچھ نہ ہوا اب کھلا ستم گر پر
ابھی کچھ اور بھی باقی ہے قتلِ عام کے بعد

ہو کچھ بھی مگر شورِ سلاسل تو نہیں یہ
جوہر کا تڑپنا دم بسمل تو نہیں یہ

یہ تمام علامات ہماری کلاسیکل غزل کی روائتی شاعری میں بھی موجود ہیں۔ لیکن مولانا کی کسی بھی غزل کو دیکھئے اس میں حق کے لئے جان کا گنواں دینا، قاتل کے ہاتھوں مارا جانا، 'خنجر قاتل کا بس'، نہ چلنا۔ یہ تمام الفاظ، اور مضامین بار بار استعمال ہوئے ہیں۔ جس سے اُن کے مزاج کی کیفیت، جذبے کی سرشاری اور وطنِ عشق میں ڈوب کر اُس کو آزاد کرانے کی خواہش کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا پر ملک کی آزادی کا جوش اس حد تک چھایا ہوا تھا کہ وہ بار بار کہتے ہیں کہ جو 'راہِ حق' میں یا وطن کے عشق میں موت سے فرار حاصل کرتا ہے اس کی زندگی زندگی نہیں۔ ابھی تک اس سلسلے میں جو مثالیں دی گئیں ہیں وہ ان کی مختلف غزلیات سے چنے گئے شعر تھے۔ لیکن اسی موضوع پر ان کی مشہور غزل ملاحظہ فرمایئے جس کے بارے میں گوپی چند نارنگ نے تحریر کیا ہے

"مولانا نے اگر اور کچھ نہ لکھا ہوتا اور یہی غزل کہی ہوتی تو بھی اُردو کے جریدۂ شعر پر ان کا نام ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتا۔" (۹)

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تیری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو

باقی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے

میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل

حل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں

آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

غیروں پہ لطف ہم سے الگ حیف ہے اگر

یہ بے حجابیاں بھی ہوں عہدِ حیا کے بعد

ہے کس کے بل پہ حضرت جوہر یہ روکشی

ڈھونڈیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد

معمولی شاعر اس طرح کی شاعری کرتے وقت اپنی شاعری کو نعرے بازی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لیکن مولانا محمد علی جوہر کا کمال یہ ہے کہ اُن کی شاعری 'حدیثِ حسن' بنی ہوئی ہے۔ فکر کے ساتھ اُن کی فن پر بھی دسترس ہے۔ اس طرح اُن کی شاعری کی مقصدیت سے جو کرنیں پھوٹتی ہیں وہ ان کے فانوسِ فن کو اور منور کر دیتی ہیں۔

یقین آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا

تیری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر

ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

مولانا محمد علی نے دوسرے شعرا کی زمین میں بھی بہت اچھے اشعار نکالے ہیں۔
غالب کا مصرع ہے

~ تم خدا وند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

مندرجہ بالا اشعار جوہر نے غالب کی اس زمین میں کہے ہیں۔ مزید اشعار ملاحظہ ہوں :

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پر موقوف ہے کیا اور سہی

خوف غمّاز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

ربّ العزّت کے لئے بھی رہنے دو خطاب
تم خدا وند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

مولانا محمد علی کے مجموعہ کلام کے متعدد ایڈیشن ان کے زمانے سے لیکر آج تک شائع ہو چکے ہیں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے ۱۹۸۳ء میں سخنِ جوہر مرتبہ اختر بستوی شائع کیا تھا۔ اس میں مولانا کی ایک غزل کی مزید نشاندہی کی گئی تھی۔ مولانا کا بہت سا ایسا کلام ہے جو مختلف جنتریوں گلدستوں اور رسائل میں شائع ہوا ہے۔ اولڈ بوائز ستمبر ۱۹۱۰ء میں پہلا شمارہ شائع ہوا۔ اس کے پہلے شمارہ میں اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے ایڈیٹر ابو حامد عشرت نے تحریر کیا ہے :

"اولڈ بوائز کیا ہیں۔۔۔ اولڈ بوائز کالج کے ہی بار آور شجر ہیں۔ اور اس کی آئندہ ترقی انھیں کی سعی، متانت و سنجیدگی، کوشش اور ذاتی قابلیت سے وابستہ ہے۔" (ص ۳ تا ۵)

اولڈ بوائز کے اجرا کے بعد یہ رسالہ جیسے ہی ان حضرات کے پاس پہنچا جو اس کے طلبا رہ چکے تھے۔ اور اب اپنی سماجی اور عملی زندگی سے وابستہ تھے، انھوں نے اس کا خیر مقدم نظم و نثر میں

کیا۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے بھی اپنے جذبات کا اظہار منظوم کیا ہے۔ یہ نظم ان کے مجموعہ کلام میں موجود نہیں ہے۔

زمانہ جن کو بھلا چکا تھا وہ پھر فسانے سنائے تو نے
ہوئے تھے جو دل محو نقشے ہمیں دوبارہ دکھائے تو نے
بہت سنبھل کر بگڑ گئے تھے ہزاروں مل کر بچھڑ گئے تھے
بہت سے بگڑے ہوئے سنبھالے بہت سے بگڑے ملائے تو نے

سبق اخوت کا بھول بیٹھے تھے گم گئی تھی کتاب الفت
پڑھایا آموختہ دوبارہ پرانے گر پھر بتائے تو نے
یگانے بیگانے ہوگئے تھے رہی تھی یاروں میں بھی نہ یاری
مگر بلا کا اثر ہے تجھ میں پرانے اپنے بنائے تو نے

ہوا تغافل کی چل رہی تھی، چمن میں مرجھا رہی تھیں کلیاں
ہوا چلائی کچھ ایسی آکر کہ سوکھے غنچے کھلائے تو نے
اگرچہ تھے کچھ نیاز والے مگر زیادہ تھے ناز والے
نیاز والوں کو گر نوازہ تو لاکھوں روٹھے منائے تو نے

کہیں قیامت کا صور پھونکا کہیں پکارا ہے قم باذنی
ہزاروں سوتے جگائے تو نے ہزاروں مردے جلائے تو نے
مگر یہ طرفہ ہے ابرِ رحمت چلا ہے کاشی سے سمتِ کویل
یہ کیسی گنگا بہائی الٹی یہ کیا کرشمے دکھائے تو نے

کویل = علی گڑھ کا نام

اولڈ بوائز بنارس ماہ اکتوبر ۱۹۱۰ء۔ ص ۲۱ ایڈیٹر ابو حامد عشرت۔

ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۳ء اولڈ بوائز میں سر سید احمد خاں پر نظم عرضداشت کے عنوان شائع ہوئی کل (۴۲، اشعار ہیں)

محمد علی پر الزام ہے کہ اُن کے جذبات میں شدت تھی۔ اس لئے زندگی کے بعض شعبوں میں وہ توازن قائم نہ رکھ سکے۔ ایک عاشق کے جذبہ کی بنیاد ہی شدت پر ہوتی ہے۔ چاہے وہ مجازی ہو یا حقیقی یا ملک و قوم کا، لیکن اس میں صداقت شرط ہے۔ مولانا کے وہ اشعار جو خالص غزل کے ہیں ان میں جذبے کی صداقت کے ساتھ ساتھ ایک عاشق کے آداب کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ماخذ: جوہر اور ان کی شاعری

(۱) مطبوعہ محمد علی محمد سرور، ص ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۶ر اگست ۱۹۱۹ء مکتبہ جامعہ دہلی اکتوبر ۱۹۴۰ء
(۲) مطبوعہ محمد علی محمد سرور، ص ۱۲۵۔۱۲۵، ۱۶ر اگست ۱۹۱۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی اکتوبر ۱۹۴۰ء۔ محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق عبدالماجد دریابادی۔
(۳) ماہنامہ جامعہ، دہلی، مولانا محمد علی نمبر، اپریل ۱۹۷۹ء، ص ۱۸ (مولانا محمد علی کی آپ بیتی) محمد سرور۔ (مترجم)
(۴) مطبوعہ محمد علی محمد سرور صفحہ ۱۲۷، یہ خط انھوں نے نظر بندی کے دوران لکھا تھا۔

محمد علی نے علی گڑھ میں 'چاندنی' کے مشاعرہ کی بھی بنیاد ڈالی تھی۔ جو چاند کی چودہ تاریخ کو ہوتا تھا۔ کرکٹ لان جائے مشاعرہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ بارش کی وجہ سے مشاعرہ لان میں نہیں ہو سکا تو محمد علی نے اس کا انتظام ڈائننگ ہال میں کر دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی غزل میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا تھا۔

فرشِ زمرد نہیں وہ چاندنی نہیں
لطفِ مشاعرہ تو گیا چاندنی کے ساتھ

(۵) ہمدرد ۱۰ر جنوری ۱۹۲۷ء۔ یہ نظم اولڈ بوائز علی گڑھ ستمبر، اکتوبر ۱۹۱۳ء میں 'مضمون' پر شائع ہوئی ہے۔
(۶) ہمدرد ۳۱ر مارچ ۱۹۲۷ء۔ مضامین محمد علی محمد سرور (مرتب) ص۔ ۲۹، ۱۹۳۸ء جید پریس دہلی
(۷) جامعہ مولانا محمد علی نمبر حصہ اوّل اپریل ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۲۶
(۸) گوپی چند نارنگ مقالہ واردات قتل، ہماری زبان ۲۲ر جنوری یکم فروری ۱۹۷۹ء
(۹) مولانا کی یہ غزل ماہنامہ معارف مئی ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ اور ان کے مجموعہ میں بھی شامل ہے۔

کلام جوہر بخط جوہر

بیسویں صدی کا مردِ مومن رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کا پیام زندانِ فرنگ سے بیمار بیٹی آمنہ کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا غالب الا اللہ

جیل خانہ بیجاپور

۲۱ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ
۵ اگست ۱۹۲۳ء

پیامِ محبس و دعائے اسیری برائے آمنہ

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں ! — تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں !

اوس کی رحمت سے جو مایوس ہو وہ کافر ہے — ہم تو توکّل سے کسی وقت بھی معذور نہیں

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہے وہ کیا — جو ہر اک حال میں اُمید سے معمور نہیں

صبر ہی شیوۂ مسلم ہے تو ہے شکرِ خدا — نورِ اسلام سے دل آج بھی بے نور نہیں

ہے دعا اور دعا فرض، ولے حکمِ خدا — ٹل سکے یہ کسی بندے کا بھی مقدور نہیں

ہم کو منظورِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ — اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اوس کو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں !

اے دعا لب پہ پھر جاری ہو اگرچہ اوس سے — یوں بھی حالِ دلِ مضطر کبھی مستور نہیں

بیسویں صدی کا مردِ مومن رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کا پیام زندانِ فرنگ سے پیاری بیٹی آمنہ کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

پیامِ محبّی و دعائے اسیری برائے آمنہ

جیل خانہ بیجاپور

۲۱ ر ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ

۵ ر اگست ۱۹۲۳ء

میں ہوں مجبور، پر اللہ تو مجبور نہیں!
یا تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں!

اُسکی رحمت سے جو مایوس ہو وہ کافر ہے
ہم توکّل سے کسی وقت بھی معذور نہیں

امتحان سخت سہی، پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر ایک حال میں اُمید سے معمور نہیں

صبر بھی شیوۂ مسلم ہے مگر، شکرِ خدا
نورِ اسلام سے دل آج بھی بے نور نہیں

ہے دعا اور دوا فرض، ولے حکم خدا
ٹل سکے یہ کسی بندے کا بھی مقدور نہیں

ہمکو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُسکو
نہیں منظور، تو پھر ہمکو بھی منظور نہیں،

لب دعا لب پہ بھی جاری ہو، اگرچہ اس سے
یوں بھی حالِ دلِ مضطر کبھی مستور نہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

غزل

یاں تو ہے نام عشق کا لینا(۱) اپنے پیچھے بلا لگا لینا

شرط تحریر پہلے سُن لے پھر خامے کو ہاتھ میں، ولا، لینا

نامہ شوق انکو شوق سے لکھ غیر کو بھی مگر دکھا لینا!

کل کو بوسے کے واسطے بھی ضرور شرط ہوگی اُسے جتا لینا!

اگر آئے طبیب مرگ کہیں دوستو! ہمکو بھی بلا لینا

ہے جو مومن، تو بھول کر بھی، ولا، نہ کبھی نام ماسوا لینا

دعویٰ توحید کا تو کرتا ہے، نفس کو مت خدا بنا لینا!

ہم پھریں تجھ سے یہ نہو، یارب، اس سے پہلے ہمیں اٹھا لینا!

تمکو روز جزا کا کیا ڈر ہے؟ داور حشر کو ملا لینا!

ورنہ ہے یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل شاہدوں تو سیکھا پڑھا لینا!

ہوا ادھر بھی کبھی نگاہِ کرم ہم غریبوں کی بھی دعا لینا

زلف رہنے دو ہاں، نقاب ذرا رُخِ محبوب سے ہٹا لینا

آج جی بھرے دیکھ لینے دو کل کو دل کھول کر ستا لینا

اس بگڑنے کی کیا سند، اے دل، شام تک پھر اُنہیں ملا لینا

وصل کی شب نہ چھیڑ قصہ ہجر یہ کسی اور دن سنا لینا

زہر ہی ہو، مگر وہ دیں تو نہیں! مجھکو لگتا ہے کیا بُرا لینا

اُنکے در سے زکوۃ حسن اگر گالیاں بھی ملیں تو کھا لینا

ساقیا، دیکھ، تشنہ کام نہ جائیں ذبح سے پہلے کچھ پلا لینا

غیر سے دوستی کرو، لیکن پہلے کچھ روز آزما لینا

طالب خلد، مزہ عشق پر اب ہوگیا ہے تجھے روا لینا

ایک ہی جام اور یہ سر مستی ساقیا، دیکھ! میں چلا، لینا؟

تمکو زیبا نہ تھا وداع کے وقت
آنکھ جوہر سے یوں چرا لینا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

مطلعِ ثانی

مل چکا تجھ سے صلہ ہمکو وفاداری کا
تجھ کو آیا نہ سلیقہ کبھی دلداری کا

طفلِ مکتب ہے ترے سامنے خود چرخِ کہن
کس سے سیکھا ہے یہ اندازِ دل آزاری کا

عقل والا کوئی بچتا نہیں پھندے سے ترے
گو بہت عام ہے شہرہ تیری عیاری کا

ہمکو خود شوقِ شہادت ہے، گواہی کیسی؟
فیصلہ کر بھی چکو مجرمِ اقراری کا

میری شہرت بھی اگر ہوگی تو کیا؟ قتل بھی کر
نام ہو جائیگا تیری بھی ستمگاری کا!

کیا قباحت ہے؟ میرے قتل سے شہرت ہی سہی
نام ہو گا نہ بھلا تیری ستمگاری کا

قاتل اب دیر ہے کیا؟ جام شہادت دے چک
ہو گیا وقت کبھی کا مری افطاری کا!

تو ہو آمادہ جو، اے دل تو ہے پھر دار بھی ہیچ
آزما دیکھ، یہ سب کھیل ہے تیاری کا!

سب ہیں فانی، غمِ دنیا نہ رہا ہم نہ رہے
رہ گیا نام غمِ عشق کی غم خواری کا!

تو تو ہم سب کو یہیں چھوڑ چلا، اے جوہر!
شور سنتے تھے بہت تیری وفاداری کا!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ

جولائی ۱۹۲۳ء

ہم معنیٔ ہوس نہیں اے دل ہوائے دوست — راضی ہو بس اسی میں ہو جس میں رضائے دوست

طغرائے امتیاز ہے خود ابتلائے دوست — اُسکے بڑے نصیب جسے آزمائے دوست

یاں جنبشِ مژہ بھی گناہِ عظیم ہے — چپ چاپ دیکھتے رہو جو کچھ دکھائے دوست

ملتی نہیں کسی کو سند امتحاں بغیر — دار و رسن کے حکم کو سمجھو صدائے دوست

یعقوب پر فضول ہوئے لوگ خندہ زن — یاں لامکاں سے آتی ہے بوئے قبائے دوست

کیا کم تھا ہجر یار ہی، پھر اُس پہ رشکِ غیر — دشمن کو بھی خدا نہ کرے مبتلائے دوست

ہے روح بھی نثار، بدن بھی نثار یار — دل بھی فدائے دوست، جگر بھی فدائے دوست

جوہر وہ صبر آپ ہی دیگا، اگر ہمیں

ہے اعتبار وعدہ صبر آزمائے دوست

چھپتی کب چھپائے سے جوہر ادائے دوست؟ — دشمن کی دشمنی ہے فقط ابتدائے دوست

دینا تھا داد تشنہ بنی یوں حسینؓ کو — کوثر کا اک بہانہ بنی کربلائے دوست

کیا جانیں کوئے یار میں یوں اذن غیر سے — ہے انتظار، دیکھئے کبتک بلائے دوست

اُس نغمۂ الست کی کچھ دلکشی نہ پوچھ — کانوں میں آرہی ہے اب تک صدائے دوست

چھپتا نہ بزمِ غیر میں بھی رازِ دل، مگر — دشمن کے آگے کون کہے ماجرائے دوست

دیر و حرم میں کرتے ہو یہ کس کی جستجو — حیرت کی جا ہے دوستو، ہے دل میں جائے دوست

اک ہم ہیں خاکِ پا بھی میسر نہیں جنہیں — یا ایک تھے بصیری کہ پائی ردائے دوست

جائز ہے وصل و ہجر کا کب امتیاز یاں

جوہر جفائے غیر کو سمجھو وفائے دوست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا غالب اِلا اللہ

غزل

بس ساتھ اس ماہ میں رمضان کا یہاں تک
اب دیکھیئے جیتے بھی ہیں اگلے رمضان تک!

کوثر پہ کھلا کیوں نہ اجل، آج کا روزہ؟
پہنچانہ دیا ہم کو درِ پیر مغاں تک؟

یکبار گی ہر قید سے ہو جائے رہائی
جا پہنچیں جو زنداں سے کہیں باغِ جناں تک

گھبرا کے کہنے، ولا تو تو ابھی سے
ہے صبر کی حد بھی کوئی؟ ہو صبر کہاں تک؟

یاں جنبشِ مژگاں بھی ہے اک جرم مگر ہے
مطلوب تجھے فرصت فریاد و فغاں تک

اقرار ہے یہی مکتب تسلیم و رضا کی
وہ سر بھی اڑا دیں تو ہلانا نہ زباں تک!

تو شوق سے کر ظلم، نہ ڈر قحطِ وفا سے
سستی ہے ترے واسطے یہ جنبش گراں تک

اس بارگہِ حسن کو کیا اس سے سروکار؟
سرحدِ ہوس جاتی ہے بس عشقِ بتاں تک

جوہر سا سیہ کار، اور انجامِ شہادت!
اُس سے تو کسی کو بھی نہ تھا اس کا گماں تک

اشعار متفرق جو بعض غزلوں کے منظوم ہونے کے بعد کہے گئے۔

بقائے بے فنا کا راز تو کیا جانے اے قاتل!
میری ہستی ترے نزدیک مشتِ استخواں تک ہے

یہ کیا کہتا ہے صوفی؟ رند اور محروم کوثر سے؟
ارے، ان میکشوں کا سلسلہ پیرِ مغاں تک ہے

پھر وہی تو ہے وہی صحبت ولا
یہ فقط دو چار دن کی بات ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

غزل

کیوں شہر چھوڑ جا کے بسیں دہقانیوں میں ہم
مجنون کے ساتھ ہو گئے بیابانیوں میں ہم

آزاد بھی جبھی سے ہیں ہم، ہوشیار بھی
جب سے ہیں اے جنون تیرے زندانیوں میں ہم

نادانیاں ہزار سہی دوستوں، مگر
دانا بھی ہو گئے انھیں نادانیوں میں ہم

کب شوقِ جلوہ سے ہے یوسف، یہاں مفر؟
زندانیوں میں تم ہو، گریبانیوں میں ہم

محروم گو حرم سے رہے، پر رہے نصیب!
داخل تو آج ہو گئے قربانیوں میں ہم

ہنگامے روز روز کے خوگر بنا گئے
اب خوش ہیں آئے دن کی پریشانیوں میں ہم

واقف نہ تھے کشش سے زلیخا کے عشق کی
یوسف کو ڈھونڈتے رہے کنعانیوں میں ہم

نارِ جحیم سے نہیں کچھ کم جسے
محسوس کر رہے ہیں پشیمانیوں میں ہم

گر ہے تجھے متاعِ قفس اسقدر عزیز
صیاد خوش ہیں تیری نگہبانیوں میں ہم

پیچھا چھڑا لیں اور اک اس قفس سے تو پھر
فارغ ہوں خوب بے سروسامانیوں میں ہم

بن بن کے روز وصل کے نقشے بگڑ گئے
آباد پھر بھی ہیں انہیں ویرانیوں میں ہم

شوکت کا قول ہے وہ تن و توش جب نہیں
پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

یہ ظلم ہے کہ سب کو کریں ایک سا خیال
پلتے ہیں عقل بھی کبھی شر دانیوں میں ہم

ہم زندہ دل ہیں زندۂ جاوید، یا کہ خضر؟
بچوں سے اب بھی کم نہیں شیطانیوں میں ہم

جوہر نہ کیوں یہ رسمِ کہن زندہ کر چلیں؟
دار و رسن کے گرچہ نہوں بانیوں میں ہم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

غزل

عالم میں آج دُھوم ہے فتحِ مبین کی
سن لی خدا نے قیدیِ گوشہ نشیں کی

شیطانِ جلد باز کا جادو نہ چل سکا
تفسیر آج ہوگئی کیدی متین کی

ایمان واثق ہو اگر غیب پر تو پھر
بوائے ہر امید سے حق الیقین کی

ہے نامِ مصطفٰے کی یہ برکت کہ پھر خدا
یوں جڑ جما رہا ہے محمدؐ کے دین کی

تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کردیا
اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی

اک گھر تیرا یہاں بھی تو ہے اُسکے باب میں
کب لامکاں سے ہوگی مشیت مکین کی؟

ہمکو بھلا عزیز نہو کیوں وہاں کی خاک
سرحد ملی ہو عرش سے جس سرزمین کی

اُس آستانِ پاک پہ گھستا ہے چل کے سر
سجدوں سے اور بڑھتی ہے رفعت جبین کی

ہیں سب عرب میں شام، فلسطین اور عراق
ہے شرط جس کے واسطے صرف ایک دین کی

بھر خدا یہود و نصاریٰ کو دو نکال
یہ ہے وصیّت اُس کے رسولِ امین کی

وہ انبیا کا مولا و مدفن سپرد ہے
ختم الرسل اور اُس کے ہر اک جانشین کی

چودہ برس جو قبلہ رہا ہے رسولؐ کا
قیمت ہے اپنا خون اُسی کی زمین کی

تینوں حرم ہیں اس کے جو ہے لاشریک لہٗ
ترکیب ہے درست یہی ایک تین کی

وہ خود یہی کہہ رہا ہے کہ مانگو مدد مگر
ایاک شرط یاد ہے نستعین کی

غافل، خدائے قہر سے دیتی نہیں پناہ
سدِّ سکندری ہو، کہ دیوا چین کی

تعظیم لازمی تھی شہیدوں کی ورنہ یوں
اُٹھتی نہ آنکھ خلد میں ہر حور عین کی

ہے رخشِ عمر آپ ہی منزل کے لب قریب
حاجت ہمیں رکاب کی باقی نہ زین کی

کھادی کے بعد جیل کا خلعت جنہیں ملا
کرتے نہیں تمیز سے موٹے مہین کی

ہے بدترین عذاب یہی اک شریف پر
یارب کرائیو نہ اطاعت کمین کی

ناکس بوالہوس سرشے لینے چلے تم بہر دادِ عشق
جوہر ضرور کیس سنے کی قدر مبین کی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لاغالب الا اللہ

غزل

قید، اور قید بھی تنہائی کی! شرم رہ جائے شکیبائی کی
سوجھتا کیا ہمیں ان آنکھوں سے شرط تھی قلب کی بینائی کی
ورنہ خانہ سے بڑھنے ہی نہ پائے گرچہ اک عمر جبیں سائی کی
قیس کو ناقۂ لیلیٰ نہ ملا گو بہت بادیہ پیمائی کی
ہم نے ہر ذرّہ کو محمل پایا ہے یہ قسمت ترے صحرائی کی!
وقف ہے اور اسکے لئے جان عزیز کعبہ کے خادم و شیدائی کی
کعبہ و قدس میں گھر کیا؟ یہ بھی اک ادا ہے مرے ہرجائی کی
نظر آیا ہمیں ہر چیز میں تو اس پہ یہ دھوم ہے یکتائی کی!
عشق اور جورِ ستمگر کا گلہ! حد ہے، اے دل، یہی رُسوائی کی!
عقل کو ہم نے کیا نذرِ جنوں عمر بھی میں یہی دانائی کی!
کرگئی زندۂ جاوید ہمیں تیغ قاتل نے مسیحائی کی!
طارق اچھا رہے، یارب، کہ یہ ہے میری اولاد، میرے بھائی کی
جو نہ تقلید، دلا، عقل میں کہیں موئی سے تمنائی کی

کل کو ہے پھر وہی زنداں جوہر
ٹھیک کیا آپ سے سودائی کی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

غزل

جان تو دے سکتے ہیں عزت نہ ہوں دلداروں کی — ہو نہ اب اتنی بھی اوقات وفاداروں کی ؟

زخمِ دل کا انہیں بھولے سے بھی آیا نہ خیال — کون لیتا ہے دعا ایسے تمکنواروں کی ؟

کہدو رضواں سے نہیں سایۂ طوبے درکار ! — اپنی جنت ہے یہیں چھاؤں میں تلواروں کی

بوجھ میرا نہ اٹھائے کوئی محشر میں تو کیا — دستگیر آپ جو رحمت ہے گنہگاروں کی '

ہے محمدؐ کی شفاعت تو خدا کی رحمت — حشر کیا، عید ہے اُمت کے گنہگاروں کی '

روز کچھ مرتے ہیں پھر بھی نہیں درماں کا خیال، — حالت اچھی ہے ابھی آپکے بیماروں کی '

سر فروشانِ جفا کش کے سروں کی قیمت — اور بھی بڑھ گئی قلت سے خریداروں کی

کرچکے پانوں تو مہمانی خارِ صحرا — سر بھی دعوت کرے اب شہر کی دیواروں کی

کہدو ان گوشہ نشینوں سے بھریں گودہ قبر — نہیں دنیا میں جگہ آپسے بیکاروں کی

ایک ہی دو سہی، پر کچھ تو پہنچتیں دل تک — نوکیں رہ جاتی ہیں سب پاؤں میں کیوں خاروں کی

تودۂ خاک بھی اک قبر کو میری ہے بہت — اس عمارت کو ضرورت نہیں معماروں کی

ساقیا ابر بھی ہے مے بھی ہے اور تو بھی ہے مست — آج بر آئیں مرادیں ترے مے خواروں کی

جب نہیں وعدۂ کو ایفا سے زرا بھی سروکار — پھر کبھی کیا ہے تمہارے لئے اقراروں کی

خود ہمیں میں ہو غمِ عشق کی جو ہر نہ کمی ؟

ورنہ دنیا میں کمی وہ کچھ نہیں غمخواروں کی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

غزل

کافر ہنسی اڑائیں خدا کے وعید کی — ساعت نہ یوں ٹلے گی عذاب شدید کی

جب تک کہ دل سے محو نہو کربلا کی یاد — ہم نہ ہو سکے گی اطاعت یزید کی

یہ راہ خلد خود ہی نہ بھائے ہمیں مگر — دعوت تو سبکو دیتی ہے تقریب عید کی

قائل نہ ہم ہوں کسے مع العسر لیُسر کے — اے دل، مہ صیام ہے تقریب عید کی

شکر خدا کہ جس نے پس ام ظلمت فراق — پہلی جھلک دکھائی یہ صبح امید کی

کیا دے صلہ صبا کو پیام بہار کا؟ — مرغ قفس کی جان ہے نذر اس نوید کی

سائل کو اذن عام ہے اُس بارگاہ میں — کچھ پوچھے واں نہیں قریب و بعید کی

تنہائی کیسی قید میں؟ ہے وہ ہم سخن — کر تو تلاوت اُس کے کلامِ مجید کی

تو جسکو مل گیا اُسے ہر چیز مل گئی — بڑھیا یہ گُر بتا گئی ہارون رشید کی

ہے خواب میں بھی حسن پیمبر، تجھے حجاب؟
جوہر کو آرزو ہی رہی تیری دید کی!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لاغالب الا اللہ

غزل

آخر کو لے کے عرش سے فتح و ظفر گئی
مظلوم کی دعا بھی کبھی بے اثر گئی؟

اگلی سی اب وہ زعم کی طغیانیاں کہاں؟
شب بھر میں کیا، بھری ہوئی ندی اُتر گئی!

عالم کا رنگ اور سے کچھ اور ہو گیا
ہم بیکسوں کی آہ عجب کام کر گئی

ناکامیوں سے کام محبت کا بن گیا
اک دعا تھی کہ آگ میں پڑ کر نکھر گئی

جب طلعتِ و سعید حلیم، انور و جمال
چل دیں تو کیا جئیں کہ طبیعت ہی بھر گئی

ملا کہ یاں تک آنے کی فرصت نہیں اُنہیں
پوچھو تو آج موت کہاں جا کے مر گئی؟

اپنی ہی عمر نے نہ وفا کی وہ کیا کریں
ہم ہو چکے تو اُنکو ہماری خبر گئی

یکبار گی ہوس کے چھٹے سارے مشغلے
اے دل، نگاہ یار یہ کیا سحر کر گئی؟

خونِ شہید واشک یتیم اب نہیں گران
پھر کیوں نہ قدر قیمت لعل و گوہر گئی؟

اے دورِ چرخ، کب سے ہیں میخوار تشنہ لب
سن تو سہی وہ گردش ساغر کدھر گئی؟

صیاد کیا ہوئی وہ تیری خوئے احتیاط
مُرغِ خیال کے نہ مرے پر کتر گئی

تسکین وہ اسیر قفس تھا خیالِ گل
دو چار دن میں آپ طبیعت ٹھہر گئی

اے یادِ یار، تیری رفاقت رہے گی یاد
آئی تھی تیری پاس بھی شب غم میں، مگر گئی

کہنے نہ پائے وصل کی شب مُدعائے دل
ایک داستانِ غم تھی وہی تا سحر گئی

سامانِ زیب و زینتِ تن ہو چکا بہت
کچھ رُخ کی سفائی، وہ بھی سنور گئی؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا طالب الا اللہ

محرم الحرام ۱۳۴۱ھ

اگست ۱۹۲۲ء

مہمانِ قفس کیا تیری فریاد کرینگے
اتنی بھی نہ اب خاطر صیاد کرینگے

وہ جس سے کہیں ہم تجھے دل شاد کرینگے
سمجھو کہ اسے اور بھی برباد کرینگے

جو دشت کہ آرام گہِ سبط نبی ہے
اُس دشت کو لاکھوں ابھی آباد کرینگے

حریت کامل ہے ولا بندگی حق
وہ تجھ کو غلامی ہی میں آزاد کرینگے

جو آرزوئے مرگ میں مرتے تھے وہ کشتے
کس منہ سے شکایت تیری جلاد کرینگے

خوش کرنے کو قاتل کے ہم اور اشک بہائیں
ہاں زخم جگر ہنس کے اُسے شاد کرینگے

کہہ لیتے دو دل کھول کے ناصح کو نہ ٹوکو
کچھ اور بھی شاید ابھی ارشاد کرینگے

ہم جانتے ہیں لطف و عنایات کو اُنکی
ہوگا ہی کچھ اور بھی بیداد کرینگے

سب کہتے ہیں آتا کے مساواتِ جفا سے
وہ طرز ستم اور کب ایجاد کرینگے

ہیں جنکی نگاہوں میں ازل سے تیرے جلوے
وہ آرزوئے جنت شداد کرینگے

اے دل مجھے کچھ یاد بھی ہے عرش کا وعدہ
تو یاد کر اُنکو وہ تجھے یاد کرینگے

خارج نہ ہو گر حد ادب سے تو میں پوچھوں
جوہر ہمیں کب خوش شرح بغداد کرینگے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

غزل

اے دل تجھی کو صبر جو پروردگار دے
تکلیف کیوں یہ کرکشاکش انتظار دے

بیڑے کو جسکے ڈر ہو یہ وہ ناخدا نہیں
آساں ہے اسکے واسطے ڈوبے اُبھار دے

دنیا اگر نہ چاہے تو یوں موت تک نہ دے
دینے پہ لیکن آئے تو پھر بیشمار دے

راضی ہیں جو رضائے الٰہی میں انکو کیا؟
جو چاہے انکو گردش لیل و نہار دے

ہم اسکے ہوئے تو پھر لب اس سے کیا غرض
وہ جیت اپنی فوج کو دے یا کہ ہار دے؟

تاہم کریں نہ عرض تو ناچار کیا کریں
جب چین ہی نہ ہو دل بیقرار دے

سینچا تھا اسکو اپنے لہو سے حسینؑ نے
اب چاہے اس چمن کو خزاں دے یا بہار دے

اے حامل شریعتِ کامل ہے سر بھی نذر
یا چاہتا ہے بوجھ ہی سر سے اُتار دے

تو کس خیال میں ہے، یہ وہ عشق ہی نہیں
اے بوالہوس، جو فرصت بوس و کنار دے

نعلین ہی پہ ہو نہ کہیں اکتفا، کلیم
اس آستاں پہ آئے تو اس سر بھی اتار دے!

تجھ پہ مدار فتح ہے، اے دل، عدو فقط
ہے اسلئے کہ وہ تیری چاندی نکھار دے

لغزش نہ ہو جو تیرے ہی پائے ثبات کو
ہے تو ہی کامیاب، وہ ایذا ہزار دے

ویسے جاں تو بادۂ کوثر ابھی ملے
ساقی کو کیا پڑی کہ یہ مے اُدھار دے

کٹتی ہے شغل عشق پل بھر میں عمر خضر
یہ دن ہیں کیا ہیں قید کے اے دل گزار دے!

رہرو تھا راہِ دیتا عشق کا، منزل کو پالیا
اب اور کیا نشان میری لوح مزار دے؟

ہے رشک ایک خلق کو جوہرؔ کی موت پر
یہ اُسکی دین ہے، جسے پروردگار دے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لاغالب الا اللہ

غزل

ہیں یہ انداز آزمانے کے | اور ہی ڈھنگ ہیں ستانے کے

کربلا ہے بہانہ کوثر | جائیے صدقے اس بہانے کے

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے | تھے نہ ہم اُنکے آستانے کے

ایک ایک کرکے سب کے سب تنکے | کئے برباد آشیانے کے

کچھ دنوں گھومنا مقدر تھا | ساتھ ساتھ اپنے آب و دانے کے

دیکھئے اب یہ گردشِ تقدیر | کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال؟ | ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

قید میں اور اتنی بے باکی | سب یہ لچھن ہیں مار کھانے کے

سن بھی لیتا ہے حالِ دل وہ شوخ | آتے ہوں ڈھب گر ستانے کے

جان کر قصہ کچھ سنے اوراق | جستہ جستہ میرے فسانے کے

دے کسی اور کو یہ دم قاصد | میرے گھر وہ کبھی نہ آنے کے

تیری گردش کہاں گئی اے چرخ | ہم ہیں محروم اک زمانے کے

خون عاشق سے سخت ہیں بیزار | ملک الموت اس زمانے کے

زنگ آلودہ ہوگئے سارے | تھے جو آلات خوں بہانے کے

کھلتے جاتے ہیں راستے لیکن | روز دوچار جان جانے کے

تجھ سے سیکھے کوئی ستم ایجاد | طرز عشاق کے ستانے کے

کیوں ہو خوں ریز جس کو گر آئیں | عاشقوں کا لہو سکھانے کے

تابہ نمرود ایک نہیں وہی | سو طریقے ہیں دل جلانے کے

یہ بگڑنا ہے سب بناوٹ کا | منتظر ہیں فقط منانے کے

خود ہی بیٹھے ہیں یا تو اُٹھنے کو | اب گئے دن وہ ناز اُٹھانے کے

چلئے جوہر کو چھوڑیئے "ناصح"
منہ لگے آپ کس دیوانے کے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لاغالب الااللہ

غزل

نہ اُڑ جائیں کہیں قیدی قفس کے ذرا پَر باندھنا، صیاد، کس کے
نشان آشیاں کیا جس چمن میں لگے ہوں ڈھیر ہر سو خار و خس کے
ملے اک خم تو میخانے سے، ساقی! کہ ہم چھوٹے ہوئے ہیں دو برس کے
گراں ہو اب تو شاید سیرِ گل پر کچھ ایسے ہو گئے خوگر قفس کے
ملی ہے قید آزادی کی خاطر نہ پڑ جائیں کہیں دونوں کے چسکے؟
نہیں مرغوب آزادی سے کم قید کچھ ایسے لگ گئے دونوں کے چسکے
جو رہنا چاہے بند غم سے آزاد پھنسے پھندے میں کیوں تارِ قفس کے؟
مٹے سجدہ ملکی مسجدوں میں یہ محکانے ہیں تیرہ سو برس کے!
فرشتوں نے کیا ہے انکو سجدہ! نہیں، اے مُت، یہ بندے تیرے بس کے
جو کھو بیٹھا متاعِ عزتِ نفس برابر ہو گیا مور و مگس کے
ملے اب دیکھئے کب جامِ کوثر؟ یہاں تو رہ گئے میکش ترس کے
گھٹیں کیا سب ملک و عشق مذہب؟ نشے ہیں یہ بھی کیا چانڈو چرس کے؟
جو سچ ہے وعدہ جو دی تو یہ مینہ کہے گا اک نہ اک دن خود برس کے
نہیں باقی رہا جب پاس آئیں مٹے سب تفرقے دُزد و عس کے
چمن تو ہم خود چھوڑا ہے گلچیں گلے پھر کیا کریں قید قفس کے

گیا اتنے میں خود تارِ نفس ٹوٹ
تھے جوہرؔ منتظر اک ہم نفس کے!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لاغالب الا اللہ

ناتمام غزلیں اور اشعار متفرق

نہ بھائے گا تمہیں قصہ عزیزو! عیش رفتہ کا
یہ کیا کیجئے ہمیں تو اک ہی افسانہ آتا ہے

ابھی سے وحشت مت اُلجھ چاکِ گریباں سے
یہ تھوڑی بستیاں ہیں، پر وہی ویرانہ آتا ہے

یقیناً فصل گل میں پھر نکل بھاگا ہے زنداں سے
وہی شور سلاسل ہے، وہی دیوانہ آتا ہے

ہم اسکی راہ میں مرنے کو دیکھتے رہے راہ
ذرا سا کام تھا، وہ بھی اجل سے ہو نہ سکا

کرائے معصیتِ رب میں طاعتِ مخلوق
تری جفا سے، ہماری وفا سے ہو نہ سکا

پیامِ مرگ ہے پیغامِ یار و مژدۂ وصل
وہ کام اجل نے کیا جو صبا سے ہو نہ سکا

دو برس کی قید ہی کیا؟ قید ہے قیدِ وفا!
خاتمہ، یا رب نہ ہو اس قید بے میعاد کا

دو برس کی قید ہی کیا؟ قید ہے قید حیات!
دیکھو، کب ہو خاتمہ اس قید بے میعاد کا

اُسکی رحمت کو تو خود درکار ہے عذرِ گناہ
کیجے پھر زاہد کا عذرِ بے گناہی کیا کروں

اس دل مضطر کے ہاتھوں میں تو بے حد تنگ ہوں
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا، ابھی کیا کروں؟

ورنہ حسن پہ سب ایک ہیں محمود و ایاز
بادشاہوں کو بھی ملتے نہیں گدائی کے مزے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

۲۰ ذی الحجہ ۱۳۴۰ ۱۴ اگست ۱۹۲۲

اس درد لادوا کی دوا ہو تو جانیئے
دستِ مسیح میں یہ شفا ہو تو جانیئے

کہتے ہیں لوگ ہے رہ ظلمات پُر خطر
کچھ دشت کربلا سے سوا ہو تو جانیئے

جود و سخائے ساقی کوثر کی دھوم ہے
ہملو بھی ایک جام عطا ہو تو جانیئے

مرنے کو یوں تو مرتے ہیں ہر روز سیکڑوں
اپنے لئے پیام قضا ہو تو جانیئے

کہتے ہیں نقدِ جاں جسے ہے، عاشقوں پہ قرض
یہ قرض ہم سے جلد ادا ہو تو جانیئے

ہر شے کو لے کے شکر کیا بھی تو کیا کیا
جاں دیتے وقت شکر ادا ہو تو جانیئے

دیوانہ ہو جو منکر تہذیب ہو مگر
وہ سنتِ شہ دوسرا ہو تو جانیئے

کٹ جائینگے یہ دن بھی یہاں قیدِ سخت کے
کم کچھ مگر وہاں کی سزا ہو تو جانیئے

تیزی ہے اُسکی زخمِ جگر کے لئے فقط
ناخن سے واہ وہ بند قبا ہو تو جانیئے

سنتے ہیں کامیاب بھی ہوتے ہیں کچھ ضرور
اس عشق میں اپنا بھلا ہو تو جانیئے

شہد و شراب خلد میں یہ چاشنی کہاں
کچھ خون دل سے بڑھکے مزا ہو تو جانیئے

جانے کو یوں تو جاتی ہے تو عرش تک مگر
حاصل کچھ اس سے آہ رسا ہو تو جانیئے

یوں منہ سے بڑبڑانے کو کہتے نہیں دعا
اتمامِ ماسعی کی دعا ہو تو جانیئے

سچا ہے اپنے وعدہ یہ جوہر وہ بالیقین
وعدہ ہمیں سے اپنا وفا ہو تو جانیئے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

غزل

نمودہ صبح، کہ پیغام جنان لایا ہے
کچھ تو میرے لئے ماہِ رمضان لایا ہے!

میکشو، مژدہ کہ جس سے پلٹ آتا ہے شباب
وہی سوغات پھر اب پیرِ مغاں لایا ہے

خوش ہیں مرغانِ چمن کنجِ قفس میں بھی مگر
تو کہاں سے ہمیں اے عشق کہاں لایا ہے

مدخلِ صدق کی تعبیر ہے خود مخرجِ صدق
لے، بھی جائیگا یہاں سے جو یہاں لایا ہے

حکمران خلق پہ ہوگا وہی جسکا مذہب
خلق کے واسطے عیش دو جہاں لایا ہے

شکوہ صیاد کا بیجا ہے قفس میں بلبل
یاں تجھے آپ تیرا طرزِ فغاں لایا ہے

عشق تو اپنا خود انجام ہے، پر تو ناصح
اور اک مسئلہ سود و زیاں لایا ہے!

سعدِ اسود سے مجھے شوقِ شہادت میں عروس
لینے جاتا ہے جہیز، اسب و سناں لایا ہے!

ہم اسیرانِ قفس کب نہیں ممنونِ بہار؟
رنگ پھر آج تو کچھ دردِ نہاں لایا ہے!

کرمِ غیر کے خوگر تو نہ تھے ہم، اے چرخ
خیر ہے، آج یہ کیا بارِ گراں لایا ہے!

خوگر جو رہتے ہم، پھر کرمِ غیر یہ کیا؟
کیوں فلک، آج یہ کیا بارِ گراں لایا ہے!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لاغالب الا اللہ

غزل

جنوں ہی سے نہ گر بالکل دل دیوانہ خالی ہے
نہ مانوں گا اثر سے نعرۂ مستانہ خالی ہے

اثر سے گر کسی کا نعرۂ مستانہ خالی ہے
تو پھر سمجھو جنوں سے بھی دل دیوانہ خالی ہے

مروّت سے تیری ہم بیکسوں کی شرم رہ جاتی
بھری محفل میں، ساقی ایک میرا پیمانہ خالی ہے

وہ اچھا ہی سہی پر اب تو دل لگتا نہیں اس میں
جو ذکر عشق و درد ہجر سے افسانہ خالی ہے

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

ہماری خاک کو کیا خاک ڈھانکے گا، کہ خود تجھ سے
ابھی اے بوئے الفت، سبزۂ بیگانہ خالی ہے

دلا! ڈر ہے کہیں کعبہ پہنچ کر تو نہ کہہ بیٹھے
کہ واپس چل یہاں سے اب تو یہ بتخانہ خالی ہے

تیری محفل میں ہیں ایک سے ایک بڑھ کے فرزانہ
مگر، افسوس! جائے عاشقِ دیوانہ خالی ہے

ہمیں ذوقِ اسیری چھوڑتا ہے کب گلستاں میں
قفس میں جب تک اے صیاد کوئی خانہ خالی ہے

یہ مانا ہے ہم نے جو ہر شہر چھوڑا، پر کہاں جائیں نہیں؟
وہ تیرے دم سے تھا آباد، اب ویرانہ خالی ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لاغالب الا اللہ

محرم الحرام ۱۳۴۱ھ اگست ۱۹۲۲ء

میرا شور و شیون در باغ جناں تک ہے — فغان بلبل نالاں بہار بے خزاں تک ہے

نہیں پالا پڑا قاتل تجھے ہم سخت جانوں سے — ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلادی کہاں تک ہے

تجھے ہے قوت بازو پہ عزہ، صبر پر ہمکو — لگادے زور تو سارا تیری طاقت جہاں تک ہے

تکبر نے سکھایا ہے تغافل گر تجھے ظالم — تو اپنی بھی پہنچ سن لے الیکن امکاں تک ہے

بھلا مایوس کیوں کر اس سے ہو امت محمدؐ کی — کہ جس نصرت کا وعدہ ہر ضعیف و ناتواں تک ہے

یہ بادل گرج ہر دم، یہ بجلی کی چمک پیہم — نمائش سب کی سب بلبل یہ تیرے آشیاں تک ہے

ہمیں ثابت قدم نکلے، تو پھر اس کے قدم اٹھے — یہ جبر و قہر کا جادو ہمارے امتحاں تک ہے

ابھی کیا ہے، ابھی اے دل، ہزاروں امتحاں ہونگے — ابھی تک ادعائے ضبط غم تیرا زباں تک ہے

غنیمت ہے اگر باقی کہیں کچھ پاس مذہب ہے — ہماری آبرو جو کچھ ہے اس ڈھنڈلے نشاں تک ہے

اجابت کیوں نہ آئے عرش سے تا فرش اگر جوہر

دعا کا سلسلہ تیرا زمین سے آسماں تک ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

مطلع ثانی

قید ہے جوہر کے بیجاپور کی تسخیر ہے — گولکنڈے بھی جو جا پہنچے تو عالمگیر ہے

اے مسیحا، اس مرض سے کون چاہیگا شفا — دار پر موت آئے، اسکو بھی کوئی تدبیر ہے

اے مسلماں، تو تو مسجودِ ملائک تھا کبھی! — پھر یہ شیطان کی غلامی کیوں تیری تقدیر ہے

کیا نہیں واقف ابھی اسلام کی تاریخ سے ؟ — انّ مع العسر یُسرا ہی کی سب تفسیر ہے

ہو محمدؐ کیوں نہ قرآں اور بھی ہم کو عزیز — اس میں خود تیری جو جیتی جاگتی تصویر ہے

دین میں اکراہ کیسا، برائے حفظِ دیں — دل میں قرآن ہے ہمارے ہاتھ میں شمشیر ہے

لیسَ لِلانسانِ اِلاماسعیٰ کو یاد رکھ — کرتو کل پھر تیری تدبیری تقدیر ہے

یاالٰہی طوقِ لعنت ہو نہ گردن میں وہاں — غم نہیں گریاں ہمارے پاؤں میں زنجیر ہے

سحر کاری سوزِ دل کی، داد پاتی ہے زباں! — سب یہی کہتے ہیں کیا جادو بھری تقریر ہے!

حیف جوہر ماسوا سے اور یہ بیم ورجا؟
جو کبھی بخشی نہ جائیگی یہ وہ تقصیر ہے!

اس ماڈل میں مسلمان ہندو سے اور برہمن ہریجن سے ہاتھ ملاتے ہوئے دیکھایا گیا ہے جو قومی اتحاد کی علامت ہے۔ ایک شخص ہاتھ باندھے کھڑا ہے جو عدم تعاون کی علامت ہے۔ درمیان میں ہندوستان کا نقشہ ہے۔ ایک طرف چرخا علامت کے طور پر موجود ہے یہ ماڈل مولانا محمد علی ہمیشہ اپنے کمرے میں رکھتے تھے۔

مولانا محمد علی اور قومی یکجہتی

مولانا کا شمار ہمارے ان رہنماؤں میں ہوتا ہے جو ملک کی آزادی کے لئے ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان باہمی ربط ضروری سمجھتے تھے۔ تاکہ ایک دوسرے کے ملی اور قومی مسائل میں ایک دوسرے کا ساتھ دے سکیں۔ قومی رہنما دوسرے بھی تھے اور ممکن ہے کہ ان کی قربانیاں ملک و قوم کے لئے مولانا سے کہیں زیادہ ہوں لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ملک جن حالات میں گھرا ہوا تھا اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ انگریز کو یہ باور کرا دیا جائے کہ ہندوستان کا ہر ہندو مسلمان کا شریک ہے۔ اور ہندوستان کا ہر مسلمان اپنے ہندو بھائی کا قدم بقدم ساتھ دینے کے لئے تیار ہے۔

یہ مولانا کا کمال تھا کہ انھوں نے گرو شنکر آچاریہ جیسی عظیم ہندو مذہبی شخصیت کو خلافت کے مسئلہ میں اپنا ہمنوا بنالیا۔ اور یہ بھی مولانا کا کمال تھا کہ انھوں نے گاندھی جی کی جامع مسجد کے ممبر سے تقریر کرادی۔ قومی یکجہتی کی زندہ مثال راقم کی معلومات کے مطابق مولانا اور گاندھی جی کے دور سے بہتر ہماری تاریخ میں نہیں ملتی۔ لیکن مولانا محمد علی اور قومی یکجہتی پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے مفہوم کو متعین کر لیا جائے۔

> "قومیت مشترکہ جذبہ اور ایک دوسرے سے وابستگی کے ایک ایسے شعور کا نام ہے جسے تاریخی حالات نے جنم دیا ہو۔ اور جو یہ خواہش رکھتے ہوں کہ ہم اپنی حکومت بنائیں۔ (۱)

دراصل قومیت وہ آبادی ہے جو رسم و رواج، زبان و ادب، جیسے رشتوں میں اس طرح گتھی ہوئی ہو کہ ایک اکائی معلوم ہو اور اپنے نظریات کے مطابق اس آبادی کے باشندے کسی

ایک حکومت کے زیرِ سایہ رہنا چاہتے ہوں۔اور یہ حکومت ایسی ہو جس کے قوانین ان کے مذہب ان کے رسم رواج ان کی زبان اور انکے معاشرے کی صالح اقدار کے تحفظ کے لئے بنائے گئے ہوں۔اور وہ خود کو آزاد کرانے کے لئے ایک جیسا تصور رکھتے ہوں اور دوسری آبادیوں کے مقابلے اپنی انفرادی حیثیت کو قائم رکھنے کے لئے اپنے آپ کو علاحدہ سمجھے۔

لیکن انگریز کی حکومت میں ہر ہندوستانی اپنے کو غیر محفوظ اور غلام محسوس کرتا تھا۔ اس لئے مقاصد کے اعتبار سے بھی اس وقت ہندوستان کا ہر باشندہ پوری قوم کی ضروریات اس کے دکھ درد اور اس کی بےچینی کو محسوس کر رہا تھا۔ آزاد ہونے کی خواہش قدرِ مشترک کے طور پر بیشتر ہندوستانیوں میں موجود تھی۔(سوائے خان بہادر اور رائے بہادر قسم کی چیزوں کے)مولانا محمد علی بلا شک وشبہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔انھوں نے کہا بھی ہے

"میں اول مسلمان ہوں، دوئم مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان ہوں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں ہوں۔"

لیکن جہاں تک ملک کی آزادی کا تعلق تھا مولانا نے کہا

"میں اول ہندوستانی ہوں، دوئم ہندستانی ہوں اور آخر بھی ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے سوا کچھ نہیں ہوں سوراج میرا مذہب ہے۔"(۲)

محمد علی کنبوں اور خاندانوں کی تنظیم کے مخالف نہیں تھے۔اس لئے کہ قوم کی تنظیم کے لئے یہ ضروری ہے مولانا محمد علی نے تحریر کیا

"منظم کنبوں اور خاندانوں کے بغیر نہ ایک ملت تنظیم پا سکتی ہے نہ ایک قدم۔۔۔لیکن ارتقاء کی ہر ایک منزل میں ہمیں یاد رکھنا ہو گا کہ ایک یا چند اور منزلیں بھی ہیں۔ آخری منزل نہ فقط اپنا نفس ہے نہ ملت ہے نہ قدم بلکہ انسان ہے سب انسان پہلے ایک امت تھے اور سب

انسان پھر ایک امت ہو سکتے ہیں۔" (۳)

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بحیثیت مسلمان مولانا مسلمان تھے لیکن جہاں ملک اور ہندوستان کی آزادی کا سوال تھا مولانا سوراج کو اپنا مذہب سمجھتے تھے مولانا محمد علی قوم کو ایک اکائی بنانے کے لئے اس کی تنظیم کے حامی ہیں لیکن اپنے ان نظریات کے باوجود اولیت وہ انسانیت کو دیتے ہیں۔ ملیت اور قومیت پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے۔

"اسلام کو دنیا نے یوروپ کی طرح قوموں اور ملکوں میں تقسیم نہیں کیا۔ بلکہ اختلافاتِ مذہبی کی بنا پر ملتوں میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن اس معنی میں بھی ملیت قومیت کے اس قدر منافی نہیں ہے کہ مختلف ملتوں کا وجود قومیت کو پیدا نہ ہونے دے۔" (۴)

مولانا کے بیان کے مطابق اگر ملتیں مذہبی لحاظ سے الگ ہوں تب بھی قومیت ایک ہو سکتی ہے۔ مولانا سیاست کو مذہب سے الگ نہیں سمجھتے تھے اس لئے کہ ان کے نزدیک زندگی کے ہر شعبے کا حل مذہب میں موجود ہے۔ انھوں نے کہا۔

"مذہب کو اگر آپ سیاست سے جدا رکھیں گے تو مذہب کے بارے میں آپ کا تصور غلط ہوگا۔ مذہب زندگی کی ایک تعبیر کا نام ہے۔" (۵)

انگریز کی چالبازیوں کی وجہ سے ہندوستانی باہم لڑتے اور معمولی باتیں فسادات کی شکل لینے لگیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اور ہندو دونوں الگ الگ منظم ہونے لگے شدھی سنگھٹن اور مسلمانوں کی بعض جوابی تنظیموں نے اس جذبہ کو اور بھی جلا بخشی لیکن مولانا کی نظر ملک کی آزادی پر تھی انھوں نے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں کہ مسلمان کے لئے مناسب ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو کر ہندوستان کو آزاد کرائیں"

انھوں نے ۱۱؍ مئی ۱۹۲۱ء کی الہ آباد کانفرنس میں کہا تھا

"یہ میرا مذہبی فرض ہے کہ ہندو مسلمان میں اتحاد پیدا کروں مگر میں چاہتا ہوں کہ ہندو ہندو رہیں اور مسلمان مسلمان اگر انھوں نے اپنے اپنے مذہب کو چھوڑ دیا تو پھر اتحاد کے کچھ معنی نہیں۔۔۔ میں اپنی ذات سے ایک ہندو کا غلام رہنا پسند کروں گا بمقابلہ ایک غیر ملکی کے۔ میں گورنمنٹ سے ترک موالات کروں گا اور ہندوؤں سے محبت کروں گا۔ خواہ وہ مجھے کتنا ہی ستائیں۔"

لیکن افسوس کہ محمد علی کی ہندو مسلمان ایکتا کی کوشش کے باوجود ملک کی صورتِ حال بگڑنے لگی اور جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات ہونے لگے۔ مولانا نے بار بار ہمدرد میں ان موضوعات پر مضامین تحریر کر کے مسلمانوں کو سمجھایا انھوں نے لکھا

"یہ نہیں کہ صبح سے شام تک ہندوؤں کے مظالم اور ان کی ریشہ دوانیوں کا دکھڑا رو دیا جائے بلکہ اپنے نقائص کی تلاش کی جائے اور ایک ایک کر کے ان کو دور کیا جائے اگر ہندو مریض کے مرض کی تشخیص کی جائے اور اس کو کڑوی دوا پلائی جائے تو کیا اس سے مسلمان مریض کا مرض اچھا ہو جائے گا۔ گھوڑ دوڑ میں ہمکو بازی جیتنا ہے مگر مسلمان گھوڑا سوار سے کہتا ہے کہ مہمیز اور چابک میرے نہ لگا ہندو گھوڑے کے لگا تو ہم جیت جائیں گے۔"(۶)

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ محمد علی کی اوّلین حیثیت ایک مسلمان کی تھی اس لئے وہ مسلمانوں میں تنظیم بھی چاہتے تھے تاکہ بین الملل جمعیت بن سکے اس لئے کہ مولانا کے نظریہ کے مطابق ہندوستان اور عالمِ اسلام دونوں کی آزادی کی تحریکوں میں ہم آہنگی تھی۔ تحریر کرتے ہیں

"ایک مسلمان اس قومیت کا ہرگز طرفدار نہیں ہو سکتا جو اسے اپنے

دینی بھائیوں کی تنظیم سے باز رکھے لیکن وہ اس ملت کا بھی طرف دار
نہیں ہو سکتا جسکی طرف اسے بعض مسلمان گھسیٹنا چاہتے ہیں اور وہ
ہمیشہ اپنا فرض سمجھے گا کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم پر ظلم کرے تو
یہی نہیں کہ اسکو ظلم میں مدد نہ دے بلکہ اسکو اس ظلم سے باز بھی
رکھے"(۷)

مولانا کی تحریر و تقریر کی قوت ہندو مسلم اتحاد پر صرف ہوئی لیکن دونوں میں اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ جواہر لال نہرو کے چند جملوں سے ہم اس زمانہ کے حالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں

"اپنے زمانہ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے دور
ہونے لگے یا شاید ان کے الفاظ میں کانگریس ان سے دور ہونے
لگی۔۔۔اس میں شاید کسی فرد یا افراد کا قصور نہیں بلکہ ان حالات کا تھا
جو ملک میں رونما ہوئے"(۸)

ان فرقہ وارانہ فسادات اور مسائل کو حل کرنے کے لئے بہت کوششیں کی گئیں ان میں سے سب سے مشہور وہ کانفرنس تھی جو مولانا محمد علی نے اپنی صدارت کے زمانہ میں ۱۹۲۴ء میں کی یہ کانفرنس دہلی میں گاندھی جی کے ۲۱ روزہ برت کے دوران کی گئی تھی(۹) اس کے بعد شملہ اور دوسری جگہوں پر بھی کانفرنسیں کی گئیں۔

مولانا محمد علی ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن چلے گئے جہاں سے وہ کامل آزادی کا پروانہ لانا چاہتے تھے مدینہ اخبار بجنور کی ۵ / جنوری ۱۹۳۱ء کی اشاعت کے مطابق انھوں نے پریس کے نمائندہ کو اپنا انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

"مجھے بیماری نے آدبایا تھا۔ لیکن میں ابھی تک زندہ ہوں اور ہندو
مسلمان کو ایک جگہ لانے کا جو کام شروع کیا تھا اسے پھر جاری کر سکتا
ہوں۔ مولانا نے آگے چل کر فرمایا ہندوؤں کی کثرت جس قدر زیادہ

کیوں نہ ہو انھیں مکمل اختیار دے جائیں اور ہر ایک مسلم اقلیت کے
حقوق محفوظ رکھے جائیں اور اس طرح مسلم اکثریت کو اختیارات
دے جائیں اور ہندو اقلیتوں کی حفاظت کی جائے۔"

مولانا محمد علی اپنی زندگی کے آخری ایّام میں بھی لندن میں ہندو مسلم سمجھوتے کے لئے ایک مسودہ تیار کر رہے تھے۔ جس سے زیادہ ذہن پر بوجھ پڑا اور دماغ کی رگوں سے خون بہنا شروع ہوا ۲ جنوری کو طبیعت خراب ہوئی ۳ر جنوری کو بے ہوش ہو گئے ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو ہندوستان کی آزادی کا خواب لئے ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے۔

نوٹ

1- Macıver A text Book of Socıology - Page15

(۲) تقریر الہ آباد کانفرنس، ۱۱ر مئی ۱۹۲۱ء 'اوراقِ گم گشتہ مرتبہ رئیس احمد جعفری صفحہ ۴۷

(۳) ہمدرد ۷ ار اکتوبر ۱۹۲۶ء

(۴) ہمدرد ۷ ار اکتوبر ۱۹۲۶ء ۔ ۵ آج کل ماہنامہ دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۲۳

(۵) ایضاً ص ۲۳

(۶) ہمدرد ۱۹ر جنوری ۱۹۲۶ء

(۷) ہمدرد ۷ر اکتوبر ۱۹۲۹ء

(۸) جواہر لال نہرو میری کہانی ص ۲۰۴ حصہ اول ۲ر جنوری ۱۹۳۶ء

(۹) جامعہ عبدالطیف اعظمی ۱۹۸۰ء ص ۴۷

تجزیہ

ہندوستانی مسلمانوں میں برطانوی اقتدار سے بیزاری' نفرت کے جذبے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ مولانا محمد علی کی نظر میں اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انگریز نے ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار چھینا تھا۔ آخری مشورہ کے عنوان سے مولانا محمد علی نے لندن میں ہائیڈ ہوٹل پارک سے، وزیر اعظم انگلستان کو ایک خط یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو بغرض اشاعت ارسال کیا تھا۔ اس میں تحریر کرتے ہیں

> "سب سے اوّل یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمان ہندوستان پر آٹھویں صدی کے آغاز سے ۱۹ویں صدی کے وسط تک کسی نہ کسی صورت میں ملک کے کسی نہ کسی حصے میں حکومت کرتے رہے۔۔۔اس کے بعد خواہ فوجی فتوحات یا سیاسی چالاکیوں کے ذریعے سے اسلامی حکومت آخرکار مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر برطانیہ کے ہاتھ میں گئی۔"

"ہندوستانی مسلمان اپنی حکومتوں کے ختم ہو جانے کے بعد خود کو ہندوستان میں کمزور اور بے اقتدار محسوس کرنے لگے تھے۔ اس کا نفسیاتی ردِّ عمل یہ ہوا کہ ان میں دنیا کے دوسرے مسلمانوں سے اپنے روحانی رشتے کے تعلق کا احساس بیدار ہونے لگا۔ حکومتِ برطانیہ مسلم ممالک میں جیسے جیسے اپنا تسلط قائم کرنے اور سازشیں کرنے میں کامیاب ہوتی جاتی تھی۔ ردِّ عمل کے طور پر مسلمانوں انگریزی حکومت سے وفاداری کی جگہ نفرت کا جذبہ پیدا ہونے لگا تھا۔

☆ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ برطانیہ مسلم

ممالک میں اپنا تسلط اس لئے قائم کرنا چاہتا ہے کہ ہندوستان میں اس کے قدم اور مضبوطی سے جم جائیں۔ مسلمانوں کو یہ باور کرلیا گیا تھا کہ اسلامی ممالک کو برطانیہ کے دباؤ سے بچانے کا واحد ذریعہ ہندوستان کی آزادی ہے۔ مسلمانوں کا کہنا تھا کہ برطانوی اقتدار سے ہندوستان کے نکل جانے کے بعد اسلامی رہگواروں پر اس کا قبضہ کرنا بے معنی ہوگا۔ (اس لئے کہ تیل کے ذخائر کی صورت حال جو آج ہے وہ اس زمانہ میں نہیں تھی۔)

حسرت موہانی نے احمد آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس میں کہا تھا

> "مسلمانوں کو یہ جان لینا چاہئے کہ جمہوریہ ہند کے قیام سے انھیں دو فائدے ہوں گے اوّل یہ کہ ایک جمہوری ملک کے شہری کی حیثیت سے انھیں برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔۔۔۔ دوسرے یہ کہ برطانوی دائرہ اثر میں تخفیف کرکے وہ عالم اسلامی کو وہ سکون خاطر مہیا کرسکیں گے جو تعمیری سرگرمیوں کے لئے اشد ضروری ہے۔"

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلامی ممالک کی آزادی کے لئے ہندوستان کی آزادی ضروری تھی۔ اس حصول کو حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستانی مسلمان انگریز کا ساتھ نہ دیں اور نہ اس کے حکم پر ایک بھائی دوسرے بھائی پر بندوق اٹھائے۔ ان جذبات نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے تحریکِ خلافت میں شامل ہونا اور اس سے تعاون کرنا ضروری سمجھا اور دوسری جانب اور اسکے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کی آزادی کو مذہبی فریضہ قرار دیا گیا۔ مولانا محمد علی اپنے معاصرین میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کو مذہبی فریضہ قرار دیا تھا۔ اور یہی بات انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن نشین کرائی کہ

"اسلام کی آزادی کے لئے ہندوستان کی آزادی ضروری ہے۔"

مولانا محمد علی نے انگریز کی ملازمت کو حرام قرار دلوایا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں کراچی میں عیدگاہ کے میدان میں 'خلافت تحریک کا جلسہ ہوا تھا۔ اس جلسے میں بحیثیت صدر محمد علی نے ایک تجویز پڑھ کر سنائی تھی کہ انگریز کی نوکری حرام ہے اس لئے فوجیوں کو چاہئے کہ

ملازمت چھوڑ دیں' اور یہ قرارداد پاس بھی ہوئی تھی۔ فوج میں بغاوت پھیلانے کے الزام میں محمد علی پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں دو سال کی سزا ہوئی۔ اس مقدمہ میں گرو شنکر اچاریہ بھی ملزم کی حیثیت سے تھے۔ جب گرو شنکر اچاریہ سے کہا گیا کہ آپ بیان کھڑے ہو کر دیں تو انھوں نے جواب میں کہا کہ ہم اپنے دھرم گرو کے آگے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور یہی عمل مولانا محمد علی کا بھی تھا کہ انھوں نے کھڑے ہو کر بیان نہیں دیا۔ اس لئے انگریز سے عدمِ تعاون کرنا تھا۔ لیکن جب مولانا محمد علی اور شوکت علی عدالت کے کمرے میں داخل ہوئے اس وقت گرو شنکر اچاریہ نے ان کا احترام کھڑے ہو کر کیا یہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک مثال تھی۔ جو محمد علی اور ان کے رفقاء کاروں کی رواداری نے قائم کی تھی۔

چونکہ خلافت تحریک کے بنیادی مقاصد میں انگریز کی پسپائی اور ہندوستان کی آزادی شامل تھی۔ اس لئے مولانا محمد علی نے آشرموں میں بیٹھے سنیاسیوں' دھرم گرودوں خانقاہوں میں عبادت میں مصروف سجادہ نشینوں اور تدریس میں مصروف علماء سے ملاقاتیں کیں۔ انھیں بار بار یہ باور کرایا کہ ملک کو آپ کی ضرورت ہے۔ اس لئے سیاسی میدان میں بھی آکر کام کیجئے۔ چنانچہ خلافت تحریک کے جلسوں میں مسلم علماء کے ہمراہ گرو شنکر اچاریہ بھی ہوئے۔ سیکڑوں کی تعداد میں علماء نے انگریزی حکومت کے خلاف فتویٰ دئے۔ جو مختلف کتب میں اشاعتی صورت میں موجود ہیں۔ علی برادران ان کے ساتھیوں اور گرو شنکر اچاریہ پر جو مقدمہ چلایا گیا وہ تاریخ میں 'مقدمہ کراچی' کے نام سے مشہور ہے۔

ملک کی آزادی کے لئے ہندو اور مسلمانوں کا ایک مرکز پر جمع ہونا ضرور تھا۔ لیکن حکومتِ برطانیہ کا فائدہ اس میں تھا کہ ہندوستان میں باہمی فسادات ہوتے رہیں۔ باقاعدہ فسادات کے موسم مقرر ہو گئے تھے۔ ہولی، دیوالی، عید، عیدالضحیٰ، مسائل میں مسجد کے سامنے سے باجا بجاتے گذرنا' تنظیم و تبلیغ' شدھی' سنگٹھن شامل تھا۔

محمد علی نے اس مکدر فضا کے بادل چھانٹنے کے لئے اپنے روزنامہ 'ہمدرد' میں مضامین لکھے۔ اور انھوں نے لکھا کہ اگر کسی کا مذہب اسے باجا بجانے کی اجازت دیتا ہے تو اس

میں مانع نہیں آنا چاہئے۔ اور ہنود کو بھی چاہئے کہ نماز ہوتے وقت یا آزان کے وقت اگر مسجد راستے میں آئے' تو چند منٹ کے لئے باجا بجانا بند کر دیں۔ تنظیم و تبلیغ کے لئے ان کا نظریہ تھا کہ اس کی ہمیشہ ضرورت تھی۔ لیکن کونسی تنظیم و تبلیغ تفرقے کے لئے نہیں' اپنی اصلاح کے لئے انھوں نے اپنے عمل اور تحریر و تقریر سے ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کامیاب کوشش کی تاکہ آزادی کی جنگ مشترکہ طور پر لڑی جاسکے۔

مولانا انگریز سے اس حد تک متنفر تھے کہ اپنی درس گاہوں کو اس سے پاک رکھنا چاہتے تھے۔ جامعہ کی تاسیس ان کے اس جذبہ کی ترجمانی کرتی ہے۔ وہ ٹیکنیکل تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے اس لئے جدید علوم کے ساتھ انھوں نے ٹیکنیکل تعلیم کو بھی جامعہ کے نصاب میں شامل کیا تھا۔ وہ شیخ الجامعہ بھی رہے اور انھوں نے جامعہ میں باقاعدہ کلاسیس بھی لی ہیں۔ اس طرح تدریس کے میدان میں بھی انھوں نے قوم کی خدمت کی۔

مولانا محمد علی جامعہ ملیہ کے بانیوں میں تھے (یہ ابتدا میں علی گڑھ میں کھولی گئی تھی' اور اب دھلی میں ہے۔) اس کی فاؤنڈیشن کمیٹی کی میٹنگ میں انھوں نے اپنی تقریر میں اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا

"یہ تعلیم گاہ حکومت کے اثر سے آزاد اور قومی اور ملی معاملے کی پابند ہو۔ ملک کی آزادی اور ہندوستانی قومیت کی تحریک میں حصہ لے۔"

اس طرح محمد علی نے ایک ایسی قومی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی' جس میں آزادانہ طور پر قومی اور ملی مسائل کے تحت ذہنوں کو بنایا جاسکے۔ تاکہ نئی نسل جو پڑھ لکھ کر نکلے وہ قومیت کے دھارے میں ڈوبی ہوئی ہو۔ اس طرح تعلیم کے میدان میں ان کی یہ ایک اہم اور کامیاب کوشش تھی۔

قومی خدمت کے ادارہ سے ہی انھوں نے اپنا اردو روزنامہ 'ہمدرد' اور انگریزی ہفت روزہ کامریڈ جاری کیا تھا۔ نڈر صحافی کی حیثیت سے انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف خبریں شائع کیں۔ بیرون ہند میں اپنے اخبارات کے نمائندے منتخب کئے۔ جو بذریعہ

تار اور خطوط ہمدرد کو خبریں ارسال کرتے تھے۔ اس طرح پہلی بار کسی اردو اخبار کے نمائندے دوسرے ممالک میں متعین کئے گئے جو ٹیلی گرام خبریں ارسال کیا کرتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی میں قلمی جنگیں رہی ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب نے ان کی صحافت کے بارے میں تحریر کیا ہے:

"مولانا محمد علی اردو انگریزی کے بہت اچھے ایڈیٹر تھے اور ہندوستان میں ان کے زمانے میں۔ ان جیسی معلومات کے ایڈیٹر بہت کم ملتے تھے۔ ہمدرد مقبولِ عوام نہ ہو سکا کیونکہ مرحوم اس کو بھی کامریڈ کی طرح اعلیٰ سطح پر رکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ اس کے ناظرین اپنی کم علمی کے سبب اپنے مذاق کا اخبار چاہتے تھے۔"

مولانا نے ہمدرد کی اشاعت پہلے ٹائپ پر شروع کی۔ لیکن جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ٹائپ عوام میں مقبول نہیں ہو سکے گا تو انھوں نے لیتھو پر شائع کرانا شروع کیا۔ ان کا بنیادی مقصد بیرونِ ملک اور بالخصوص جنگِ بلقان سے متعلق (ہمدرد کے دورِ ابتدائی میں) صحیح سیاق و سباق کے ساتھ قارئین تک پہنچانا تھیں۔ تاکہ اردو داں طبقے کو عالمی دنیا کی خبریں مل سکیں۔

ہمدرد نے اپنے زمانہ کے اعلیٰ درجہ کے شعرا و ادیبوں کی تخلیقات شائع کیں۔ حالی اور اقبال کی منظومات اور پریم چند اور راشد الخیری کے افسانے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے سیاسی موضوعات پر مضامین ادارے کی جانب سے اور دوسرے مبصروں کے مضامین بھی شائع ہوئے ہیں۔

محمد علی بہترین تنقیدی ذہن رکھتے تھے۔ اس کی واضح مثالیں ان کے مضامین اور مکاتیب میں موجود ہیں۔ ۱۰/ نومبر ۱۹۱۶ء کو چھنڈواڑے سے مولانا عبدالماجد دریابادی کو ایک خط میں 'فلسفہ' اجتماع' سائیکالوجی آف لیڈر شپ Psychology Leadership کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس میں انھوں نے غزالی کے فلسفہ کا تذکرہ کرتے

ہوئے لکھا ہے۔

"غزالی کا فلسفہ مجھ سے زیادہ آپ نے پڑھا ہوگا ان کی احیاء العلوم کا
ترجمہ فرانسیسی زبان میں اگر ہو گیا ہوتا تو ڈیکارٹ کو دنیا چور سمجھتی۔"

اس طرح انھوں نے علم وادب کی خدمت کی۔ انگریزی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ کامریڈ کو انھوں نے اس مینا کاری سے سجایا تھا جس طرح یوروپ کے اعلیٰ اخبار شائع ہوتے تھے۔ انھوں نے کامریڈ میں غالبؔ کے اشعار کو مثالوں میں پیش کر کے ان کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ کامریڈ کا اصل مقصد ہندوستانیوں کے خیالات انگریزوں تک اور انگریزی داں طبقے تک پہنچانا تھا۔

محمد علی نے انگریزی (کامریڈ) اور اردو (ہمدرد) اخبارات کے ذریعے ہندوستانیوں کے ذہن کی نشو نما انگریزی حکومت کے خلاف کی۔ آزادئ رائے، آزادئ خیال کے موضوعات پر اپنے اخبارات میں لکھا۔ جس سے ہندوستانیوں کو آزاد رہنے کی خواہش کو جلا ملی۔ انگریزی حکومت میں اس طرح کے مضامین لکھنا بہت جرأت کی بات تھی۔

۱۹۳۰ء میں وائسرائے نے لارڈ ارون نے ایک گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ اس میں غیر ہندوستانی کانگریسیوں نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس میں محمد علی، سر آغا خان سر ہدایت اللہ، محمد علی جناح، عبدالقیوم شاہنواز بھٹو، سر تیج بہادر سپرو جیکر، ڈاکٹر مونجے کے نام نمایاں ہیں۔ محمد علی اپنی سخت علالت کے باوجود کانفرنس میں شرکت کرنے پہنچے۔ انھوں نے اپنی بیٹی زہرہ بیگم کو اپنے ایک خط میں لکھا تھا

خدا کرے۔۔۔ ہندوستان والوں کو اپنی غلامی کا احساس ہو جائے۔ اور ایک دوسرے کو غلام بنانے کے خیال کو چھوڑ کر سب کو دوسروں کی غلامی سے نکالنے کی کوشش کریں۔ خدا ہندو مسلمان دونوں کو توفیق دے کہ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور انصاف کا برتاؤ کریں۔ نہ دوسروں کی غلامی قبول کریں اور نہ دوسروں کو غلام بنانے کی

کوشش کریں۔ آمین!

۲؍نومبر ۱۹۳۰ء کو مولانا محمد علی نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں تقریر کی

"اگر لارڈ ریڈنگ نہیں بدلے تو میں بھی نہیں بدلا ہوں۔۔۔۔۔۔

ساری باتیں اس وقت درست ہو جائیں گی جب آپ کے پاس

انگلستان میں ایک آدمی بھی ایسا ہو جو واقعی انسان ہو۔"

انھوں نے آزادی کی مانگ کرتے ہوئے اپنی جان دے دی۔ مولانا محمد علی نے علمی میدان میں 'تدریس کے ذریعے' صحافت کے ذریعہ اور اپنی تقاریر کے ذریعہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک ہندوستان کو آزاد کرانے کا جہاد کرتے رہے جنگِ آزادی میں ان کا پایا بلند ہے۔
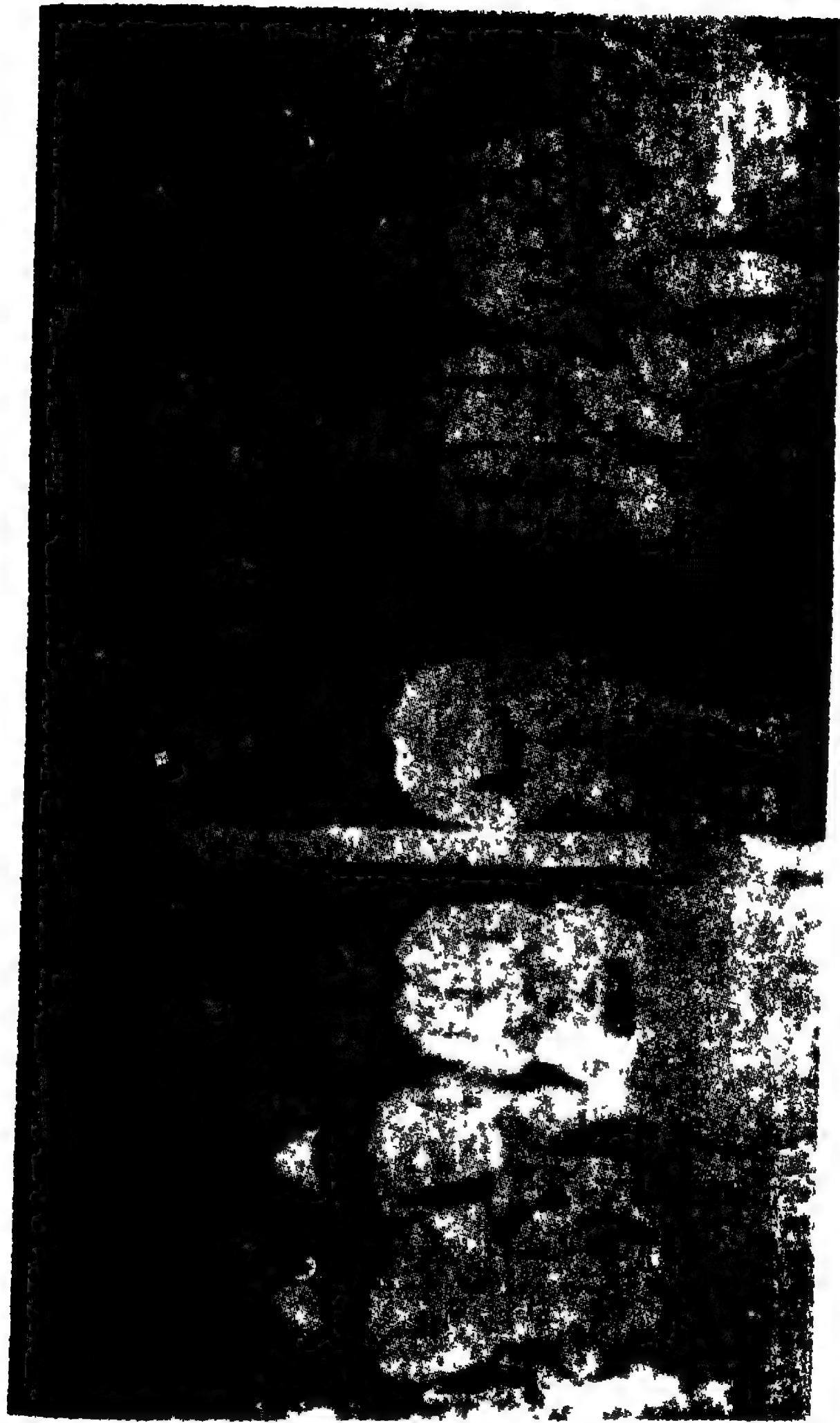
غازی انور بے اپنے رفیقان ہمراز کے ساتھ صلاح مشورہ کرتے ہوئے۔ (بشکریہ اسلامک ونڈرس بیورو)

مسیحی تہذیب کا ایک خونین منظر۔ طرابلس میں قتل عام (بشکریہ اسلامک ونڈرس بیورو)

جنگِ طرابلس

طرابلس شمالی افریقہ میں طرابلس ترکوں کا ایک علاقہ تھا۔اس میں پانچ ضلع شامل تھے۔طرابلس خاص' برقتہ الحمرا سے بارقہ یا سرنیکا بھی کہتے تھے۔غدامس وغات۔ نخلستان انزلہ۔فیزان طرابلس کی سرحد ایک طرف مصر سے شروع ہو کر تونس کی سرحد تک ختم ہوتی تھی اس کے شمال میں بحرروم ہے ساحل کی لمبائی ۱۱۰۰۰، ملین فٹ سے زیادہ ہے غدامس وغات ریگستانی علاقہ تھا' بعض حصے' نخلستانی شاداب تھے کل رقبہ ۴ لاکھ مربعہ تھااور آبادی ۱۳لاکھ کی قریب تھی۔ کھجور اور میوہ جات پیدا ہوتے تھے بارقہ شاداب ہے اس میں پانچ پہاڑی مقام بھی واقع تھے۔

طرابلس بحرروم کے کنارے ایک چھوٹا سا مشرقی طرز کا شہر تھالیکن کچھ عمارتیں یوروپین وضع کی تھیں بازاروں میں افراد خرید فروخت کرتے نظر آتے تھے ریشم سازی اور قالین بانی خاص کام ہے۔طرابلس شہر کی آبادی ۱۹۱۲ء کے قریب تقریباً ۶۰ ہزار تھی جس میں عرب ترک یہودی بربری اطالوی اور حبشی بھی شامل ہیں ترکوں کی اکثریت کا علاقہ تھا زیادہ تر تاجر تھے جو انڈوں مویشیوں ،ہاتھی دانت ، شتر مرغ کے پروں اور بکری کے چمڑے کی تجارت کرتے تھے۔باہر سے آنے والے سامان میں آٹا، چاول ، شکر، چائے ، کپڑا، برتن اور یونان سے اسلحہ اور بارود کا بھی لین دین تھا۔ نظام کا طریقہ یہ تھا کہ سلطان دولتِ عثمانیہ کی طرف سے جو مقرر ہوتا وہ فوجداری اور دیوانی کے معاملات بھی دیکھا کرتا تھا۔لیکن بعد میں فوجداری اور دیوانی کے شعبے الگ کردئے گئے۔ حکومت دولتِ عثمانیہ کے طریقہ پر تھی لیکن بعض مسائل میں خوداختیاری بھی حاصل تھی برقتہ الحمر کا تعلق براہِ راست قسطنطنیہ سے تھا۔

طرابلس پہلے یونان کے پاس تھا۔ مختلف حکومتوں کے بعد ساتویں صدی کے بعد اسلامی حکومتوں میں آیا۔ ۱۲۲۱ء میں بنی عامر کی خود مختار حکومت قائم ہو گئی۔ اور ۱۴۰۱ء تک یہ حکومت رہی۔ ۱۵۱۰ء میں فرڈننڈ نے جو سپانیہ کا بادشاہ تھا اس نے قبضہ کر لیا ۱۵۵۳ء میں ترکوں نے اپنی حکومت قائم کی ۱۷۱۴ء میں احمد شاہ حکمراں تھا۔ گورنمنٹ امریکہ نے ۱۷۹۲ء سے طرابلس کے بادشاہوں کو (۸۰۰۰) ڈالر سالانہ اپنی تجارت کی حفاظت اور تجارت کی اجازت کے لئے دینا منظور کئے تھے۔ ۱۸۰۱ء میں بادشاہ نے اس رقم میں اضافہ چاہا۔ لیکن امریکہ نے اضافہ نہیں کیا نوبت جنگ تک پہنچ گئی۔ چار سال تک جنگ جاری رہنے کے بعد امریکہ کے بحری سپاہی مع کمانڈر قید کر لئے گئے۔ ۱۲ ہزار پونڈ معاوضہ لیکر قیدیوں کو رہا کیا گیا۔ ۱۸۳۵ء میں ترکوں نے طرابلس پر دوبارہ حکومت قائم کی اور طرابلس قلمرو عثمانی کا جزو اعظیم قرار پایا۔ قاضی عبداللطیف نے تحریر کیا ہے

> "تھوڑے عرصے سے اٹلی نے اپنے اخبارات میں اس طرح خبریں شائع کرائیں کہ قلمرو عثمانیہ میں اطالیوں کے ساتھ مظالم کئے جا رہے ہیں۔ اور اس کی کچھ سنوائی نہیں ہوتی۔۔۔ لیکن یہ سب اس لئے ہے کہ اٹلی کو طرابلس پر قبضہ کرنے کا بہانا چاہئیے۔ ایک عرصے سے اٹلی چاہتا تھا کہ طرابلس میں اسے خصوصی رعایت دی جائے لیکن ترکی نے اسے پولیٹکل اس لئے غلط سمجھا کہ دوسری سلطنتوں کے لئے اور رشک کا باعث ہو گا۔"(۱)

لیکن اٹلی آسٹریا اور جرمنی میں ایک زمانہ میں اتحاد ہو چکا تھا۔ اور اٹلی اس میں طرابلس کی جانب پیش قدمی کر کے اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا اس لئے اخبارات میں معمولی اور بے بنیاد باتوں کا اس طرح شائع کرایا جاتا جس سے معلوم ہو کہ طرابلس میں اطالیوں کے ساتھ بالخصوص زیادتی ہو رہی ہے۔ ۳ / دسمبر ۱۹۱۱ء کے لندن ٹائمز نے مندرجہ ذیل خبر شائع کی

اطالوی غدرات

"اٹلی کی شکایتوں کے متعلق ۳۰ر ستمبر کے لندن ٹائمز میں اطالیوں مشاہر مونفانہ ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے کہ اٹلی کی رعایا کے ساتھ جلد انصاف نہیں کیا جاتا بلکہ ان پر ظلم کیا جاتا ہے علاوہ خفیف اور شدید تکالیف کے ابطالوی قونسل خانہ کے ملازمین کے ساتھ چھیڑ خانی کی جاتی ہے چنانچہ ایک مرتبہ ابطالیوں کو بعض مخالفین نے گھیر لیا تھا۔ دورِ جدید کے قائم ہونے سے اٹلی کو بہت کچھ امید تھی لیکن اس کی تکالیف اس عہد میں اور دونی چوگنی ہو گئیں۔"

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل شکایات بھی تھیں

مس جولیا فرانزونی

"علاوہ اس کے ایک نوجوان لڑکی مس جولیا فرانزولی جو ترکی ریلوے کے کارخانہ اُدانہ کے کسی مزدور کی لڑکی ہے اغوا کر کے جبراً مسلمان بنا لی گئی اور پھر ایک مسلمان کے ساتھ اس کی شادی کر دی گئی اور ہر چند کہ لڑکی کے ماں باپ اور دیگر غیر ایطاوی اشخاص حتیٰ ایطالوی قونسل و سفارت خاتون سے اعتراض کیا گیا مگر کچھ کارگر نہ ہوا۔ اٹلی کی نظر میں یہ امر اس لئے اور بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اٹلی کے بہت سے مزدور ایشیائے کوچک مین ریلوں پر کام کرنے کے لئے جلاوطن ہوتے ہیں اور اگر اس معاملہ میں زیادہ توجہ نہ دی گئی تو اٹلی کے مزدوروں کا ایشیائے کوچک وغیرہ میں رہنا مشکل ہو جائے گا اور ایسے محل واقعے پھر پیش آئیں گے۔ مزید براں بحر احمر اور طرابلس میں اٹلی والوں کے ساتھ دشمنی برتی جاتی ہے علاوہ اریطیریا (افریقہ میں ابطالوی

مستعمرات میں سے ہے۔) کے محاذی سواحل پر ترکی حکام کا رویہ بہت
سخت رہا ہے چنانچہ بطور نمونہ ایک واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جون سنہ
۱۹۰۹ء کو ترکی توپ والی کشتی موسوالور احمد نے ترکی کے ساحل سے
۴۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ایک اطالوی سموق سے ۴۰۳۴۰ ڈالر چھین
لیا۔ اس طرح جنوانامی جہاز کو بھی ترکوں نے گرفتار (۱) کر لیا اور اس کو
جزیرہ لے گئے اور ۹ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو سموق موسوالمجاپر ترکی کان افسر
زبردستی چڑھ آیا اور ملصوح کے تاجروں کے خطوط کا مطالبہ کیا۔ اس
طرح الطیریا کے دوسرے سمبوں کے ساتھ کاروائی کی گئی۔ طرابلس
میں اطالوی تجارت واقتدار سے مزاحمت کی جاتی ہے۔ ایک اطالوی
بنک یعنی (بینک دی روما) کے ساتھ جو طرابلس میں بغرض ترقی
تجارت قائم ہوا ہے اور جسمیں ابطالوی سرمایہ لگا ہے برابر سختیاں برتی
گئی ہیں۔"

ان باتوں کی بنیاد بنا کر اٹلی نے طرابلس کو الٹیمٹم دے دیا۔ ترکی کے بحری بیڑے اس وقت
جنگ کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اور بعض مورخین کے مطابق گزشتہ سال سے ان کی جانب
غور نہیں کیا گیا ہے۔

جنگ طرابلس وجوہ اور الٹیمٹم

اطالوی الٹیمٹم: ۲۸ر ستمبر ۱۹۱۱ء کو اطالوی گورنمنٹ نے ترکی کو ذیل کے مضمون کا
الٹیمٹم (اندام حجت) بھیجا۔ گورنمنٹ یطالیہ نے سالہا سال سے باب عالی سے یہ درخواست کی
کہ طرابلس و برقہ کے متعلق جو بدنامی اور غفلت ترکی کی طرف سے ظہور میں آئی ہے اس
کا خاتمہ ہو جانا چاہیے ان ممالک میں بھی ویسی ہی ترقی و تہذیب پھیلنی چاہیے جیسی کہ افریقہ
کے شمال کے دیگر حصوں میں موجود ہے۔ تہذیب و تمدن کی عام ضروریات کے باعث اس کا

یا پلٹ کی ضرورت ہے اور جہاں تک اٹلی کا تعلق ہے اس کے لئے یہ امر نہایت اہم ہے کیوں کہ ایطالوی سواحل سے ان ممالک کا فاصلہ بہت کم ہے۔

باوجود اس کے کہ گورنمنٹ اٹلی نے گورنمنٹ عالیہ ترکی کو ہمیشہ مختلف پولیٹکل مسائل پر جو زمانہ حال میں ظہور پذیر ہوئے خیر خواہانہ مدد دی ہے۔ اور اب تک گورنمنٹ اٹلی نے اعتدال اور صبر سے کام لیا ہے مگر نہ صرف یہی کہ اٹلی کے خیالات کو طرابلس کے متعلق گورنمنٹ عالیہ ترکی نے غلط سمجھا ہے بلکہ ممالک طرابلس اور بارقہ میں برابر ایطالیوں کے عام تجارتی واقتصادی معاملات کی نسبت بہت سخت اور نامناسب مخالفت برتی جا رہی ہے۔

گورنمنٹ عالیہ ترکی جو اب تک طرابلس میں برابر ایطالیوں کے جدوجہد سے مانع آتی ہے وقت آخر میں یہ تجویز کرتی ہے کہ وہ تمام اقتصادی امتیازات جو واجب العمل معاہدوں اور ترکوں کے فوائد اور مرتبہ کے موافق ہوں دینے کے لئے آمادہ ہے لیکن اٹلی اپنے گزشتہ تجربہ کی بنیاد پر اس امر پر مخابرات نہیں کرنا چاہتے کیوں کہ ان معاہدوں سے آئندہ کے لئے کوئی ضمانت نہ ہوگی بلکہ ہمیشہ کے لئے جھگڑے بکھیڑے کا موقع پیدا ہو جائے گا۔

مزید بر آں طرابلس اور بارقہ کے ایطالوی کونسلوں نے یہ رپورٹ کی ہے کہ وہاں کی حالت ایطالیوں کے خلاف میں ہیجان پھیل جانے کے باعث نہایت خوفناک ہو گئی ہے اور یہ ہیجان ترکی افسروں اور دیگر حکام کے کارکنوں کی طرف سے مشتعل کیا گیا ہے۔ اس ہیجان سے نہ صرف ایطالوی رعایا کی جان کا خوف ہو گیا ہے بلکہ دیگر ملک کے باشندوں کے لئے بھی اور یہ لوگ بجا اور صحیح طور پر عجلت سے طرابلس کو چھوڑ رہے ہیں۔ طرابلس میں ترکوں کے جنگی سامان کے پہنچ جانے سے طرابلس کی حالت اور خوفناک ہو جائے گی۔ اس کے قبل گورنمنٹ ترکی کو خوفناک نتائج کی اطلاع دی جا چکی ہے اور اب اس امر کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ گورنمنٹ اٹلی ایسے خوفناک نتائج کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

لہذا گورنمنٹ اٹلی نے اپنے مرتبہ اور فوائد کی حفاظت کا خیال کر کے طرابلس اور بارقہ پر جنگی قبضہ کر لینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور صرف یہی ایک ترکیب ہے جس کو اٹلی نے حل

مشکلات سمجھا ہے گورنمنٹ اٹلی یہ امید کرتی ہے کہ گورنمنٹ عالیہ ترکی اپنے نمائندوں کے تمام احکام اس مضمون کے صادر کریگی کہ ایطالویوں کی مخالفت کسی قسم سے نہ کی جائے اور ضروری معاملات بغیر کسی تکلیف کے انجام پاجائیں۔اٹلی کے سفیر کبیر مقیم قسطنطنیہ کو احکام اس مضمون کے صادر ہوتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ عثمانیہ سے اس تحریر کی وسیلہ سے ۲۴ گھنٹہ بعد جواب سنائی طلب کرے ورنہ گورنمنٹ اٹلی مجبور ہو کر قبضہ کرنے کی کاروائی اختیار کریگی۔ براہ عنایت یہ ہدایت کی جائے کہ مذکورہ ۲۴ گھنٹے کے اندر اس مراسلہ کا جواب ترکی سفیر مقیم روما کے ذریعہ سے بھی ہمکو دیا جائے۔

دستخط سان گیلالو

وزیر خارجہ اٹلی

اس کا جواب حسب ذیل گورنمنٹ ترکی کی طرف سے ۲۹ر ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء کو دیا۔

جواب سفارت خانہ شاہی اٹلی کو وہ مزید دشواریاں معلوم ہیں جن کے باعث طرابلس اور بارقہ ترقی کے فوائد حاصل نہ کر سکے۔ اگر معاملات کو انصاف دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ گورنمنٹ مشروطہ عثمانی حکومت قدیم کے باعث جو خرابیاں پیدا ہوئیں انکی ذمہ دار نہیں ہے۔ گزشتہ ۳ سال کے واقعات کے اندر کوئی بات بابعالی کو ایسی معلوم نہیں ہوتی جسمیں ایطالوی تجارت کے ساتھ بارقہ اور طرابلس میں مخالفت برتی گئی ہو۔ بلکہ برخلاف اس کے باب عالی نے ہمیشہ اس امر کو مناسب سمجھا کہ اٹلی اپنے سرمایہ اور صنعتی جدوجہد سے اس ملک کی اقتصادی ترقی میں کوشاں ہو اور جب کبھی اٹلی کی طرف سے اس امر کی تجویز پیش ہوتی ہمیشہ اس کا مناسب لحاظ کیا گیا۔ سفارت خانہ اٹلی کی طرف سے جو کچھ مطالبات اور معاملات ہوئے گورنمنٹ عثمانیہ نے اس کی نسبت ہمیشہ عمدہ سلوک کیا ہے اور بیان کرنا ضروری ہے کہ ہر مرتبہ اٹلی کی خواہشات جو قبول کی گئیں ان سے صاف طور پر یہ امر ظاہر ہو سکتا ہے کہ گورنمنٹ ترکی کہاں تک اتحاد و دوستی کے تعلقات کو اٹلی کے ساتھ نبھانا چاہتی ہے۔ فی الحقیقت آخر موقع پر بھی گورنمنٹ نے جدید تجویز کی کہ اٹلی کو طرابلس اور بارقہ

میں زیادہ اقتصادی مراعات دے جائیں یہ محض اتحاد وارتباط جاری رکھنے کے خیال سے تھا اور یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ ایسے مراعات دینے میں سلطنت عثمانی اپنے مرتبہ اور اعلیٰ منافع اور نیز معاملات میں اصول کا خیال رکھے گی خصوص ان معاملات کا جو سلطنت ترکی نے دیگر دول کے ساتھ کئے ہیں کیوں کہ محض ایک فریق کی مرضی پر معاہدہ کی بین الملکی قوت برباد نہیں کی جا سکتی۔

جہاں تک کہ طرابلس اور بارقہ کی نسبت امن کا تعلق ہے گورنمنٹ عثمانیہ اس معاملہ کو بہتر جان سکتی ہے اور جیسا کہ ہماری گورنمنٹ پہلے لکھ چکی ہے طرابلس اور بارقہ میں کوئی وجہ اس امر کی پائی نہیں جاتی جس سے وہاں ایطالوی یا دیگر ممالک کی رعایا کی جان و مال کا خوف ہو۔ ان ممالک میں نہ صرف یہ کہ فی الحال کوئی ہیجان نہیں ہے بلکہ کسی قسم کی اعتدال انگیز جد وجہد بھی نہیں ہے اور وہاں کے عثمانی حکام کے نام امن قایم رکھنے کے احکام صادر ہوئے ہیں جو نہایت وفاداری سے اپنے فرائض کر رہے ہیں۔

جنگی سامان کے پہنچ جانے کے متعلق جو اشارہ کیا گیا ہے اسکے متعلق ترکی یہ بیان کرنا چاہتی ہے کہ فی الحقیقت ایک ہی بار سامان بھیجا گیا اور وہ بھی ۲۶ر ستمبر کے مراسلہ کے کئی دن قبل۔ مزید بر ان سامان جنگ کے ساتھ کوئی فوج نہیں بھیجی گئی اور اس سے پبلک کے دل میں سوا امن کے اور کسی چیز کا ظن نہیں ہو سکتا۔

اعلانِ جنگ

۲۹ر ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء کو سفارت خانہ اٹلی نے ذیل کا اعلانِ جنگ باب عالی کو بھیجا۔

حسب الامر شاہ اٹلی وزیر مختار اٹلی اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ گورنمنٹ اٹلی نے جو مہلت باب عالی کو بعض ضروری امور کے متعلق دی تھی منقضی ہو گئی ہے اور اس کا کوئی جواب شافی گورنمنٹ اطالیہ کے پاس نہیں پہنچا ہے۔ ایسے جواب کے نہ آنے سے گورنمنٹ ترکی کی بد ظنی یا اس کی اور اس کے حکام کی کم قوتی کی تصدیق ہوتی ہے جسکا بارہا ثبوت مل چکا ہے خصوصاً

طرابلس اور بارقہ میں اطالویوں کے حقوق کے متعلق لہٰذا گورنمنٹ عالیہ اپنی عزت اور اپنے منافع کو اپنے حق الوسع محفوظ رکھنے کے لئے مجبور ہو گئی ہے اور جو نتائج اس سے پیدا ہو گئے وہ گویا ترکی حکام کی گزشتہ روش کا نتیجہ ہو گئے۔ دوستی اور امن کے تعلقات پس ترکی اٹلی میں منقطع ہو گئے۔ اٹلی اسی وقت سے ترکی کے ساتھ برسر جنگ ہے۔ دستخط کنندہ ذیل جناب عالی کی خدمت میں یہ اعلان دیتا ہے کہ ترکی وزیر مختار مقیم روما کو پاسپورٹ دے دیا جائے گا اور میں بھی یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرا پاسپورٹ بھی صادر کیا جائے۔ گورنمنٹ عالیہ نے مجھے یہ مطلع کرنیکی ہدایت کی ہے کہ عثمانی رعایا قلمرو اٹلی میں بلا خوف جان و مال و کاروبار رہ سکتی ہے۔

دستخط ڈی مارٹیو

محمد عزیز احمد نے اپنی کتاب دولتِ عثمانیہ :جلد دوم (محمد عزیز ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔بی۔ لیکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۴۳ء) ص ۲۰۰ پر تحریر کیا ہے۔

"۱۹۱۰ء تک اٹلی برابر یہ اعلان کرتی آئی کہ وہ سلطنت عثمانیہ کے کسی حصہ کی خواہش مند نہیں ہے۔ ۲ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو اطالوی پارلیمنٹ میں وزیر خارجہ اطالوی نے کہا:

"ہم چاہتے ہیں طرابلس ہمیشہ ترکوں کے پاس رہے۔"

لیکن اس اعلان کے دس مہینہ کے بعد طرابلس کو الٹیمیٹم دے دیا اور پچاس ہزار فوج طرابلس پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کر دی۔ عبدالحمید نے بحریہ پر توجہ نہیں کی تھی۔ اس لئے وہ انتہائی کمزور تھا۔ اور طرابلس کے فوجی دستہ کی تعداد کل بیس ہزار تھی۔ چونکہ مصر پر انگریزی تسلط قائم ہو چکا تھا۔ یہ سلطنت عثمانیہ کا علاقہ تھا۔ لیکن اس وقت تک انگریز کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس لئے ترکی فوج کو طرابلس ترکی فوج کی کمک نہیں جا سکتی تھی۔

انور بے کسی طرح پہنچ گئے اور انھوں نے عرب قبائل کو فوجی تربیت دینا شروع کر دی۔ اور یہ اعلان کیا کہ جو قبیلہ قواعد جنگ میں اوّل آئے گا اسے ایک طلائی علم دیا جائے گا۔ چنانچہ ہر قبیلہ نے محنت کرنا شروع کی رات و دن قواعد کی مشق کی۔ اطالیوں کے گولے

بکثرت آنے لگے۔ لیکن ایک دن حاقبیلہ نے ایک ساتھ ہلّہ بول کر اطالیوں سے ایک کیمپ خالی کرالیا اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بچے کھچے بھاگ نکلے انور بے نے حاقبیلہ کو طلائی الم انعام میں دیا۔ جو عزت کا نشان تھا۔
حاقبیلہ نے اسے اپنے کیمپ پر لگایا یہ دیکھ کر دوسرے قبیلہ بھی سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے اور ایک دن جبکہ طرابلس کی کچھ علاقوں پر قابض ہونے کی خوشی میں اطالوی کیمپ میں فوجی نشے میں چور تھے۔ عرب قبائل نے صحرائی نعروں کے درمیان کیمپ پر ہلّہ بول دیا۔ ایک اتالین پلٹن کے بیشتر سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیے۔ مالِ غنیمت میں تقریباً ۸۰۰ بندوقیں تھیں۔ ''اطلسی علم'' انھیں عطا کیا گیا پھر تو ہر قبیلہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کوشش کرنے لگا۔ اور مالِ غنیمت کے طور پر کافی اسلحہ جمع ہو گیا۔ اطالوی بحر جنگ پر زور دینے لگے انھوں نے جزائر پر قبضہ کیا اور سفّا کی کی۔ باب عالی نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو لوازن پر دستخط کر دیئے۔ بلقانی ریاستوں نے متحد ہو کر ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ بلقان کا اتحاد بظاہر عثمانیہ کے عیسائی صوبوں کی اصلاح تھی۔

ماخذ جنگِ طرابلس

(۱) جنگِ طرابلس ص ۱۰، مطبع جلیل المتین کلکتہ
(۲) جنگِ طرابلس ، ص ۹
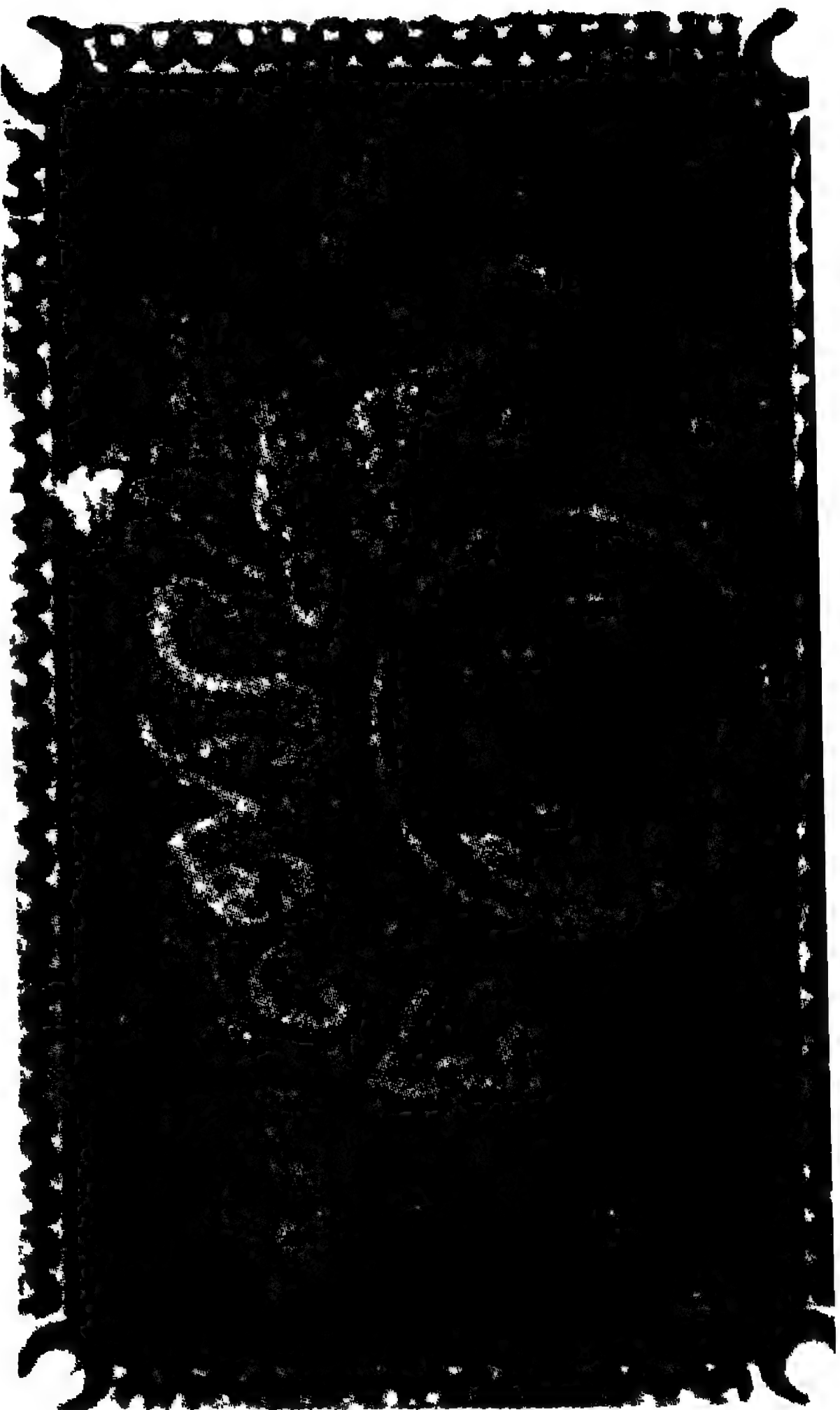
ہندوستان سے ترکوں کی مدد کیے جو چندے بھیجے گئے تھے اس کا نمونہ رسید (بشکریہ اسلامک وندرس بیورو)

تحت حمایه حضرت ملوکانه ده
عثمانلی هلال احمر جمعیتی
مرکز عمومیسی
عدد

CONSTANTINOPLE, THIS 14TH 2 1912.

Dear Sir,

The Imperial Ottoman Bank, here. has paid us the sum of 400 £ kindly sent from you, through the Bank of Benegale, for the fund of the Ottoman Red-Crescent.

Herewith please find receipt for the above amount.

We cannot find terms to express you our deepest thanks for your encouraging work, and hope, you would, as Proprietor Editor of a paper, largely contribute to the development of our Society. which is meeting sympathy home and abroad and specially with the Islamic world.

* * * * * *

Before closing, we thank you again for your successful efforts,

We remain, Dear Sir,

Yours very respectfully,

(Sd.) H. S. MEHMEDALLI, محمد علی

Inspecteur-General.

(Seal.)

عثمانلی هلال احمر جمعیتی

Societe Du Croissant Rouge Ottoman.

To the Proprietor-Editor of the '*Comrade*",

Calcutta.

انجمن ہلال احمر عثمانی

۲۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء کو اٹلی نے باب عالی میں اعلان جنگ کا پروانہ بھیجا۔ اور چونکہ طرابلس ترکوں سے متعلق تھا اس لئے یہ بھی پروپیگنڈا کیا جارہا تھا کہ یہ صلیبی جنگ ہے۔ ایک طرف عیسائی اکثریت تھی دوسری جانب مسلم ریاستیں۔ اس لئے ایک ایسی انجمن بنانے کی ضرورت محسوس کی گئی جو شہدائے جنگ کی تجہیز و تکفین اور یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کی مدد کرے اس کے علاوہ زخمیوں کی تیمارداری اور علاج بھی ہو سکے۔

انجمن ہلال احمر عثمانی کے قیام کے سلسلے میں ہمدرد ۱۵ مارچ ۱۹۱۳ء سلسلۂ خاص (جلد نمبر ۲۰) لکھتا ہے

"اگرچہ اس انجمن کو قائم ہوئے صرف ڈیڑھ برس ہی کا زمانہ ہوا ہے۔ تاہم اس قلیل عرصے میں اس نے جو جو کار نمایاں کیے ہیں۔"

محولہ بالا ہمدرد کی عبارت کی روشنی میں اکتوبر ۱۹۱۱ء کے قریب انجمن حلال احمر کا قیام ہونا چاہئے۔ انجمن ہلال احمر کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا محمد علی نے لکھا ہے

"ایک ایسے پر آشوب زمانے میں جبکہ ایک عالم سلطنتِ عثمانیہ تخریب و تباہی پر کمر بستہ ہے اور اس پر ہر طرف سے آئے دن نت نئے حملہ ہوتے رہتے ہیں ایک ایسی انجمن کے قیام کی اشد ضرورت تھی۔۔۔ مخلصانِ قوم و ہمدردان ملت کی ہمت اور جان توڑ کوششوں نے نہایت ہی تھوڑے عرصے میں انجمن حلال احمر قائم کر دی۔ اور صرف قائم ہی نہیں کر دی۔ بلکہ حیرت انگیز اور خلافِ توقع ترقی کے

اس درجہ کو پہنچادیا کہ بالا آخر اور دوسرے ممالک کی ایسی ہی انجمنوں کی طرح ہیگ کانفرنس نے اسے بین القوامی انجمن تسلیم کرلیا۔"

ہمدرد انجمن کے اعتراض ومقاصد بتاتے ہوئے لکھتا ہے

"اس انجمن کا یہ فرض ہے کہ مجروحین اور بیماروں کا علاج شہدا کے متعلقین کی خبر گیری اور مہاجرین کی امداد کرے۔ اس انجمن کے مُربّی و سرپرست جلالتماب سلطان المسلمین محمد خامس (خلد اللہ ملکہ وسلطانہ) ہیں اور اس کی آمدنی مختلف قسم کے عطیوں اور عام چندوں سے ہے انجمن کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۳۰ ہے جو ایک بڑے سالانہ جلسے میں انجمن کے بانیوں اور بھی خواہوں کی رائے سے منتخب کئے جاتے ہیں۔"(۱)

ماخذ انجمن ہلالِ احمر عثمانی

(۱) روزانہ ہمدرد ۱۴ مارچ ۱۹۱۳ء سلسلۂ خاص نمبر ۱۹ ص ۲

طبیہ ہلال احمر عثمانی کے رُکن نواب سید محمد حسین، ڈاکٹر عبدالحق سلیم،
جناب سید حسن عابد جعفری، جناب عبدالحق اور جناب آلِ امام
(بشکریہ اسلامک وِنڈرس بیورو)

انجمن کے عہدہ داران

۱۵ار مارچ ۱۹۱۳ء روزانہ ہمدرد سلسلہ خاص نمبر ۲ نے خلاصہ کاروائی و خدمات انجمن ہلال احمر عثمانی' کے عنوان کے تحت انجمن کے آنریری (اعزازی) ممبہ ان کی تفصیل اس طرح دی ہے ۱۔صدر انجمن(۱) ۲۔نائب صدر(۱) ۳۔جنرل سیکریٹری(۱) ۴۔محاسب(۱) ۵۔خزانچی(۱)

انجمن کے اغراض و مقاصد . میں یہ بات شامل تھی کہ وہ دشمن اور دوست میں فرق نہ کرے اور جس طرح وہ مسلمان مجروحین کی خبر گیری کرتی ہے اس ہی طرح دشمن کے مجروحین کی بھی خبر گیری کرے۔انجمن کا پہلا کام جنگِ طرابلس کے مجروحین کی خدمت تھی۔اس انجمن نے شفاخانہ چلانے اور نئے شفاخانے قائم کرنے کے لئے ۳۰۰۰۰ ترکی پونڈ صرف کئے(یہ ۱۹۱۳ء کی فیگر ہے اس وقت ترکی پونڈ تیرہ روپے آٹھ آنے کا تھا)

جنگ کے بلقان شروع ہونے کے بعد ۴ راکتوبر ۱۹۱۲ء کے دفتر کی مرکزی کونسل کا ایک جلسہ حسین جلی پاشاہز ہائنس کی صدارت میں ہوا اس میں یہ طے کیا گیا کہ ہر اسپتال کے لئے کتنا کتنا اسٹاف لازمی ہو۔اس کے علاوہ ہر مریض کے لئے چار جوڑی کپڑے اور چار جوڑی چادریں مہیا کی جائیں۔

انجمن ہلال احمر عثمانی کی بنیاد سلطنت عثمانیہ میں پڑی لیکن ہیگ کانفرنس میں اس کی بین القوامی حیثیت کو تسلیم کرانا اور دوسرے ممالک کے علاوہ ہندوستان کی مختلف صوبوں اور شہروں میں اس کے دفاتر قائم کرانے کا سہرا علی برادران کے سر ہے۔یا یوں کہیے کہ ریڈ کریسنٹ (ہلال احمر) کی بین القوامی حیثیت کو تسلیم کرانے کا سہرا ہندوستان کے سر ہے۔جس میں ہندوستانیوں کی رواداری اور پوری دنیا کے انسانوں کو انسانیت کی بنیادوں پر اپنا

بھائی سمجھنے کا جزبہ موجود ہے' ہلال احمر انجمن کی ہندوستان کے مختلف شہروں میں شاخیں قائم کی گئیں دولتِ عثمانیہ کو جنگِ طرابلس کے فوری بعد جنگ بلقان کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خزانہ میں روپیہ کی کمی تھی۔ اس لئے کہ جنگ میں دفاع کی وجہ سے بجٹ کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے' ہندوستان سے ہلال احمر کے ذریعہ چندہ ہو کر دولتِ عثمانیہ کے تحت ممالک کے لئے جانے لگے۔ اور اسی زمانے میں ترکی کو قرض کے طور پر قرض روپیہ ہندوستانی عوام نے مختلف اقساط میں روپیہ قرض کے طور پر دیا۔ جو ترکی سے آج تک واپس نہیں لیا گیا۔ اس کی تفصیل کامریڈ اور ہمدرد کے فائلوں کے علاوہ معاصر اخبارات میں بھی ملتی ہے۔

ہندوستان سے ترکی کی دو طرح سے مالی امداد کی گئی۔ وقار الملک کا ایک مضمون' چندہ ہلال احمر اور ترکی قرضہ' کے عنوان سے شائع ہوا اس میں دو طرح کی مالی امداد کا ذکر ملتا ہے

"دو قسم کے مالی امداد کی (ترکی کو) ضرورت ہے۔ ایک تو مجروحات و یتیمان و بیوگان وغیرہ کی امداد کے لئے جس کا انتظام انجمن ہائے ہلال احمر سے متعلق ہے اور دوسرے بطریق قرض ترکی کی مدد کرنا اور اس کے پُر امپسری نوٹ یعنی تمکات خریدنا۔" (۱)

آگے ان دونوں چندوں کی تفصیل بتاتے ہوئے وقار الملک نے لکھا ہے۔

"انجمن ہائے ہلال احمر کے واسطے جن چندوں کی ضرورت ہے وہ صرف ایک مکمل انتظام کی محتاج ہیں۔ یعنی ہر جگہ ایک صدر کمیٹی منظم ہونا چاہیئے۔ اور اس کے تحت اور چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں بنائی جائیں تاکہ ہر ایک مسلمان تک چندہ مانگنے والے کی رسائی ہو جائے۔۔۔ اب دوسرا مسئلہ ترکوں کو قرض دینے کا ہے جس کی نسبت وہ وعدہ کرتے ہیں کہ ایک معیارِ مقرر پر مع منافع واپس کیا جائے گا۔ اور اس کے واسطے انھوں نے تمکات جاری کئے ہیں۔" (۲)

مسلمانوں کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ اگر ترکوں کو شکست ہو گئی اور اس کی وجہ یہ قرار پائی کہ پیسہ کی

کمی کی وجہ سے وہ سامانِ جنگ مہیا نہ کر سکے تو کلنک ہر مسلمان کے ماتھے پر ہوگا۔اور تاریخ ہمیشہ کے لئے ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے اس بات پر شرمندہ کرتی رہے گی کہ

"ہم نے اسلام کو (مراد ترکوں سے ہے) ایسی شدید مصیبت میں مبتلا دیکھا اور ہم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ جن جواں مردوں نے ہر قسم کی سختیاں اپنے اوپر برداشت کیں اور اپنے مال اور اپنی جان تک کی پروانہ کی ہم ان کی مدد نہ کر سکے۔"(۳)

شاہ ابوالخیر صاحب (دھلی) کے پاس جب ترکوں کے لئے چندہ لینے کے لئے چند حضرات پہنچے تو آپ نے ترکوں کے پاس سامانِ جنگ کم ہونے کا ذکر کرتے ہوئے ان کے لئے دعا کی۔ قبلہ شاہ ابوالخیر صاحب نے کچھ روپیہ کسی غریب کی لڑکی کی شادی کے لئے جمع کر کے رکھا تھا موصوف نے وہ روپیہ ترکی چندے میں دے دیا۔اور کہا کہ ترک کی مدد زیادہ اہم ہے۔"(۴)

لیکن یہ سب نتیجہ تھا علی برادران کی کوششوں اور ان کے رفقاء کار کا۔اس کے علاوہ کامریڈ سے امدادی رقم الگ بھیجی جاتی تھی کامریڈ کی جانب سے ترکوں کے علاقوں میں اسپتال بھی قائم تھے چنانچہ سیڈیز (مقدونیہ) کا کیمپ ہاسپٹل ابتدا ہی سے کامریڈ کے چندہ سے چلتا تھا۔ ہمدرد لکھتا ہے

"سیڈیز کا کیمپ ہاسپٹل ابتدا سے ہی کامریڈ کی فرستادہ چندہ سے قائم ہے اور جاری ہے۔اس کے اخراجات کی میزان ۱۴ فروری ۱۹۱۳ء تک ۷۵۰۷۷۹۲۰ پیاسٹر ہوتی ہے (۱۰۰ ترکی پیاسٹر ۱۳ روپیہ ۸ آنے)"(۵)

اس کے بعد مختلف اشیا جو اس روپیہ سے خریدیں گئیں اور بعد میں اسے کیمپ ہاسپٹل میں تقسیم کیا گیا ان کی تفصیل اور رقوم دی گئی ہیں۔اس میں دودھ لیمپ، چینی کے برتن، کمبل، دوائیں، شکر، وغیرہ شامل ہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹروں، اور نرسوں کی تنخواہوں

کی تفصیل دی گئی ہے، اس کے علاوہ مریض کو ۱۰۰ قمیض ۱۰۰ پتلون، قمیض شب خوابی موزے تقسیم کیئے گئے ہیں۔(۶)

کامریڈ کے دفتر کی جانب سے مختلف مقامات پر کیمپ ہاسپٹل لگتے تھے۔

زخمیوں کی مرہم پٹی کے علاوہ وہ عوام جو بے سر و سامان کی وجہ سے بیمار پڑتا اور ان گھروں میں اموات ہوتیں وہاں بھی امداد کے طور پر روپیہ تقسیم کیا جاتا اور جنازوں کی تجہیز تکفین ہوتی۔ چنانچہ اس زمانے میں جو روپیہ ترکوں پر خرچ ہوتا اس کی گاہے بگاہے تفصیلِ خرچ ہمدرد میں شائع ہوتی۔ ہمدرد ۴؍ مئی ۱۹۱۳ء سلسلہ خاص نمبر ۶۲ پر امداد مصیبت زدگان مقدونیہ قسط ۲ شائع ہوئی ہے

"ہاسپٹل مذکورہ صدر کی تفصیل اخراجات جو موصول ہوئے ہیں درج ذیل کئے جاتے ہیں

	اوقیہ
کوئلہ مع خرچ	۶۴۳۲۰۰۰
لحد پر رکھنے کے لئے تختے	۶۱۵۰۵۰
دودھ وغیرہ	۱۹۳۰۵۰
سامان تجہیز و تکفین	۱۳۷۵۰۰۰

اس مدد کے علاوہ وہ مہاجرین جو بلقان کی جنگ کے موقع پر بے گھر ہو کر ادھر اُدھر بھٹک رہے تھے ان کے لئے ایک کالونی بنانے کی تجویز پیش ہوئی۔ ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار اور ڈاکٹر انصاری جو طبی وفد کے ساتھ تھے، قسطنطنیہ میں تھے اس کے لئے الگ سے ہندوستان سے مزید روپیہ منگوانا چاہتے تھے۔ اور محمد علی کو لکھا تھا کہ مہاجرین کی نئی آبادکاری کے لئے ہم کام کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں ڈاکٹر انصاری کے خطوط ہمدرد میں شائع ہوتے ہیں ان کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں

"تمہارے پاس ابھی تک کوئی خاص تجویز مہاجرین کو امداد دینے کے متعلق موصول نہیں ہوئی ہے۔"(۷)

قسطنطنیہ سے بذریعہ تار

"ہزاروں خانماں برباد مہاجرین کو ضرورت ہے کہ از سر نو اپنی معاش کا انتظام کریں۔ ہم دو سو خاندانوں کے لئے اناطولیہ میں نمونہ نو آبادی قائم کرنا شروع کر رہے ہیں خرچ کا تخمینہ ساڑھے چار لاکھ روپے (تیس ہزار پونڈ) کیا ہے۔ کامریڈ و زمیندار پچاس پچاس ہزار روپے اس کام کے لئے دے سکتے ہیں۔ زمیندار کو فوراً تار دیجئے۔ ظفر علی خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔"(۸)

۱۳ اپریل ۱۹۱۳ء کے ہمدرد میں مصیبت زدہ ترکوں کی نو آبادی کے عنوان سے مولانا محمد علی جوہر نے اپیل کی ہے کہ ترکوں کی نو آبادی قائم کرنے کے لئے ساڑھے چار لاکھ روپے کی رقم درکار ہے۔ یہ زیادہ ایسی بڑھی رقم نہیں ہے۔ کہ ہندوستان سے جمع نہ ہو سکے اس کے سلسلہ میں انھوں نے ایک طویل اور دل سوز مضمون لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں

"چند ماہ کی جنگ نے جو خانہ بربادی کی برسوں کے اطمینان اور محنت سے بھی اس کا مداوا نہ ہو سکے گا ہم چاہتے ہیں کہ یہ خیال مسلمانوں کے فیاضانہ جزبات کو پھر تحریک دے"۔

جنگِ طرابلس قاضی عبداللطیف ایم اے ۱۳۳۰ھ مطبع جل المتین کلکتہ ص ۱۰۔ ترکی نے اپنے اخبارات میں شائع کرنا شروع کیا

"تھوڑے عرصے سے اٹلی کے اخبارات نے دنیا کو یہ دکھلانا چاہا کہ قمرو عثمانیہ میں اطالوی کے ساتھ مظالم کئے جا رہے ہیں۔ اور اس کی کچھ سنوائی نہیں ہوتی لیکن یہ سب اس لئے ہے کہ اٹلی کو طرابلس پر قبضہ کرنے کے لئے بہانہ چاہئیے۔"ایک عرصہ سے اٹلی چاہتا تھا کہ طرابلس میں اسے خصوصی رعایت دی جائے لیکن ترکی نے اسے پولیٹکلی اس لئے غلط سمجھا کہ دوسری سلطنتیں اور شکِ کا باعث ہوں گی۔

ماخذ: انجمن کے عہدیداران

(۱) ہمدرد ۱۲/اپریل ۱۹۱۳ء، ص ۲ سلسلۂ خاص نمبر ۴۳

(۲) ایضاً

(۳) ہمدرد ۱۲/اپریل ۱۹۱۳ء

(۴) ایضاً

(۵) ۱۵/اپریل ۱۹۱۳ء ہمدرد

(۶) روزانہ ہمدرد سلسلۂ خاص، نمبر ۶۱۔ ایضاً بعنوان امداد مصیبت زدگان مقدونیہ

(۷) ۱۳/مئی ۱۹۱۳ء، ص ۲

(۸) ۲۶/اپریل ۱۹۱۳ء

(۹) ہمدرد ۱۹ اپریل ۱۹۱۳ء، ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار، اخبار کے بارے میں ہمدرد لکھتا ہے "ظفر علی خاں آج کل یہیں ہیں۔" روزانہ ہمدرد ۲۴/اپریل ۱۹۱۳ء 'ظفر علی خاں آج کل ہندیہ کوئی میں ہمارے مہمان عزیز ہیں" ۳۰/اپریل ۱۳ء ہمدرد

چند نام محمود شوکت پاشا وزیر جنگ۔ کرنل انور بے سردار شہید ترکی ہلال احمر (Redeross) کا دوسرا نام تھا۔

نوٹ جنگِ طرابلس، عبداللطیف ص ۱۶۷ پر تصاویر شائع ہوئی ہیں جس سے اطالوی زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کی ہوئی ہے۔

The Comrade.

WHEN REPLYING QUOTE REF NO. ——

109 Ripon Street

Calcutta, 191

if Mirza Abdul Baig may come.
I am writing to him also tonight.
You must write also immediately
on the receipt of this pressing him
to come out. With you & Abdul
Baig what could we not do!
Of course, God is above us all
& without His assistance nothing
is possible. Ask Abdul Baig
to write to you frankly
on what terms he would come to

مولانا محمد علی جوہر کی انگریزی تحریر کا عکس

reason why I should "pray for
your long life & prosperity" as
the petitioners do it.

Do let me know how your
affairs stand. I am writing to
Hashim — a thing which I should
have done more than a fortnight
ago had I not been so distracted
by Ghulam Hasnain's ill-health
& the worry of issuing the legal
prospectus after consultation
with the solicitors. I hope that
would be all right.

I hear from [illegible] that

If I Press Abdul Haq may come I am writing to him also tonight you must write also immediately on the receipt of this pressing him to come out with you Abdul Haq what could we not do Of course, Allah is above us all without his assistance nothing is possible Ask Abdul Haq to write to you frankly on what terms he would care to

Reason why I should "pray for your long life and prosperity, as the letters has it

Do let me know how your affairs stand I amd writing to has him a thing which, I should have done more than that a fortnightly had I not been so nstaieted by His him Husain's health and the worry of issuing The legal prospects after consultation with the solicitors I hope that would be all right

I hear from a سید شوکت علی دہلوی That-----

عکس تحریر مولانا محمد علی مرحوم

رنگون بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۴ر مئی ۱۹۲۹ء

پیارے محمود اسلام علیکم
محبت نامہ دہلی سے لکھوایا گیا تھا۔ اور کچھ خلافت کے لئے، کچھ جامعہ کے لئے۔ کچھ دعوت و تبلیغ کے لئے یہاں کی دعوت پر یہاں آیا تھا۔ پہلی بار آنے کا خیال ترک کر چکا تھا۔ کہ شوکت نے مجبور کیا۔ حمیدہ کو سخت بیمار اور یوں بچوں کو مغلوک الحال چھوڑ کر آیا تھا۔ وقت کافی نہ تھا اس لئے کہ مسلم لیگ (۱) کی خدمت کرنے کے لئے واپس جانا تھا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ جو توقعات شوکت صاحب نے یہاں کے متعلق باندھی تھیں وہ غلط تھیں۔ یہاں مطلق کام سرد ہوا تھا۔ اسی ہی ڈاک سے یہ خط تمہیں ملے گا۔ اور غالباً اس سے پیشتر میں ایک تار بھی دے دوں ہو سکا تو بہار سے گزروں گا پٹنہ سے یا گیا سے اگر ساتھ چل سکو تو چلو شوکت کے خط کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ اُنھوں نے۔۔۔۔ ڈیوڑھی پر بار بار جاکر مجھے اُن سے گالیاں کھلوائیں۔ پیارے بھائی بظاہر یہ دو سال کا ہے کیریکٹر کے امتحان کا زمانہ ہے۔ سب کا (۲) ہی رہا ہے۔ ہم لوگ دشمنان ملک اور (۳) بہت مست ہیں۔ آج۔۔۔۔ یہ زرگر اور زر طلب ملک پرور اور ملت دوست ہے۔ یا۔۔۔۔ یہ بے عقل اور کم ظرف اور حریص یا۔۔۔۔ یہ ملحد و بے دین دار ہے اور یہ نوجوان مسلماں خادم وہی ہیں جو اسلام کو سمجھتے نہیں نہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ مگر ان سے علیحدہ ہوتے ہیں تو ہمارے ملت ہیں۔ وہ ملک و ملت فروش حکومت کے پرستار نظر آتے ہیں جن کو ساری عمر خود ہم نہ گالیاں دیں اور کوسا۔ یہ ہمکو اپنا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ سو جس طرح ہم مالوی اور بنجے کے، یا نہرو اور چنتا منی کے آلہ کار سے بن چکے۔ اسی طرح شفیع اور عبد الرحیم کے بھی آلہ کار بن سکتے۔ اس

وقت سوائے اس کے چارہ کار ہے کیا کہ دوا سے تھک کر دعا کئے ہاتھ اُٹھائیں۔ اور مسلمانوں کو اور ہندوستان والوں کو خدا کے سپرد کریں اور اس وقت کا انتظار کریں جبکہ یہ اپنے نئے رہنماؤں کی ہدایت کا مزا چکھ کر پھر ہمارے پاس آئیں گے۔ اور التجا کریں گے کہ پھر ہمیں انگریزوں اور ان کے ہندو اور مسلمان ملازموں سے نجات دلادو۔ خدایہ وقت جلد آئے۔ یا ہم کو جلد اس دنیا سے اُٹھالے۔ آمین بہن کو اور بچوں کو پیار۔

تمہارا بھائی

محمد علی

نوٹ محمود اللہ صاحب مرحوم مولانا محمد علی کے داماد تھے۔ مولانا کی صاحبزادی آمنہ بیگم سے انکی شادی ہوئی تھی۔ آمنہ بیگم کے نام دعائے اسیر کے عنوان سے محمد علی کی ایک نظم بھی ہے جو ان کی علالت اور جیل کے زمانے میں کہی تھی۔ آمنہ بیگم کے انتقال کے بعد محمود اللہ صاحب نے اسری بیگم سے شادی کر لی تھی ان سے دو لڑکیاں نجمہ بیگم اور رقیہ بیگم ہیں۔ محمود اللہ، مولانا محمد علی کے چچازاد بھائی بھی تھے۔

Know all Men by these Presents that Mohammed Ali of Rampur (State) North West Provinces in the Empire of India at present residing at 32 Brondesbury Villas Kilburn in the County of Middlesex Student of Lincoln College Oxford do hereby appoint my brother Shaukat Ali of Rampur aforesaid Assistant Opium Officer of Gonda Oudh in the Empire of India aforesaid to be my Attorney for me and on my behalf and in my name to sell at such time or times and for such consideration as my said Attorney shall think fit all or any part of my real estate in land or shares of Zemindaree in the Empire of India aforesaid either held by me as proprietary owner or mortgagee together with all benefits rights and incidents of Zemindaree possessed by me in such real estate together or in lots and either by Public Auction or Private Contract and either with or without special conditions as to title or otherwise with liberty to buy in at any sale by auction to rescind or vary Contracts for sale and to resell without being answerable for any loss arising thereby And also to execute such deed or deeds for conveying the said premises to any Purchaser or Purchasers thereof And also to give effectual receipts and discharges for the purchase moneys of the same premises as my Attorney shall think fit And whatsoever my said Attorney shall lawfully do in the premises I hereby agree to ratify and confirm And I declare that this power shall be irrevocable for twelve calendar months computed from the date hereof **In witness** whereof I have hereunto set my hand and seal this twenty second day of March One thousand nine hundred

Signed sealed and delivered by the above named Mohammed Ali in the presence of

Mohamed Ali

London W.C.

Notary Public.

Know all men by these presents that Mohamed Ali of Rampur (State) North West provinces in the Empire of India at present residing at 82, Brondisbury Villas Kilburan in the County of Middlesex student of Lenicoln College, Oxford. So hereby appoint my brother Shaukat Ali of Rampur aforesaid Assistant Opium Officer of Gonda Aoadh in the Empire of India aforesaid to be my Attorney for me and on my behalf and in my name to sell at such time of times and for seuh consideration as my said Attorney shall think fit all or any part of my real estate in land or share of zemindari in the Empire of India aforesaid either held by me as proprietary owner or mortagaer together with all benefits rights and incidents of zamindari possessed by me in such real estate together or in lots and either by public auction or private contract and either with or without special condition as to like or otherwise with liberty to buy-at and sale by auction to resend or vary contracts for so and to resell without being ansuoerable for any loss arising thereby And so to exeute such deed or deeds for coverying the said premises to my purchaser or purcharsers thereof and also to give effectual receipts and discharges for the purchase moneys of the said premises as my Attorney shall think fit and whatever my said attorney shall lawfully do in the premises I hereby agree to ratify and confirm and I declare that this power shall be irrevocable for twelve calendar months computed from the date hereof to witness whereof I have here unto set my hand and seal this Twenty Second Day of March, One Thousand Nine Hundred.

Signed and sealed and delivered by the above named Mohamed Ali in the presence of

To all to whom these presents shall come or may concern I George Isaac Bridges of the City of London Notary Public duly admitted and sworn Do hereby certify and attest that the power of attorney hereunto annexed was signed and sealed and in due form of law delivered on the day of the date hereof by Mohamed Ali the ....
constituent ....
....
therein named and described before me the said Notary and in the presence of George Harries and Herbert Arthur Marshall subscribing witnesses thereto. To the due execution of the said power of Attorney by the said Mohamed Ali ....
an act being requested I have granted the present to serve and avail as occasion shall or may require in faith and testing where of I have here unto set my hand and affixed my seal of office. Dated in London this hereby second day of March ....
On Thousnad Nine Hundred ....

Proof (Five) ABB duty and annal right £ paid certified that this instrument is duly stamped.
A. B. Bruco
Collector
London 4th March 1900

UNIVERSITY OF OXFORD

REGISTRAR
GEOFFREY CASTON

HEAD REGISTRY CLER
P W MOSS

UNIVERSITY OFFICES
WELLINGTON SQCARE
OXFORD
OX1 2JD

OXFORD (0865) 56747
Ext 283

Please address any reply to the Head Registry Clerk quoting Ref CEN/S

12 July 1977

Dear Sir,

Your letter of 31 June to the Colleges Admissions Office has been passed to me.

Mr. Mohamed Ali matriculated as a member of the University through Lincoln College on 6 November 1899. He qualified for a B.A. degre with Second Class Honours in Modern History in 1902 and the B.A. was conferred on him on 30 October 1913. Degrees were, and still are, only conferred on qualified persons at their request, hence the long delay between qualifying for the degree and the conferment in Mr. Ali's case.

Although Mr. Ali could have had his M.A. conferred at any time after his B.A. he did not do so and so does not hold the M.A.

Yours faithfully,

P.W. Moss

Mr. L.A. Siddiqui,
Bazarja Mullazarif,
Rampur, U.P.,
INDIA.

مولانا محمد علی آکسفورڈ کے لنکن کالج میں طالب علم تھے یونیورسٹی کے ریکارڈ کی بنیاد پر آیا ایک خط۔

الجواهر

في تفسير القرآن الكريم

المشتمل على عجائب بدائع المكونات وغرائب الآيات

تأليف

الأستاذ الحكيم الشيخ طنطاوي جوهري
المدرس بالجامعة المصرية ومدرسة دار العلوم سابقا
[illegible]

الجزء العشرون

طبع بمطبعة
مصطفى البابي الحلبي وأولاده بمصر

ملتزم طبعه محمد أمين عمران

رمضان سنة ١٣٤٩ هـ

الفصل السادس

فى ذكرى زعيم اسلامى فى أيامنا هذه

وهو دفن عميد الاسلام محمد على فى فلسطين وهذا حادث يعز نظيره فى التاريخ

٢٠٠ ألف يشيعون الجنازة و١٠٠ ألف يشهدون الصلاة

حفلة التأبين فى المسجد الأقصى

جاء فى جريدة الاهرام يوم السبت ٢٤ يناير سنة ١٩٣١ م ما نصه

خرجت البلاد الفلسطينية الواقعة على خط السكة الحديدية من القنطرة الى القدس لتحية رفات الفقيد الكبير مولانا محمد على وتعزية شقيقه مولانا شوكت على وعائلة مولاى زاهد على وحرم الفقيد لكن وكانت كل بلدة تقابل القطار بالتهليل والتكبير قبل انشقاق الفجر بساعات رغم شدة البرد . وكان مولانا شوكت على يشكر لهم تكبدهم هذه المشاق ويحيى عواطفهم النبيلة . وفى منتصف الساعة السابعة صباحا وصل القطار الى اللد التى كانت محطتها غاصة بالجماهير من سائر الأنحاء . واصطف طلبة وطالبات المدارس ورجال الجمعيات بأعلامهم وشاراتهم وكلهم مكبرون مهللون ، وكذلك فى الرملة وفى سائر المحطات حتى وصل القطار الى القدس التى احتشد فى محطتها ألوف من المستقبلين بينهم قناصل الدول الاوروبية ورؤساء الدين المسيحى ، وبالرغم من شدة الزحام ابتدأ الموكب سيره فى الساعة العاشرة صباحا ووصل الى المسجد الاقصى فى منتصف الساعة الأولى بعد الظهر حيث أدى هؤلاء جميعا فريضة الجمعة فى حرم المسجد الأقصى الذى غص بالمصلين وبرغم اتساع جوانبه الفسيحة ضاق بهم ولم يتمكن الكثيرون من أداء الفريضة داخل الساحة العظمى فأدوها فى الشوارع المجاورة للحرم ، وبعد انتهاء الصلاة وقفت الالوف لشهود حفلة التأبين التى لم يمكن اقامتها فى الحرم وضاقت بها ساحته الرحبة ، وصعد رجال الوفود الاسلامية والمؤبنون على المنبر الأثرى المصنوع فى عهد المرحوم السلطان قايتباى سلطان مصر مدة حكمه فى فلسطين وسوريا ، وابتدأ سماحة السيد محمد أمين الحسينى مفتى القدس بافتتاح حفلة التأبين بكلمة قيمة [illegible] أعرب فيها عن عظم الخسارة التى أصابت الشرق وعلى الخصوص الهند وفلسطين بهذه النكبة الفادحة التى انتزعت بطلا نادرا من أبطال الاسلام ، وقام بعده الاستاذ الكبير السيد عبد العزيز الثعالبى نائبا عن شمال افريقيا ، وعلى الخصوص عن وطنه تونس . وهو أقدم الحاضرين عهدا بصداقة الفقيد ، وأخذ يتحدث فى بلاغته ندوى السيل . وأخيرا

تك

يكد قلبكم ويواصل رثاءه فكان يقبل الجمهور من الحسرة المطلقة وأثر الكآبة الصادقة الى الأمل والرجاء بأن تكون هذه الفاجعة مبدأ عهد جديد للمسلمين يقتدون فيه بالراحل الكريم في حياته الحافلة بالجهود والتضحيات العظيمة

وقام خطباء مصريون وغيرهم ، ثم ابتدأت حفلة الدفن ، فسارت الالوف تلو الالوف الى القبر الذى أعد للفقيد فى حلف آل الخطيب الكرام بالمسجد الأقصى ؛ وجيء بالنعش وقد غطى بغطاء من القماش المنسوج فى الهند أعلاه هود بورسعيد وفوقه غطاء من الحرير الأحمر الموشى بالذهب ، وقد حشيت عليه نصوص آيات الكتاب الكريم صنعه سيدات القدس الشريف ، وفوقهما قطعة أثرية من الكسوة الشريفة النبوية أهداها سمو الأمير محمد على لتوضع فوق نعش الفقيد (انظر شكل ٨ وشكل ٩ فى الصفحات التالية)

وقد صلى عليه داخل حجرة الدفن فضيلة شيخ الهنود فى القدس ومولانا شوكت على وعلماء الهند على جثمان الفقيد الكريم وفضيلة الاستاذ التفتازانى ، ثم ذرى التراب بين بكاء الباكين ودعاء الداعين

وبالجملة فقد شهدت فلسطين مشهداً فى جنازته لم يشهده من قبل المعاصرون كثرة واجلالا وعناية ، وكان مولانا شوكت على يجيب على تعزيات الوفود الاسلامية العديدة بعبارات بليغة بالانجليزية تترجم الى العربية ، وقد قال أخيراً لأهل فلسطين « لقد استودعنا كم أثمن ما نملك ، وذلك دليل قوى على حبنا لكم ، واخلاصنا فى قضيتكم ، واهتمامنا بأمركم ، نحن معاشر الهنود المسلمين المدينين للعرب كافة باسلامهم ومدنيتهم » وكانت كلماته تقابل بما هى أهل له من الأثر البالغ فى النفوس

بعد يوم محمد على فى فلسطين

قال مراسل الاهرام فى يوم الأربعاء ٢٨ يناير سنة ١٩٣١ ما يأتى : « انقضى يوم مولانا محمد على ولكن أحاديث الناس عن هذا اليوم لا تنتهى قبل وقت طويل ، ولم تزل الألسنة تلهج بعظمة هذا اليوم وملاقاة جثمان الفقيد من الاجلال فى الاستقبال والدفن . وقد هالنى ما رأيت من كثرة الناس المتوافدين لزيارة الضريح وقراءة الفاتحة والترحم على الضيف الثاوى فى هذا المكان ، ورأيت كثيراً من النساء المدنيات فضلا عن السيدات والعقائل من أهل المدن يزرن محمد على راقداً فى ضريحه . وبينما أنا خارج من هذا الجامع اذا جماعة قادمون صوب الباب ، فبادرنى أحدهم سائلا . هل هذا قبر مولانا محمد على ؟ ثم دخلوا بكل لهفة ، وكذلك تتردد الوفود الفلسطينية على مولانا شوكت على لتقديم عزائها له ، فيجيب بأنه لن ينسى هذه الحفاوة الكبرى ، وأن ما شاهده من مشاطرة أهل هذه البلاد له فى هذا الخطب العظيم يدل على أن الشعور بالوحدة الشرقية أشد مما كان يتصور ، وقد قال لأحد الوفود : « إن هذا اليوم يوم دفن أخى محمد على فى بيت المقدس هو بالحقيقة فاتحة عهد جديد بين فلسطين والهند

ويتردد على مولانا شوكت على مكاتبو الصحف الأجنبية ويطلبون مقابلته ، ولكن الوقت الى الآن لم يتسع له هذا ، وقد علمت أن المستر مارتن مكاتب الديلى تلغراف قابل مولانا شوكت وأخذ منه حديثاً أعرب فيه مولانا شوكت عن الوقع الذى حصل فى نفسه من ليلة ٢٣ يناير الحالى الى ساعة المقابلة

وقد علمت أن مولانا شوكت على قد أبرق الى جمعية الخلافة فى بمباى برقية مسهبة وصف فيها الأدوار التى مضت فى نقل الفقيد من بورسعيد الى القدس الشريف ودفنه بجوار المسجد الأقصى . وقد جاء فى هذه البرقية العبارات التالية « وضع النعش تجاه الصخرة الى جهة الجنوب ، وفى الساعة السابعة حتى الرابعة بعد الظهر كان عظماء المؤتمرين يتعاقبون فى تأبين محمد على ، وبعد أن فرغوا وقفت وطلبت منهم باسم الاسلام وحرمة الفقيد أن يقطعوا العهد على نفوسهم أن يكونوا من هذا اليوم عاملين لنصرة الاسلام فى العمل الذى بدأ فيه محمد على وذهب عليه بكل ما وسعه من تجديد الحياة الاسلامية الشرقية »

ماخذ

اوراقِ گم گشتہ رئیس احمد جعفری : محمد علی اکیڈمی' لاہور۔

آخری مشورہ مولانا محمد علی

تذکرۂ کاملانِ رام پور حافظ احمد علی شوق' ۱۹۲۹ء ہمدرد پریس' دھلی۔

تحریکِ آزادی کے چند اہم باب' ڈاکٹر عابد رضا خاں بیدار' رام پور۔

تاریخِ امروہہ محمود الہاشمی' ۱۹۳۰ء۔

تقاریر مولانا محمد علی۔ صدیق بک ڈپو' (۹ر جنوری ۱۹۲۱ء کو تقریر کی) ناقص ایڈیشن۔

چند اہم خطوط انجمن اعانت نظر بندان' دوسرا ایڈیشن: ۱۹۱۸ء۔ دھلی پرنٹنگ ورکس۔

خطوطِ محمد علی۔ محمد سرور' مکتبۂ جامعہ' دھلی اکتوبر ۱۹۴۰ء

خطباتِ آزاد	ساہتیہ اکادمی	۱۹۸۵ء
روزنامہ خلافت۔	بمبئی	۶ر مئی ۱۹۳۲ء
روزنامہ خلافت'	بمبئی	۲۹ر اپریل ۱۹۳۲ء
رام پور اسٹیٹ گزٹ	رام پور	۲ر جنوری ۱۹۰۲ء
روزنامہ ہمدرد	دھلی	۲۳ر اپریل ۱۹۱۳ء
روزنامہ ہمدرد	دھلی سلسلہ خاص'	۶ر اپریل ۱۹۱۳ء
روزنامہ ہمدرد	دھلی سلسلہ خاص'	۱۸ر اپریل ۱۹۱۳ء

روزنامہ ہمدرد : دہلی سلسلہ خاص ۸ر اپریل ۱۹۱۳ء

" " " " ۷ر مئی ۱۹۱۳ء

" " " " ۱۷ر جون ۱۹۲۶ء

" " " " ۱۴ر جنوری ۱۹۲۷ء

" " " " ۲۷ر اپریل ۱۹۲۸ء

" " " " یکم دسمبر ۱۹۲۶ء

" " " " ۱۲ر اپریل ۱۹۲۹ء

" " " " ۱۳ر اپریل ۱۹۲۶ء

عظمتِ رفتہ ۔ تعلیمی مرکز کراچی ۱۹۶۱ء

سیرت محمد علی ۔ خورشید علی مہر ۱۹۳۱ء حامد حسین اینڈ سنز کوچہ چیلان

سیرت محمد علی رئیس احمد جعفری مکتبۂ جامعہ دہلی۔

ماہنامہ جامعہ، دہلی مولانا محمد علی نمبر اپریل ۱۹۷۹ء

ماہنامہ جامعہ ۱۹۸۰ء

مکتوباتِ رئیس الاحرار ابو سلمان شاہجہاں پوری (مرتبہ) ماڈرن پبلشرز کراچی دسمبر ۱۹۷۸ء۔

مسٹر محمد علی کی سوانح عمری مترجم مرزا ابوالحسن لکھنوی ۱۹۱۸ء

میری کہانی جواہر لال نہرو حصہ اوّل مکتبۂ جامعہ دہلی

مضامین محمد علی : محمد سرور مکتبہ جامعہ ۱۹۳۸ء

مولانا محمد علی کی یاد میں ۔ صباح الدین عبدالرحمٰن : ۱۹۷۷ء

محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق ۔ عبدالماجد دریابادی ، ۱۹۵۴ء معارف پریس اعظم گڑھ۔

مقدمہ کراچی : عبدالقادر بیگ ، حصہ اوّل۔

میرے زمانے کے دلّی ۔ ملّا واحدی

محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز ۔ مترجم محمد سرور

تحفۃ التواریخ (ف) مولانا سید آل حسن عمدۃ المطابع امروہہ ۱۸۸۰ء

علم و آگہی نیشنل کالج کراچی۔ مرتبہ ابو سلمان شاہجہاں پوری ۱۹۵۶ء

1 Life and Times Afzal Iqbal Institute of Islamic Culture Club Road, Lahore 1974
2 Selection writing and speaches of Moulana Mohd Ali
3 The Comrade 1911
" 1914
" 1924

ماخذ و حواشی

گنج ہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی صفحہ ۹ 'اردو اکیڈمی' لاہور ۱۹۶۴ء بار دوئم
۲۔ مضامین محمد علی	محمد سرور 'صفحہ' ۱۶۱ 'مکتبہ جامعہ
۳۔ ہمدرد (روزنامہ)	ایڈیٹر مولانا محمد علی ۱۹۲۶ء
۴۔ ہمدرد	۱۲ر اپریل ۱۹۲۹ء

۲۳ر فروری ۱۹۱۳ء سے روزانہ ہمدرد دہلی سے جاری ہوا۔ یہ ایک ورق پر شائع ہوتا تھا۔ اس لئے کہ بیروت سے مکمل ٹائپ کے آنے میں دیر تھی۔ مولانا ہمدرد کو آٹھ صفحات پر شائع کرنا ، شائع کرنا چاہتے تھے' ٹائپ کی کمی کی وجہ سے چونکہ یہ ایک ورق پر شائع ہونا شروع ہوا اس لئے اس پر جلد نمبر کی جگہ 'سلسلۂ خاص' لکھا گیا۔ ۱۳ر مئی ۱۹۱۳ء سے روزانہ ہمدرد آٹھ صفحات پر شائع ہوا۔ اور اس پر جلد نمبر ا۔ شمارہ نمبر ا۔ لکھا گیا۔ اس لئے کہ وہ مکمل اخبار آٹھ صفحات کا تھا جن صفحات پر محمد علی ہمدرد کو شائع کرنا چاہتے تھے۔ ۱۰ر اگست ۱۹۱۵ء کے بعد ہمدرد کی ضمانت ضبط ہو گئی اور ہمدرد بند ہو گیا۔ اس کے بعد نومبر ۱۹۲۴ء میں ہمدرد دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا۔ ۲۵ر مئی ۱۹۲۸ء کو محمد علی عازمِ سفر یورپ ہوئے ۲۱ر مئی ۱۹۲۴ء سے ایڈیٹر کی حیثیت سے اب سید محمد جعفری کا نام بانیٔ اخبار کی حیثیت سے مولانا محمد کا نام شائع ہونا شروع ہوا۔ انتظامی امور مولانا عبدالماجد صاحب اور ظفر الملک صاحب کے سپرد ہوئے۔

۵۔ ہمدرد ۱۹ جنوری ۱۹۲۶ء

۶۔ کراچی کا تاریخی مقدمہ عبدالقادر بیگ: حصہ اول، ص ۱۳۳، پہلا ایڈیشن اجمیر

۷۔ ایضاً

۸۔ میری کہانی جواہر لال نہرو حصہ اول، ص ۲۰۴، مکتبہ جامعہ، پہلا ایڈیشن

۹۔ مولانا محمد علی کا ایک شعر ہے۔

دے نقدِ جاں تو بادۂ کوثر ابھی لے
ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ مے ادھار دے

۱۰۔ محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق حصہ اوّل عبدالماجد دریابادی، ص ۲۲۶ مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء

توقیتِ مولانا محمد علی

۱۸۷۸ء	۱۰ر دسمبر	مولد (پیدائش) محلہ لنگر خانہ، رام پور۔
۱۸۸۰ء	۲۴ر اگست	عبد العلی خاں کی وفات، رام پور۔
۱۸۸۲ء	۱۰ر اپریل	محمد علی کی رسمِ بسم اللہ ادا کی گئی۔
۱۸۸۲ء		گھر پر ایک عالم سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔
۱۸۸۲ء تا	۱۸۸۷ء	گلستاں، بوستاں، رقعاتِ عالم گیری، سکندر نامہ از نظامی شاہ نامہ فردوسی، ظہوری کی سہ نثر وغیرہ۔
۱۸۸۷ء		انگریزی زبان گھر پر برادر بزرگ سے پڑھنا شروع کی۔ اور عبد الحق ہیڈ ماسٹر مدرسۂ انگریزی سے بھی گھر پر سیکھی۔
۱۸۸۸ء		رامپور کے ایک انگریزی مدرسہ جو عبد اللہ خاں کے مکان میں۔ کھولا گیا تھا، داخلہ لیا۔
۱۸۸۸ء		بغرض انگریزی تعلیم بریلی چلے گئے۔ اور پرانے فورتھ کلاس، ساتواں درجہ میں داخلہ لیا۔
۱۸۹۰ء		بغرض تعلیم علی گڑھ گئے، اسکول میں داخلہ، کچی بارک کے کمرہ نمبر ۲۷، نمبر ۳۷ میں اپنے بھائی کے ساتھ رہائش۔
۱۸۹۲ء:		مڈل کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔
۱۸۹۴ء		انٹرنس پاس کیا۔
۱۸۹۸ء:		علی گڑھ ایم۔ اے۔ او کالج کے طالب علم کی حیثیت سے الہ آباد یونیورسٹی کا بی۔ اے۔ پاس کیا۔ یونیورسٹی میں اوّل آئے۔

۱۸۹۸ء	۸؍جون	پی اینڈ او کمپنی کے بحری جہاز سے آکسفورڈ میں داخلہ کے لئے روانگی۔
۱۹۲۱ء	۸تا۱۰؍جولائی	محمد علی کی صدارت میں عیدگاہ کراچی کے میدان میں خلافت کا جلسہ انگریز کی نوکری کو حرام قرار دیا گیا۔
	۱۴؍ستمبر،	والنٹیئر پر گرفتاری
	۲۶؍ستمبر،	خالق دینا حال کراچی میں مقدمہ کی سماعت۔
	۲۷؍اگست،	بیجاپور جیل سے جھانسی منتقلی۔
	۲۹؍اگست،	بیجاپور جیل سے رہائی
۱۹۲۴ء	۳؍مارچ	ترکی خلیفہ کو معزول کر دیا گیا۔
	۱۱؍مارچ	مولانا محمد علی کی بیٹی کی وفات۔
۱۹۲۴ء	۹؍نومبر،	ہمدرد کا دوبارہ اجرا۔
	۳۱؍اکتوبر،	کامریڈ کا دوبارہ اجرا۔
۱۹۲۶ء	۲۲؍جنوری	کامریڈ ہمیشہ کے لئے بند۔
	۲۷؍اپریل	محمد علی نے ہمدرد کو بند کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔
۱۹۲۸ء	۱۱؍مئی	محمد علی نے خود کو ہمدرد سے بحیثیت مدیر الگ کر لیا۔
	۲۰؍مئی	'الوداع' اداریہ شائع ہوا۔
	۲۵؍مئی	یورپ کا سفر بغرض علاج
	۱۱؍اپریل	ہمدرد ہمیشہ کے لئے بند۔
۱۹۳۰ء	۱۹؍نومبر	گول میز کانفرنس میں تقریر۔
۱۹۳۱ء	۴؍جنوری	ہائیڈ ہوٹل پارک لندن میں انتقال۔
	۲۳؍جنوری	بیت المقدس میں دفن۔
۱۸۹۹ء		بی۔اے۔ کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی نے دی

	۶ر نومبر	لنکن کالج آکسفورڈ میں داخلہ
۱۹۰۱ء	دسمبر	لندن سے ہندوستان واپسی
۱۹۰۲ء		آکسفورڈ یونیورسٹی لندن سے بی۔اے آنرز کیا۔
۱۹۰۲ء	۱۴ر جنوری	محکمۂ تعلیم میں افسر تعلیمات ہوئے اور اعلیٰ جماعتوں کو پڑھانے کا کام بھی سپرد ہوا۔
	۵ر فروری	امجدی بیگم کے ساتھ عقدِ نکاح اور رخصتی کی رسم
	۱۵ر مئی	محکمۂ تعلیم ریاست رام پور یو۔پی۔ سے تین ماہ کی رخصت لی۔
	۱۹ر مئی	دفعہ (ج) ریاست رام پور پانچ روپیہ یومیہ بھتہ منظور ہوا۔
	۲۸ر جولائی	امتحان کے بعد لندن سے واپسی
۱۹۰۳ء		رام پور کی ملازمت سے استعفیٰ۔ وکالت کا امتحان دیا۔ بڑودہ کی سول سروس میں تقرر۔
۱۹۰۴ء		احمد آباد میں اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے محمڈن یونیورسٹی کی تجویز رکھی۔
۱۹۰۵ء		تقسیم بنگال
۱۹۰۶ء		میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا پہلا اجلاس
۱۹۰۶ء		مسلم لیگ کا دستور اساسی بنایا۔
۱۹۰۶ء		گرین بک، مسلم لیگ سے متعلق پمفلٹ کی اشاعت۔
۱۹۰۷ء		ٹائمز آف انڈیا بمبئی میں مضمون کی اشاعت Thoughts On Present Discontant
۱۹۰۷ء		علی گڑھ میں طلبا نے پولیس کے خلاف اسٹرائک کردی۔ اس درمیان سرسید کی برسی بھی آگئی مولانا محمد علی نے سرسید احمد خاں ایک نظم کہی۔

سنہ	تاریخ	واقعہ
۱۹۰۹ء		بڑودہ کی ملازمت سے استعفیٰ۔
۱۹۱۰ء		منٹو مارلے اصلاحات
۱۹۱۱ء	۱۴ر جنوری	کامریڈ کا کلکتہ سے اجرا۔
	۹ر ستمبر	کامریڈ کی جلد تبدیل کر کے نمبر۔۲۔ لکھا گیا
۱۹۱۲ء		جنگِ بلقان' ترکوں کو ایک مورچہ پر ہار اور مولانا محمد علی کا خودکشی کا ارادہ۔
۱۹۱۲ء	۱۴ر ستمبر	کلکتہ سے کامریڈ کا آخری شمارہ شائع ہوا۔
	۱۹ر ستمبر	پریس اور دفتر دہلی میں منتقل ہو گیا
	۱۲ر اکتوبر	دہلی سے کامریڈ کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔
		قبلہ عبدالباری فرنگی محلی سے ملاقات
	۱۹ر ستمبر	کلکتہ سے پریس دہلی لے آئے۔
	۱۵ر دسمبر	طبی وفد کی روانگی۔
۱۹۱۳ء	۲۳ر فروری	ہمدرد کے سلسلہ خاص کا دہلی سے اجرا' ایک ورق پر جسے غلط فہمی کی بنیاد پر نقیب ہمدرد کہا گیا۔
	۱۳ر مئی	ہمدرد کا سلسلۂ خاص چار ۴، صفحات پر شائع ہونا شروع ہوا۔
	۳۱ر مئی	ہمدرد کے سلسلۂ خاص کا آخری شمارہ شائع ہوا۔
	یکم جون	ہمدرد کے پہلے شمارہ کی اشاعت ۸ صفحات پر اس پر جلد نمبر۔۱ شمارہ نمبر۔۱۔ شائع ہوا
۱۹۱۴ء	۶ر ستمبر	مسجد کانپور کے مسئلہ میں بمبئی سے انگلستان روانگی۔
	۲۶ر ستمبر	مولانا کا مشہور مقالہ 'چوائس آف دی ٹرکس' کی اشاعت
	۱۵ر اکتوبر	لارڈ ہارڈنگ نے محمد علی کے اخبار کے خلاف رپورٹ بھیجی۔
	۳ر نومبر	کامریڈ ضمانت کی ضبطی کی وجہ سے بند ہو گیا۔ دس سال تک بند رہا

[illegible]	۱۶؍اپریل	اخبار سے چھٹی لے کر آرام کی غرض سے رام پور آ گئے۔
	۱۷؍اپریل	تحصیل سوار میں شکار کھیلنے گئے۔
	۱۸؍اپریل	شب میں شکار سے رام پور واپس آ گئے۔
	۲۱؍اپریل	نواب حامد علی خاں، والئی رام پور نے محمد علی کو طلب کر کے ۱۱ بجے شام قلعہ رام پور میں نظر بند کر دیا۔
	۲۴؍اپریل	ڈاکٹر احمد خاں انصاری اور حکیم اجمل خاں کی رپورٹ پر بغرض علاج گھر جانے کی اجازت ملی۔
	۳؍مئی	مولانا شوکت علی نے نواب رام پور کو خط لکھا کہ بغرض علاج محمد علی کو دہلی جانے کی اجازت دے دیں
	۱۵؍مئی	دہلی کے مجسٹریٹ کے حکم نامہ کے مطابق علی برادران مہرولی میں نظر بند کر دیئے گئے۔
	۲۳؍جون	نظر بندان کی مہرولی سے لینڈاون منتقلی
	جولائی	مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بیعت
	۲۰؍نومبر	لینڈاون سے چھندواڑہ بھیج دیا گیا۔
۱۹۱۷ء		ڈپٹی عبدالمجید نے حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے، معافی نامہ پر علی برادران سے دستخط کرانا چاہے۔ لیکن انہوں نے منع کر دیا۔
		مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے لیکن نظر بندی کی وجہ سے کرسی صدارت پر ان کی تصویر رکھی گئی۔
۱۹۱۸ء	۲۲؍دسمبر	ہمشیرہ کی علالت کی وجہ سے ایک ہفتہ کے لئے پیرول پر چھندواڑہ سے رام پور کے لئے روانگی
	۲۵؍دسمبر	جبلپور ہو کر رام پور آمد

۱۹۱۹ء	۲؍جنوری	دو ہفتے کی پیرول میں توسیع
	۷؍جون	نصف شب میں گرفتار کر کے نظر بندی کو بیتول جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔
	۸؍دسمبر	بیتول جیل سے رہائی۔
	۲۹؍دسمبر	امرتسر کے اجلاس میں شرکت کانگریس کے ممبر بنائے گئے
۱۹۲۰ء		رام پور سے جلاوطن کر دیے گئے
	یکم فروری	خلافت وفد کی لندن روانگی
	۲۳؍جون	خلافت کمیٹی نے آزادی اور حکومت کی غلامی کے خلاف لائحہ عمل تیار کیا۔
	۱۳؍اکتوبر	خلافت وفد کی واپسی۔
	۲۲؍نومبر	کمیٹی کی مدد سے جامعہ کا نصاب مرتب کیا۔

تصحیح نامہ

سطر/صفحہ	غلط	صحیح
پیش لفظ		
۲/۱	بیشک	مڈل اسکول
۲/۷	-	۱ے
۲/۱۱	-	۲ے
۲/۱۸	-	۳ے
۴/۵	-	۴ے
۴/۱۶	-	۵ے
۹/۲	-	۶ے
۹/۷	-	۷ے
۷/۲۲	-	۸ے
۸/۹	-	۹ے
۸/۱۰	-	۱۰ے
۲/۱	کتاب مضامین مولانا محمد علی	مولانا محمد علی اور جنگ آزادی
۲/۲	انھوں نے	بی اماں نے
۲/۵	چچا	چچازاد بھائی
۳۹/۰	احمد شوق	احمد شوقی
۹۹/۹	(۲۱)	(نوٹ)
۹۹/۹	(۳۲)	(۲۱)
۹۹/۲۴	(۳۳)	(۲۲)
۹۹/۲۵	(۳۴)	(۲۳)
۱۰۰/۲	(۳۵)	(۲۴)
۱۰۰/۷	(۳۶)	(۲۵)
۱۰۰/۱۱	(۳۸)	(۲۶)
۱۰۰/۱۲	(۳۹)	(۲۷)
۱۰۰/۱۳	(۳۰)	(۲۸)
۱۰۰/۱۳	(۳۱)	(۲۹)
۱۰۰/۱۴	(۳۲)	(۳۰)
۱۰۰/۱۸	(۳۳)	(۳۱)
۱۰۰/۱۹	(۳۴)	(۳۲)

ماخذ۔ خلافت وفد

سطر/صفحہ	غلط	صحیح
۱۰۱/۱	سعد علی	سلطو علی
۱۰۱/۸	(۳۷)	(۳۵)
۱۰۱/۹	(۳۹)	(۳۶)
۱۰۱/۹	(۳۹)	(۳۷)
۱۰۱/۱۰	(۴۰)	(۳۸)
۱۰۱/۱۱	(۴۱)	(۳۹)
۱۰۱/۱۱	(۴۲)	(۴۰)
۱۰۱/۱۱	(۴۳)	(۴۱)
۱۰۱/۱۳	(۵۱)	(۴۲)
۱۰۹/۱۲	خفیف	نحیف
۱۱۲/۱	عز	عزم
۱۲۸/۳	شائع ہوتے	×
۲۶۲/۲۰	قدم	قوم
۱۷۶/۸	گاندھی	مہاتما گاندھی
۱۷۹/		سے ضمیمہ شروع

(نوٹ)

صفحہ ۲۲۲ کے ماخذ و حواشی پیش لفظ سے متعلق ہیں۔

صفحہ ۲۰۰ کے خط کا عکس ڈاکٹر عابد رضا خاں بیدار نے عنایت کیا تھا

کلام جوہر بخط جوہر کی غزلیات کراچی میوزیم پاکستان میں موجود ہیں۔

My Life A Fragment : Mohammed Ali Pg. 3

(3) सुर्ख दाढ़ी वाला अध्यापक।

(4) गणित

(5) इतिहास

(6) भूगोल

(7) रसायन शास्त्र-Chemistry

(8) बारे में या इस विषय मे

(9) पाठ्यक्रम

(10) My Life A Fragment edited by Afzal Iqbal Pg.4

(11) रामपुर स्टेट गजट 22 सितम्बर, 1890, पृ० 5

(12) Rampur State Gazzatte 20th Jan, 1902 Vol. 14

(14) 17 अक्तूबर 1926 हमदर्द दैनिक देहली मोहम्मद अली

(15) तदैव।

(16) Resolution : "ये जलसा इस बात का साफ ऐलान करता है कि हर मुसलमान पर अग्रेजी फौज में इस समय नौकर रहना, भर्ती होना, दूसरो का भरती कराना हराम है।" (मुकदमा–ए–कराची–सपादक अब्दुल क़ादिर बेग, पृ० 51)

(17) मुक़दमा–ए–कराची अब्दुल कादिर बेग पृ० 379

(18) तदैव पृ० 117

(डा० किश्वर सुल्ताना)

यह कि हम कांग्रेस सम्मेलन में दिसम्बर में भारत की स्वतन्त्रता और उसके गणराज्य होने का ऐलान करेंगें।"(१)

सरकार इस बात को सहन न कर सकी और उन्हें बन्दी बना दिया गया।

अंग्रेजों की ओर से बार–बार यह शोशा छोड़ा जाता था कि आज़ादी के बाद हिन्दु और मुसलमान किस तरह रहेंगे ?

मौलाना ने मृत्यु से पहले 1 जनवरी 1931 को एक पत्र लिखवा था और उसमें कहा कि चुनाव में खडे होने वाले को उस समय तक जीता हुआ न समझा जाय जब तक उसके वोटों में 10% वोट दूसरे समुदाय के न हों। इस प्रकार मुसलमान हिन्दु से और हिन्दु मुसलमान से अच्छा व्यवहार करने पर मजबूर होगा। मोहम्मद अली की बहुत सी महत्त्वाकाक्षाओं की तरह यह महत्त्वाकांक्षा भी पूरी न हो सकी। वह आजादी लेने लदन गये थे। और वहीं पर 4 जनवरी 1931 को उनका देहान्त हो गया। 21 जनवरी 1931 को बैतुल मुक़द्दस (फिलिस्तीन) में दफ़न कर दिये गये।

(डा० किश्वर सुल्ताना)

(1) Speech Round Table Conference Dec. 1930 London by Maulana Mohammed Ali.

(2) सीरत–ए मोहम्मद अली खुर्शीद अली मेहर, पृ० 13

मजामीन–ए–मोहम्मद अली मकतबा–ए–जामिया पृं० 14

Mohammed Ali Jauher : ALLAH BAKSH YOSUF Pg. 31.

मौलाना मोहम्मद अली ने अपनी आत्मकथा अपने दैनिक अखबार हमदर्द, देहली में लिखी है। उसमें अपनी जन्मतिथि के बारे में लिखा है

"जिस खालिक ने मुझे 15 जिल हज्जू 1295 हिजरी को पैदा फरमाया था उसका शुक्रिया अदा करता हूँ।"–15 जिल हज्ज 1295 तक़वीम से 10 दिसम्बर 1878 होती है। हमदर्द 17 जून 1927

किचलू और सत्यपाल के प्रयत्नों से हिन्दु–मुसलमान एकता स्थापित हो चुकी थी। रामनवमी के अवसर पर दोनों ने मिलकर जुलूस निकाला था। सत्यपाल और डा० किचलू को गिरफ्तार करके अज्ञात जगह भेजा जा चुका था। अमृतसर में ही एक ही समय में जमियत–उल–उलेमा, कांगेस और दूसरी पार्टियों का सम्मेलन हुआ। 'खिलाफत' का Resolution पहली बार यहीं पास हुआ। अली ब्रादर्स कांग्रेस के पहली बार सदस्य यहीं बनाये गये थे। 13 अप्रैल 1919 को जलयान वाला बाग में एक जलसे का ऐलान हुआ। लैफ्टिनैंट गवर्नर सर माइकल जनरल डायर ने भीड़ पर गोलियों की बौछार करा दी। पजाब के खून में जोश की लहरें और तीव्र हो गई।

उसी जमाने में लदन में एक संधि टर्की और अरब के बारे में तय की जानी थी। कानफ्रेंस होने वाली थी। गाँधी जी, मोती लाल नेहरू, सरोजनी नायडू और मुसलमान नेताओं ने यह तय किया कि इस अवसर परएक शिष्ट मण्डल लंदन भेजा जाय। पहली फरवरी 1920 ई० को एक शिष्ट मण्डल रवाना हुआ। अध्यक्ष मौलाना मोहम्मद अली थे। सदस्य सय्यद सलमान नदवी और सय्यद हुसैन थे। मोहम्मद अली ने राइट ऑनरेबल फिशर से भेंट की और प्रधानमन्त्री लॉयड जॉर्ज से मिले और उन्होंने इनसे बड़ी जुर्रत से बातचीत की। मौलाना मोहम्मद अली खाली हाथ वापस आये। तुर्की के खलीफा (ख़लीफा–तुल–मुसलेमीन) की हैसियत को और भी कमजोर कर दिया गया। मुसलमानों में गम व गुस्सा और अग्रेजों के ख़िलाफ नफरत का ज्वालामुखी और भी फूट पड़ा। हर सड़क और हर घर में चरखा कात्ते हुए औरतें गाती रहतीं–

बोलीं अम्मा मोहम्मद अली की
जान बेटा ख़िलाफत पे दे दो
साथ है तुम्हारे शौकत अली भी
जान बेटा खिलाफत पे दे दो।

मौलाना मोहम्मद अली ने 1921 में भारत की स्वतन्त्रता का ऐलान कर दिया था। मुकदमा–ए–कराची में 28 सितम्बर 1921 को उन्होंने अदालत को बयान देते हुए यह इक़रार किया·

"हमने हुकूमत की दो बातों के बारे में आगाह किया। प्रथम यह कि हम कांग्रेस के साथ मिलकर Civil Disobedience करेंगे और दूसरा

ईदगाह के मैदान में खिलाफत का एक जलसा हुआ जिसमें मोहम्मद अली अध्यक्ष थे। उन्होंने एक Resolution पास किया जिसके द्वारा ब्रिटिश सरकार की नौकरी को हराम करार दिया गया।[16]

इस सभा में गुरु शकराचार्य भी सम्मिलित थे और उन्होंने भी भाषण दिया था। फिर क्या था गुरु शकराचार्य, मौलाना मोहम्मद अली और मौलाना शौकत अली को वाल्टियर स्टेशन पर जाते हुए गिरफ्तार कर लिया गया। कराची के खालिक दीना हाल में 26 सितम्बर 1921 को एक विशेष कोर्ट बना कर बी० सी० केनेडी की अदालत में मुकदमा चलाया गया। बाकी लोग छूट गये लेकिन अली–बंधुओं को दो साल कि जेल हो गयी। उनका एक शेर है–

"कह रहे हैं कराची के कैदी
हम तो जाते हैं दो दो बरस पे।"

इस मुकदमे में मजिस्ट्रेट ने जब गुरु शकराचार्य से यह जानना चाहा कि आपका 'खिलाफत आन्दोलन' से क्या संबध है तो गुरु ने उत्तर दिया था

"मैं उस अवसर पर अपने उत्तरदायित्व और धार्मिक कर्त्तव्य को अनुभव करते हुए शास्त्रों के अनुसार इस बयान को प्रमाणिक करार देता हूँ। प्राचीन शास्त्रों में हमको स्पष्ट बताया गया है कि हिन्दुओं के लिये काशी की भाति मक्का भी पवित्र स्थान है। इन पुस्तको में ससार के विनाश को चर्चा करते हुए बताया गया है कि जब ससार अधर्म और पाप से भर जायेगा और विनस्त होगा तो शाँति की जगह दो होगी, एक काशी दूसरा मक्का। उस समय श्री कृष्ण प्रकट होगे, उनका एक पैर मक्के में होगा और दूसरा काशी में। इसलिये जिस प्रकार काशी की सुरक्षा मेरा कर्त्तव्य है उसी प्रकार मक्के की भी।"[17]

इस प्रकार हिन्दू–मुसलमान एकता को देखकर ब्रिटिश सरकार के पैर उखड़ने लगे।

मौलाना मोहम्मद अली 1915 में नवाब रामपुर के हुक्म पर रामपुर में नजरबन्द कर दिये गये थे। उसके बाद वह देहली मे महरौली और लैसडाउन में नजरबन्द रहे बैतूल जेल में उन्हें रखा गया। 28 दिसम्बर को रिहा होकर वह सीधे अमृतसर पहुँचे। अमृतसर में डा० सैफुद्दीन

अत्याचार करने से रोके।" [114]

मौलाना मोहम्मद अली अपने समकालीन लोगों में पहले व्यक्ति हैं जिन्होंने देशप्रेम को धार्मिक कर्त्तव्य करार दिया—

"एक मुसलमान के लिये वतन की मोहब्बत उसका ईमान है" [115]

यह मोहम्मद अली का कमाल था कि उन्होंने एक ओर खानकाहों में बैठे, मदरसों में पढ़ाने वाले उलमा, मज़ारों के सज्जादा नशीनों का ध्यान बार–बार इस ओर कराया कि देश की आज़ादी आप का धार्मिक कर्त्तव्य है और वो सब धार्मिक कर्त्तव्य को पूरा करने के लिये खड़े हो गये। उन्होंने अंग्रेज़ शासन के विरोध में फ़तवे दिये। उस समय तुर्की का हाकिम मुसलमानों का ख़लीफ़ा भी कहलाता था और पूरा अरब, हिजाज, बलकान, चचेनिया, तराबलस और संसार के बहुत से इलाके तुर्की के ख़लीफ़ा के तहत थे। इस प्रकार ब्रिटिश सरकार से सीधी टक्कर लेने के लिये तुर्की एक बड़ी शक्ति था और संसार का मुसलमान खलीफ़ा के हुक्म पर जान दे सकता था। इसलिये यूरोप की शक्तियाँ खलीफ़ा की ताकत को ख़त्म कर देना चाहती थीं। मौलाना मोहम्मद अली का कहना था कि हीजाज़ और मुकद्दस मुकामात पर ग़ैर अल्लाह की हुकूमत नही हो सकती, मोहम्मद अली ने मुसलमानों के दिल व दिमाग़ में यह बिठा दिया कि ब्रिटिश सरकार 'इस्लाम दुश्मन' है जो भारत में भी हमारे ऊपर शासन कर रही है। मोहम्मद अली का कथन था कि मनुष्य भगवान् की दासता के लिये पैदा हुआ है। यह ग़ैर अल्लाह की हुकूमत है। इस मुद्दे को लेकर ब्रिटिश सरकार के विरुद्ध 'ख़िलाफ़त' आन्दोलन शुरू हुआ। ख़िलाफ़त बजाहिर तुर्की के हाकिम हीजाज की सुरक्षा के लिये थी परन्तु यह मोहम्मद अली का कमाल था कि उन्होंने इसका पूरा रुख अंग्रेज दुश्मनी को लेकर भारत की आज़ादी की तरफ मोड़ दिया।

जिस प्रकार आज तीसरी दुनिया के लोग बड़ी ताकतों से स्वयं को सुरक्षित करके एकजुट होकर उन्नति चाहते हैं, इसी प्रकार मोहम्मद अली ने खिलाफ़त के जरिये भारत की आज़ादी का संबंध उन देशों से मिला दिया था जो अंग्रेजों से स्वय को सुरक्षित रखना चाहते थे। उन्होंने गुरु शंकराचार्य को अपने साथ लिया और जगह–जगह सभाएँ करके भारतवासियों में देशप्रेम की अलख जगायी। 9 जुलाई सन् 1921 की बात है कि कराची (अविभाजित भारत) के

था—I am a Musalman first and a Musalman second and a Musalman last and nothing but a Musalman.

परन्तु उनका यह भी कहना था कि जहाँ तक भारत की आज़ादी का और उसकी प्रगति का संबंध है।

"I am an Indian first and Indian second and Indian last nothing but an Indian."

उन्होंने मुसलमानों को यह याद दिलाया कि इस्लाम अन्यायी और अत्याचारी शासन के विरुद्ध है। इसलिये प्रत्येक मुसलमान का धार्मिक कर्तव्य है कि वह ब्रिटिश सरकार को भारत से खदेड़ने का प्रयास करें।

सन् 1923 में वे कांग्रेस के अध्यक्ष चुने गये। उस समय प० जवाहरलाल नेहरू सचिव थे। जवाहर लाल नेहरू ने अपनी आत्मकथा 'मेरी कहानी' में लिखा है—

"मौलाना ने मेरी मर्ज़ी के खिलाफ़ मुझे मजबूर किया कि उनकी अध्यक्षता के समय मैं उनके सचिव का पद संभालूँ। ऐसी स्थिति में जबकि भविष्य का कोई कार्यक्रम मेरे मस्तिष्क में साफ़ तौर पर नहीं था। मैं कोई उत्तरदायित्व स्वीकार करना नहीं चाहता था, परन्तु मैं इन्कार नहीं कर सका।" [13]

परन्तु मौलाना मोहम्मद अली के मस्तिष्क में भारत की स्वतन्त्रता और उसके भविष्य के लिये ख़ाका मोजूद था और वो यह जानते थे कि भारत में हिन्दु और मुसलमान तथा अन्य धर्म के लोग जब तक एक मंच पर एकत्रित नहीं होंगे तब तक स्वतन्त्रता प्राप्ति कठिन होगी। इसलिये उन्होंने Nationalism के बारे में मुसलमानों को सम्बोधित करते हुए कहा—

"मिल्लियत (धर्म) क़ौमियत (Nationalism) को मना नहीं करती। इस्लाम यह नहीं कहता कि विभिन्न धर्मों का अस्तित्व Nationalism को पैदा न होने दे।"

उन्होंने कहा :

"मुसलमान सदा इसे अपना कर्त्तव्य समझेगा कि अगर कोई मुसलमान किसी अन्य धर्म के व्यक्ति पर अत्याचार करे तो केवल यही नहीं कि मुसलमान अत्याचार करने वाले का साथ न दे बल्कि उसे

है। इसके उपरांत आगे की शिक्षा प्राप्त करने के बरेली चले गये, उसके बाद 1890 में अलीगढ़ गये। वहाँ पर उनका प्रवेश सातवीं कक्षा में हुआ। अलीगढ़ से उन्होंने 1898 में बी० ए० किया और विश्वविद्यालय में प्रथम स्थान प्राप्त किया। उस समय डिग्री इलाहाबाद विश्वविद्यालय से मिलती थी। उसके बाद वे Oxford चले गये और वहां से बी० ए० ऑनर्स पास किया। रामपुर वापस आने पर 14 जनवरी, सन् 1902 में एजूकेशन आफीसर और अंग्रेजी स्कूल के हैडमास्टर बना दिये गये। [12] रामपुर से त्यागपत्र देकर महाराजा बड़ौदा के पास चले गये और बड़ौदा में उच्च अधिकारी के रूप में उनकी नियुक्ति हो गई। परन्तु नौकरी उन्हें रास नहीं आयी, क्योंकि उनकी महत्त्वाकांक्षा इससे कहीं ऊँची थी। वे अपने देश भारतवर्ष की सेवा करना चाहते थे। अपनी इसी प्यास को बुझाने के लिये उन्होंने पहले दो साल की छुट्टी ली और 14 जनवरी 1911 ई० से अंग्रेजी सप्ताहिक The Comrade कलकत्ते से निकला इस साप्ताहिक पत्र का उद्देश्य कितना महत् था इसका अनुमान मॉरिस की उन पक्तियो से लगाया जा सकता है जो कॉमरेड पत्र के शीर्ष पर आंकित रहती थीं–उनका अर्थ कुछ इस प्रकार था .

"सच्चाई के साथ खड़े हो जाओ और उस सच्चाई का एलान, बिना खौफ करो जो तुम्हारे पास है।"

मोहम्मद अली बेखौफ खडे हो गये और उन्होंने अग्रेजी शासन की मुखालिफत और आजादी की मॉग शुरू कर दी। उन्होंने दिल्ली से 23.2.1913 से एक दैनिक 'हमदर्द' नाम का निकालना शुरू किया। वे अपने अखबार 'कॉमरेड' को भी दिल्ली ले गये। मौलाना मोहम्मद अली के दैनिक 'हमदर्द' और अग्रेजी 'कामरेड' को जो बात अन्य दैनिक पत्रों से अलग करती है वह है उनका निर्भय वक्तव्य। उन्होंने ब्रिटिश अधिकारियों के नाम के पहले लम्बे–लम्बे टाइट्ल्स इत्यादि नहीं लगाये बल्कि सीधे–सीधे नामों के साथ समाचार प्रकाशित किये जो इस समय एक साहसिक कार्य था। अग्रेजी समाचार पत्र का उद्देश्य भारतवासियों के विचार और उनकी माग को ब्रिटिश सरकार तक पहुँचाना था। 'हमदर्द' का उद्देश्य विशेष रूप से भारतवासियों में चेतना और जागृति पैदा करना था। इसके साथ ही 'इस्लामी दुनिया' जो खलीफा के तहत आती थी उसकी खबरें जनता तक पहुँचाना था। मौलाना मोहम्मद अली स्वय को मुसलमान कहते हुए तनिक भी नहीं झिझकते थे। उनका कहना

मौलाना मोहम्मद अली : स्वतन्त्रता आन्दोलन

डा० किश्वर सुल्ताना

"मैं अपने देश उसी समय वापस जाऊँगा जब आज़ादी का परवाना मेरे हाथ में होगा या तो आपको मेरे देश को आजादी देनी होगी वर्ना कब्र के लिये दो गज जमीन।" (1)

इस प्रकार मौलाना मोहम्मद अली ने आजादी की मांग करते हुए अपनी जान दे दी।

मोहम्मद अली 10 (दस) दिसम्बर सन् 1878 ई को रामपुर में पैदा हुए। (2) उनकी प्रारभिक शिक्षा के बारे में अपनी आत्मकथा My Life A Fragment में लिखा है

"(मैने) एक सुर्खरेश[3] उस्ताद से जो रियाजी[4] तारीख[5] जुगराफिये से उलूमेकीमिया[7] व तबीयात का तो इस जिमन[8] में तो जिक्र ही न कीजिये बिल्कुल आरी थे। उनसे मैंने एक दर्जन या उससे ज्यादा फ़ारसी की दरसी[1] किताबें पढ़ी जैसे शेख सादी की गुलिस्तॉ, बोस्तॉ, रुक्कात–ए–आलमगीर, सिकन्दरनामा अज निजामी और शाहनामा फ़िरदौसी। इसके अलावा कुछ फारसी नस्र की किताबे- जैसे जहूरी की सहनस्र, औरगजेब आलमगीर और उसकी दकन की शिया सल्तनतों की फ़ुतूहात के बारे में नेमत–ख्वान–ए–आली की हजो।"(10)

उनके अपने खानदान का एक मदरसा भी था जिसमे केवल उनके ही ख़ानदान के लडके और लडकियॉ पढते थे। इसकी चर्चा उन्होंने अपनी आत्मकथा में भी की है। इस मदरसे (पाठशाला) की इमारत आज भी हरि जूनियर स्कूल के समीप मोहल्ला लगरखाना, रामपुर में मौजूद है। पर यह भवन आज इस वश की सम्पत्ति नहीं है।

इसके पश्चात् वह रामपुर के प्रथम अग्रेजी मदरसे मे दाखिल कर दिये गये। यह अग्रेजी स्कूल अब्दुल्ला खॉ के मकान में सन् 1888 ई में खोला गया था। इसकी चर्चा रामपुर के 'स्टेट गजट' में मिलती है"। वर्तमान हामिद इण्टर कॉलेज, रामपुर अब्दुल्ला खॉ के मकान ही में

MOULANA MUHAMMAD ALI
AUR
JUNG-E-AZADI

DR. ZAHEER ALI SIDDIQI

1998

RAMPUR RAZA LIBRARY
RAMPUR 244901 (U.P.)
INDIA